زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
مولوی عبدالحق
انجمن ترقی اردو

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہار سُو

جلد:۱۷، شمارہ جولائی، اگست ۲۰۰۸ء

چہار سُو کا زیرِ نظر شمارہ !
بے پناہ خواہشوں، بے شمار حسرتوں،
بے انتہا امیدوں اور بیش بہا ارمانوں کی ہمراہی
میں صفر کے ہندسے کی طویل قطار کی تلاش سے منسوب ہے
جو ''خُد ساختہ ناخدا'' کی نمائندہ خاص سے سندِ اعتراف ناقبول کرنے
والے خرم صمد کے تنِ تنہا نام سے جُڑ کر خردمندوں کا جمِ غفیر بننے کو بیتاب ہے!!!

رابطہ: 537، ویسٹریج-III، راولپنڈی۔ فون: 5462495-51-92 فیکس: 5467235 ای۔میل: waqars_oma@yahoo.com

متاعِ چہارسُو

○

مجاہدِ اُردو

○○○

نقد و تحقیق کا شعور ہو تم
شاعری میں سخن کا نور ہو تم
علم و عرفاں ہو، رنگ و خوشبو ہو
تم نوائے ضمیرِ اردو ہو
تم سے روشن ہے اس زباں کا دماغ
تم ہو اردو کی عظمتوں کا چراغ
ساری تحریریں پُر معنی ہیں
ایک جادوئے خوش بیانی ہیں
تم ہو رنگِ کمالِ اردو کا
تم سراپا جمالِ اردو کا
تم نے اردو کی آبیاری کی
ہر روایت کی پاسداری کی
کیسے کیسے نکاتِ فن سمجھائے
جو نہ کھلتے تھے وہ سخن سمجھائے
کیسا مشکل سفر کیا تم نے
یعنی اردو کو گھر دیا تم نے
تم تو اردو زبان کا چہرا ہو
اے خلیق اسم با مسمّٰی ہو
تم بلا شک ہو قائدِ اردو
واقعی ہو مجاہدِ اردو

○

ظفر صہبائی (بھوپال بھارت)

○

○○○

قرطاسِ اعزاز

○

ڈاکٹر خلیق انجم

○

کے نام

○○○

○

خلیق جہاں

صفوت علی صفوت (نیوارک)

پورا نام: خلیق احمد خاں (بچپن میں غلام احمد خاں تھا۔ اسکول کے لڑکے "غلام" کہہ کر چھیڑنے لگے تو والدین نے نام بدل کر خلیق احمد کر دیا)۔

ادبی نام: خلیق انجم (ادب میں دلچسپی پیدا ہوئی تو پہلے خلیق اقبال اور پھر خلیق انجم نام رکھا)

والد کا نام: محمد احمد مرحوم

والدہ کا نام: مرحومہ قیصر سلطانہ

دادا کا نام: اصغر خاں

پردادا کا نام: عمر خاں

بہن بھائی: بھائی کوئی نہیں، پانچ بہنیں ہیں جن کے نام طلعت سعید، ثریا اسلم، صفیہ اختر رشید، ذکیہ ای حق اور عذرا انجم (عذرا صاحبہ کو ڈاکٹر خلیق انجم کی والدہ نے گود لیا تھا)۔

تاریخ پیدائش: ۲۲ دسمبر ۱۹۳۵ء

تعلیم:

☆ ہائی اسکول تک (اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول دہلی)۔
☆ انٹرمیڈیٹ اور بی اے (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)
☆ ایم اے (دہلی یونیورسٹی) ۱۹۵۷ء
☆ ڈپلوما ان لنگوسٹکس ۱۹۶۰ء
☆ ڈپلوما ان لائبریری سائنس ۱۹۶۱ء
☆ پی۔ ایچ۔ ڈی ۱۹۶۲ء (آخری تینوں سندیں دہلی یونیورسٹی سے حاصل کیں)۔

ملازمت:

۱۹۵۷ء میں کروڑی مل کالج، دہلی میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۲ء کے آخر میں وزارت تعلیم میں ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور کچھ ہی دن بعد ڈائریکٹر بنا دیے گئے۔ ۱۹۷۴ء میں پروفیسر آل احمد سرور کی جگہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے اور ابھی تک اس عہدے پر خدمت انجام دے رہے ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو کی اردو (فارسی) یونٹ میں چار سال تک مترجم اور براڈ کاسٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ یہ کام جز وقتی تھا۔

ادارت:

خلیق انجم صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز طالب علمی ہی کے زمانے سے ہو گیا تھا۔ جب وہ دسویں کلاس میں تھے تو اسکول سے شائع ہونے والے رسالے "اشادیہ" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

ماہنامہ "چمک" (علی گڑھ) کے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۵ء تک ایڈیٹر رہے۔ سہ ماہی "ادبی تبصرے" کے ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۲ء تک ایڈیٹر رہے۔ "سیکولر ڈیموکریسی" کے ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۲ء تک اور سہ ماہی "اردو ادب" کے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۹۷ء تک ایڈیٹر رہے ہیں۔ اور ۱۹۷۴ء سے اب تک ہفت روزہ "ہماری زبان" کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

خاندان:

خلیق انجم صاحب کے والد محمد احمد صاحب ریلوے میں انجینئر تھے۔ والدہ ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ خلیق صاحب کی پانچ بہنیں ہیں۔ محترمہ طلعت سعید ذاکر حسین کالج کی اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔ ان کے شوہر احمد سعید صاحب آل انڈیا ریڈیو کے دری یونٹ میں ٹرانسلیٹر اور براڈ کاسٹر تھے۔ ثریا اسلم دہلی کے ایک اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔ ان کے شوہر ڈاکٹر اسلم پرویز جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ملازم تھے۔ آج کل انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالے "اردو ادب" کے ایڈیٹر ہیں۔ صفیہ رشید اور ان کے شوہر اختر رشید کینیڈا میں لائبریرین کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ذکیہ ای حق اور ان کے شوہر احسان الحق بھی کینیڈا میں لائبریرین کے عہدوں سے ریٹائر ہوئے۔ پانچویں بہن عذرا انجم خلیق انجم کی والدہ نے گود لیا تھا۔ ان کے شوہر کویت میں ملازمت کر رہے ہیں۔ عذرا آج کل کراچی میں ہیں۔

شادی اور اولاد:

۱۹۶۱ء میں محترمہ سوفی انجم سے شادی ہوئی۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سوشیالوجی کی پروفیسر تھیں۔ کئی سال تک شعبے کی صدر اور ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز رہیں۔ ۱۲ دسمبر ۲۰۰۲ء کو جامعہ کی قائم مقام وائس چانسلر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔ انجم صاحب کے دو بچے ہیں۔ ایک صاحبزادی سیما انجم اور ایک صاحبزادے ثمر انجم۔ سیما انجم نے دہلی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا تھا اور آج کل دہلی پبلک اسکول میں انگریزی کی استاد ہیں۔ سیما صاحبہ کے دو لڑکے ہیں۔ ریحان اور روہی۔ ثمر انجم پہلے امریکہ میں ہوٹل انڈسٹری میں تھے۔ آج کل کینیڈا میں بھی ہوٹل انڈسٹری میں کام کر رہے ہیں۔

تصنیفات و تالیفات:

☆ ناراں بابا	(انگریزی سے اردو ترجمہ)	۱۹۵۷ء
☆ معراج العاشقین	ترتیب	۱۹۵۷ء
☆ غالب کی نادر تحریریں	ترتیب	۱۹۶۱ء
☆ بڑھے چلو	(ہندوستان پر چین کے حملے پر قومی نظموں کا مجموعہ)	۱۹۶۲ء

☆مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط (فارسی سے اردو ترجمہ) ۱۹۶۲ء
☆مرزا محمد رفیع سودا تصنیف ۱۹۶۵ء
☆نئی تنقید تصنیف ۱۹۶۷ء
☆کربل کتھا کا لسانی مطالعہ (ترتیب: خلیق انجم اور گوپی چند نارنگ) ۱۹۷۰ء
☆مقالات حکیم ترتیب ۱۹۷۳ء
☆غالب اور شاہان تیموریہ تصنیف ۱۹۷۴ء
☆ضبط شدہ نظمیں (ترتیب: خلیق انجم، مجتبیٰ حسین) ۱۹۷۵ء
☆غالب کے خطوط (جلد اول) ۱۹۸۵ء
☆غالب کے خطوط (جلد دوم) ۱۹۸۵ء
☆فیض احمد فیض: تنقیدی جائزہ ترتیب ۱۹۸۵ء
☆مشفق خواجہ: ایک مطالعہ ۱۹۸۵ء
☆مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے ترتیب ۱۹۸۶ء
☆مرقع دہلی ترتیب ۱۹۸۶ء
☆سید سلیمان ندوی ترتیب ۱۹۸۶ء
☆غالب کے خطوط (جلد سوم) ۱۹۸۷ء
☆دلّی کے آثار قدیمہ (عہد وسطیٰ کی پچیس فارسی تاریخوں میں دلّی کے آثار قدیمہ کی تفصیلات کا اردو ترجمہ) ۱۹۸۸ء
☆دلّی کی درگاہ شاہ مرداں تالیف ۱۹۸۸ء
☆محی الدین قادری زور ترتیب ۱۹۸۹ء
☆اصناف ادب اردو (ترتیب: قمر رئیس اور خلیق انجم) ۱۹۸۹ء
☆انتخاب خطوط غالب ترتیب ۱۹۸۹ء
☆آثار الصنادید (تین جلدوں میں) ۱۹۹۰ء
☆جوش بنام ساغر ترتیب ۱۹۹۱ء
☆غالب: کچھ مضامین ترتیب ۱۹۹۱ء
☆ڈاکٹر فرمان فتح پوری: شخصیت اور ادبی خدمات (''کتاب نما'' کا خاص نمبر) ۱۹۹۳ء
☆مولوی عبدالحق: ادبی اور لسانی خدمات ترتیب ۱۹۹۳ء
☆بابائے اردو مولوی عبدالحق (بچوں کے لیے) تصنیف ۱۹۹۳ء
☆روشنی کے مینار خلیق انجم/ نثار احمد فاروقی/ ابوالفیض سحر ۱۹۹۳ء

☆غالب کے خطوط (جلد چہارم) ۱۹۹۳ء
☆مرقع دہلی (فارسی متن کی ترتیب اور اردو ترجمہ) ۱۹۹۳ء
☆جگن ناتھ آزاد: حیات اور ادبی خدمات ترتیب ۱۹۹۳ء
☆پروفیسر نثار احمد فاروقی (''کتاب نما'' کا خاص نمبر) ۱۹۹۳ء
☆راج بہادر گوڑ: حیات اور ادبی کارنامے ترتیب ۱۹۹۴ء
☆انتخاب خطوط غالب ترتیب ۱۹۹۴ء
☆حسرت موہانی تصنیف ۱۹۹۴ء
☆فن ترجمہ نگاری ترتیب ۱۹۹۵ء
☆انتخاب کلام حسرت موہانی ترتیب ۱۹۹۵ء
☆پنڈت آنند نرائن ملا کی ادبی خدمات ترتیب ۱۹۹۵ء
☆تفہیم و تعبیر تصنیف ۱۹۹۶ء
☆پروفیسر مسعود حسین خاں: ایک جامع حیثیات شخصیت ترتیب ۱۹۹۶ء
☆علامہ شبلی: علمی و ادبی خدمات ۱۹۹۶ء
☆انتخاب خطوط غالب (ہندی) ۱۹۹۶ء
☆خطبہ صدارت (یہ خطبہ انجمن ترقی اردو اتر پردیش کی صوبائی کانفرنس میں پڑھا گیا) ۱۹۹۷ء
☆جوش ملیح آبادی کے خطوط ترتیب ۱۹۹۸ء
☆گجرال کمیٹی اور اس سے متعلق دیگر کمیٹیوں کا جائزہ تصنیف ۱۹۹۸ء
☆حسرت موہانی (ہندی) تصنیف ۱۹۹۸ء
☆ڈاکٹر ذاکر حسین خاں: حیات، فکر اور عمل (مرتب: عبدالغفار شکیل اور خلیق انجم) ۱۹۹۹ء
☆آصف علی اور ارونا آصف علی تصنیف ۱۹۹۹ء
☆غالب کے خطوط (جلد پنجم) ۲۰۰۰ء
☆پروفیسر خواجہ احمد فاروقی: بیسویں صدی کی ممتاز شخصیت تصنیف۔ دہلی یونیورسٹی میں توسیعی لیکچر ۲۰۰۰ء
☆سردار جعفری کے خطوط ترتیب ۲۰۰۰ء
☆گل کاری وحشت کا شاعر: مجروح ترتیب ۲۰۰۰ء
☆خواجہ غلام السیدین ترتیب ۲۰۰۴ء

☆ غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ — ترتیب — ۲۰۰۲ء

☆ حق تنقید کا دوسرا ایڈیشن (ترمیم و اضافہ شدہ) — ترتیب — ۲۰۰۲ء

مقالے، تبصرے اور پیش لفظ:

ڈاکٹر خلیق انجم اردو کے مشہور و ممتاز ادیب اور صف اول کے محقق اور نقاد ہیں۔ ان کے ایک ہزار سے زائد مقالے، تبصرے اور پیش لفظ ہندو پاک کے مؤقر رسالوں، اخباروں اور کتابوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم ہفت روزہ "ہماری زبان" کے ۱۹۷۴ء سے ایڈیٹر ہیں اور سہ ماہی "اردو ادب" کے ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۷ء تک ایڈیٹر رہے ہیں۔ "ہماری زبان" اور "اردو ادب" میں انجم صاحب کے شائع ہونے والے مضامین، تبصروں اور اداریوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔

تحقیق:

خلیق انجم صاحب کے سوانح اور ادبی خدمات پر عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے جناب قطب سرشار نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔
بہاولپور (پاکستان) میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کے زیر نگرانی مقالہ لکھا جا رہا ہے۔

انعامات اعزازات

☆ اتر پردیش حکومت کا ایوارڈ
☆ اتر پردیش اردو ایوارڈ
☆ بہار اردو اکادمی ایوارڈ
☆ اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ
☆ دہلی میونسپل لٹریری ایوارڈ
☆ مغربی بنگال اردو اکادمی کا نیشنل ایوارڈ
☆ حلقۂ نقادان، کراچی، (پاکستان) کا انٹرنیشنل ایوارڈ
☆ غالب ہیومیر سوسائٹی ایوارڈ
☆ ذوقی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ایوارڈ
☆ حالی اردو ایوارڈ
☆ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا قومی ایوارڈ
☆ مساوات انڈیا کا نیشنل انٹگریشن ایوارڈ
☆ غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے تحقیق و تنقید کا ایوارڈ

اعتراف ہنر:

☆ مشہور ادبی رسالہ ماہنامہ "کتاب نما" نئی دہلی نے جون ۱۹۹۱ء میں خلیق انجم کی شخصیت اور خدمات پر ایک خاص شمارہ شائع کیا جس میں خلیق انجم صاحب کی شخصیت و فن کے مختلف پہلوؤں پر پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جناب رفعت سروش، ڈاکٹر اسلم پرویز، جناب ایم حبیب خاں اور محترمہ شمیم جہاں وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔

☆ دہلی کے مشہور رسالے "ایوان ادب" نے ڈاکٹر صاحب کی طویل علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں خصوصی نمبر شائع کیا۔ ازاں بعد اس خصوصی نمبر کو کتابی شکل دے دی گئی۔

پذیرائی:

خلیق انجم صاحب اب تک ستر سے زائد قومی اور بین الاقوامی سیمینارز میں مقالے پیش کر چکے ہیں اور تیس سے زائد سیمینارز کی صدارت کر چکے ہیں۔

رکنیت:

☆ جنرل سیکرٹری، انجمن ترقی اردو (ہند)
☆ صدر، آل انڈیا اردو ایڈیٹرس اینڈ جرنلسٹ فورم
☆ صدر، فورم فار ڈیموکریسی اینڈ کمیونل ہارمونی
☆ صدر، انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ)
☆ صدر، علی سردار ٹرسٹ
☆ نائب صدر، آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس
☆ صدر، ذوقی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
☆ صدر، قیصر تعلیمی مرکز
☆ ممبر، سیمینار کمیٹی، غالب انسٹی ٹیوٹ
☆ ممبر، ہمدرد ایجوکیشن
☆ سابق ممبر، سردار جعفری کمیٹی
☆ سابق ممبر، اقلیتی تعلیمی گروپ
☆ سابق ممبر، ٹاسک فورس کمیٹی
☆ ممبر، دہلی اردو اکادمی
☆ سابق ممبر، ہریانہ اردو اکادمی
☆ ایڈوائزر، یونین پبلک سروس کمیشن
☆ سابق پرو وائس چانسلر، جامعہ اردو علی گڑھ
☆ سابق وائس چانسلر، جامعہ اردو علی گڑھ
☆ سابق ممبر، دوردرشن ایڈوائزری کمیٹی
☆ سابق ممبر، ساہتیہ اکادمی، اردو ایڈوائزری کمیٹی
☆ سابق ممبر، اقبال سمان کمیٹی
☆ سابق ممبر، مدھیہ پردیش اردو اکادمی ایوارڈ کمیٹی
☆ ممبر، مجلس مشاورت شعبہ جاتی مجلہ تحقیق، سندھ یونیورسٹی (پاکستان)
☆ صدر، فورم فار ڈیموکریسی اینڈ کمیونل ہارمونی دہلی

☆

اُستاد رسا دہلوی

ڈاکٹر خلیق انجم

جب Rider Haggard کے کردار SHE سے جوانی اپنا دامن چھڑانے لگی تو وہ ایک مخصوص آگ میں کود گئی، جس کے شعلوں میں جل کر اسے اپنا کھویا ہوا شباب مل جاتا اور جب وہ آگ سے نکل کر آتی تو اس کا حسن پہلے سے کہیں زیادہ تابناک اور درخشاں ہوتا۔ یہی حال دلّی کا ہے جب کبھی دلّی کسی خونی انقلاب کی آگ میں تپی ہے اس کے حسن و شباب میں پہلے سے کہیں زیادہ دلکشی اور رعنائی آجاتی ہے۔

ہمارے بزرگ ۱۹۴۷ء سے قبل کا ماتم کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی مخصوص افتادِ مزاج اور قدیم تہذیب کے پروردہ ذہن کو نئے حالات، نئی تہذیب اور نئے تمدن کے سانچوں میں نہیں ڈھال سکے جو ظاہر ہے بالکل فطری بات ہے۔ پرانی دلّی کی یاد آج بھی بزرگوں کی آنکھوں میں آنسو لے آتی ہے۔ میں نے ہوش سنبھال کر اس تہذیب کے باقی ماندہ آثار ضرور دیکھے ہیں جس سے اس کی عظمت و شوکت کا پتا چلتا ہے۔ باقی ماندہ آثار سے میری مراد وہ بزرگ ہستیاں ہیں جو اس قدیم تہذیب کی یادگار ہیں۔ پنڈت ترجمون ناتھ زار زتشی دہلوی، منشی عبدالقدیر، استاد رفیق رسا اور شیخ چند سکینہ طالب دہلوی وہ آخری چراغ ہیں جو اس تہذیب کے تند و تیز جھونکوں میں آج بھی روشن ہیں۔ ان بزرگوں کے بعد شاید اس حقیقت پر کوئی فخر نہ کر سکے کہ وہ جامع مسجد کا روڑا ہے اور چوں کہ اس نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر زبان سیکھی ہے اس لیے اس کا فرمایا ہوا مستند ہے۔

میں یہاں صرف استاد رسا دہلوی کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے اپنی ساری زندگی دلّی میں گزاری ہے اور ان تمام گلی کوچوں کے چپے چپے سے واقف ہیں جو کبھی "اوراقِ مصوّر" تھے لیکن اس "منتخبِ روزگار" کے نیاز حاصل نہیں کیے تو آپ نے صرف آدھی دلّی دیکھی ہے کیوں کہ باقی آدھی دلّی تو استاد کی ذات ہے۔ گویا آپ (معاف کیجیے گا) بارہ برس دلّی میں رہے اور بھاڑ ہی جھونکا۔

استاد رسا کا پورا نام سید رفیق احمد رسا ہے۔ اپنے سید ہونے پر استاد بہت زور دیتے ہیں۔ اگر کوئی ان کا نام لے اور نام کے ساتھ سید نہیں لگائے تو اعلان جاتے، لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرتے ہوئے ان کے نام کے ساتھ سید نہیں لگایا تو کلام پڑھے بغیر مشاعرے سے واپس آجاتے ہیں۔

حلیے، لباس اور بول چال نے استاد کی ذات میں انفرادیت پیدا کر رکھی ہے، سو پچاس آدمیوں میں الگ پہچانے جاتے ہیں۔ چھریرا بدن، لمبا قد، فوجی جوانوں کی طرح سیدھی کمر، سر پر خشخشی بال، کھلتا ہوا سانولا رنگ، کشادہ پیشانی جس پر بیچوں بیچ نماز کا سیاہ گٹا، لمبی ناک لیکن ترشی ہوئی، اچھی خاصی نوک دار لمبی سفید داڑھی جس میں دو چار سیاہ بال بھی ہیں۔ چوں کہ پان بہت کھاتے ہیں اس لیے ہونٹوں کے دونوں کنارے پان کی پیک سے سرخ رہتے ہیں۔ داڑھی پر بھی پان کی ہلکی سی سرخی رہتی ہے کبھی کبھی چھالیہ کا ایک آدھ دانہ بھی داڑھی پر نظر آجاتا ہے۔ لباس بہت سادہ ہوتا ہے کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لیتے۔ سر پر ململ کی ٹوپی جو رامپوری ٹوپی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا "استاد یہ ٹوپی کس وضع کی ہے"۔ انھوں نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا کہ "یہ ایجادِ بندہ ہے" اور بہت دیر تک اس کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے رہے۔ مجھے وہ سب خوبیاں تو یاد نہیں رہیں۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ بقول استاد جاڑے اور گرمی کے موسم میں سر ڈھانکنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی چیز ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ ٹوپی ان کے سر پر ہمیشہ ترچھی رکھی ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کی شخصیت میں بانکپن پیدا ہو گیا ہے۔ قمیص، پاجامہ جدید وضع کا لیکن بہت سادہ۔ گرمی، جاڑے، برسات غرض ہر موسم میں انگریزی وضع کا ایک سوتی کوٹ ضرور پہنتے ہیں۔ بزرگوں سے سنا ہے جب استاد نے یہ کوٹ خریدا تھا تو اس کا رنگ بانکا کی تصاویروں میں عام طور پر پایا کاہی اور خلیٹ اور کبھی کبھی چھالیہ، سیدھے ہاتھ میں بیچ سے تہ کیا ہوا اخبار جس میں لکھنے پڑھنے کی ضرورت کا پورا سامان ہوتا ہے۔ جیبیں دو جیبوں میں یا اخبار بدل دیا جاتا ہے۔ اُلٹے ہاتھ میں ایک بید ہوتی ہے جسے گفتگو کے دوران زور زور سے زمین پر مارتے رہتے ہیں۔ جوشِ گفتگو میں اکثر یہ بید ٹوٹ جاتی ہے۔ اُن کے ایک شاگرد نے کئی بید پہلے خرید کر رکھی ہوئی ہیں۔ جب استاد کی کوئی بید ٹوٹتی ہے تو وہ دوسری بید لا دیتا ہے۔ استاد جب غصے میں بید زور زور سے زمین پر مار رہے ہوتے ہیں تو وہ شاگرد گھبرا گھبرا کر استاد سے کہتا ہے "استاد آہستہ، استاد آہستہ" کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ بید ٹوٹ گئی تو اُسے دوسری بید دینی پڑے گی۔ اُستاد ساٹھ پینسٹھ کے لپیٹے میں ہوں گے مگر چال ایسی ہے جیسے "کڑی کمان کا تیر"۔

استاد دنیا میں بالکل تنہا ہیں۔ کوئی آگے نہ پیچھے۔ بیوی بچوں کا بوجھ تو کبھی ان کے کاندھوں پر رہا ہی نہیں، ایک ضعیف والدہ تھیں، کچھ عرصہ ہوا ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ استاد روزے نماز کے بہت پابند ہیں۔ نماز کے وقت کہیں بھی ہوں نیت باندھ لیتے ہیں۔ جوانی کے بارے میں تو مجھے کچھ علم نہیں لیکن اس عمر میں اخلاقی اعتبار سے بہت نیک اور شریف ہیں۔ دلّی میں دو قابلِ احترام ہستیاں

اپنی پارسائی کی وجہ سے بہت بدنام ہیں۔ لوگ چند مرحوم اور شعیشور پرشاد منور لکھنوی ان حضرت کے متعلق مشہور ہے کہ کبھی بھی جام و صہبا کو ان کے لبوں سے ٹکرانے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی اور کسی کافر ادا کو ان کے قرمزی دل پر بجلی گرانے کا شرف حاصل نہیں ہو سکا۔ استاد بھی اسی صف میں شامل ہیں۔ میں نے کبھی ان کے منہ سے کسی حسین کا ذکر نہیں سنا۔ ایک دن میں نے گردن اور آنکھیں جھکا کے بہت مودبانہ انداز میں پوچھا۔ استاد! آپ کو کبھی کسی لڑکی سے محبت ہوئی ہے۔ منہ پر دونوں طرف تھپڑ مارے اور پھر دونوں کان پکڑ کے کہنے لگے۔ میاں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں کبھی ایسے چکروں میں نہیں رہا۔ اس کے بعد آدھے گھنٹے تک عورت، عشق اور شادی وغیرہ کی خامیاں اور نقصان بیان کرتے رہے۔ رہی شراب، اس کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اُستاد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی پارسائی کو کسی کے لیے مصیبت نہیں بننے دیتے ورنہ اس عمر میں اگر کوئی روزے نماز کا پابند ہو تو پوری قوم کے لیے مصیبت بن جاتا ہے جہاں کوئی نوجوان پھنسا اور اس نے دوزخ سے ڈرانا شروع کیا۔ استاد کبھی کسی کو نصیحتوں سے پریشان نہیں کرتے البتہ خود پر مکمل پابندی کرتے ہیں۔ ان کی جتنی محدود آمدنی ہے اتنے ہی محدود اخراجات ہیں۔ پہلے باقاعدگی سے کچھ دوائیں، سر میں ڈالنے کا تیل اور کریم وغیرہ بناتے جو ان کے دوست آشنا اور شاگرد وغیرہ خرید لیا کرتے تھے مگر اب تو بہت دن سے یہ سلسلہ بھی بند ہے۔ چوں کہ استاد کا تے دھاتے کچھ ہیں نہیں اس لیے دن بھر اپنے شاگردوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

چندو خانہ دلی کا ایک اہم ادبی مرکز ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ مختصر سے الفاظ میں اس کا بھی تعارف کرادوں۔ جامع مسجد کی شرقی دیوار کے نیچے چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں (اب یہ سب دکانیں ڈھادی گئی ہیں) ان میں سے دو تین کو ملا کر ایک چائے خانہ بنا لیا گیا ہے کہتے ہیں جب مالک نے یہ چائے خانہ کھولا تھا تو اس پر "خریبڑ زہوٹل" کا بورڈ لگایا تھا۔ مگر کچھ ہی دن میں "چندو خانہ" نام پڑ گیا۔ مالک کے بار بار احتجاج اور غصے کے باوجود اس نام کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ مالک کو شکست تسلیم کرنی پڑی۔ اب وہ بھی اپنے چائے خانہ کو "چندو خانہ" ہی کہتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں بھانت بھانت کا جانور آتا ہے۔ ہر شخص، ہر شخص کی بات کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہے خواہ بات کسی سے بھی کی گئی ہو۔ دو آدمی چندو خانے کے ایک سرے پر بیٹھے گفتگو کررہے ہیں ان میں سے کسی نے کوئی بات کہی جس کا جواب وہ شخص دے گا جو دوسرے کونے پر تنہا بیٹھا ہے اور جس کی ان دونوں سے جان پہچان تک نہیں ہے دنیا کا کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر یہاں بحث نہ ہو۔ مالک کے بار بار منع کرنے کے باوجود یہاں مذہب سے لے کر سیاست اور ادب تک ہر موضوع پر بحث ہوتی ہے اور اس بحث میں تمام گاہک، چندو خانہ کے بیرے وغیرہ برابر کا

حصہ لیتے ہیں۔ چائے خانہ میں داخل ہوتے ہی آپ کی نظر دیوار پر لگی ہوئی ایک تختی پر پڑے گی۔ جس پر لکھا ہے "سیاسی اور فحش گفتگو کرنا سخت منع ہے" مگر کون سنتا ہے صاحب۔ یہ چندو خانہ بعض ادیبوں اور شاعروں کا گڑھ ہے۔ یہاں آنے والوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو شام کو آتے ہیں۔ یہ عام طور پر سرکاری دفتروں میں ملازم ہیں اس لیے مجبور ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو گھر سے کسی وقت اور کسی کام سے نکلیں یہاں لگی لیے بغیر نہیں جائیں گے۔ تیسرے وہ صاحبان ہیں جو صبح نو بجے یہاں آجاتے ہیں اور رات کو دو بجے مالک اُن سے اپنے گھر جانے کی درخواست کرتا ہے۔ ان حضرات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ گردش پا کا اُن پر کوئی اثر نہیں۔ غمِ جاناں، غمِ روزگار نہیں چھو کے نہیں گیا اور فارسی کا یہ شعر اس حریم بزم مستاں پر صادق آتا ہے:

> در حریم بزم مستاں دور
> صبح و شام نیست
> گردشِ جام است ایں
> جا گردشِ ایام نیست

دلی میں جب کوئی مشاعرہ ہوتا ہے تو منتظمین عین وقت پر یہاں پہنچ کر مشاعرے میں پچیس شاعر گھیر کر لے جاتے ہیں۔ یہاں آنے والے بزرگوں میں بسمل سعیدی، انور صابری، منشی عبدالقدیر، غلام احمد فرقت، خان ناز کاکوی، گوپال متل وغیرہ اور نوجوانوں میں نثار احمد فاروقی، مخمور سعیدی، گلزار دہلوی، اظہر پرویز، پرکاش چندر، ممتاز رشید، حسن خان، رضا نقوی، زبیر نیازی، کمار شان، انور کمال حسینی، بیدار آبادی، صاحب رت، عزیز وارثی، رام کشن مضطر اور مطیش گوڑ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اس چندو خانے میں ہر طرح کی گفتگو ہوتی ہے۔ جامع مسجد کے کاروباری بڑے بڑے سودے طے کرتے ہیں۔ کبوتر باز کبوتروں کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ مشاعرے میں جانے کے دام ہوتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے مشہور شاعروں کے کلام پر تنقید اور لعن طعن ہوتی ہے غیر حاضر شاعر کے کلام اور شخصیت کی مرفہ خرابیوں پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی ہے۔

معاف کیجیے گا میں نے چندو خانے کی تفصیل ذرا زیادہ ہی بیان کردی۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس کے بغیر استاد کی شخصیت و سیرت کا بیان ممکن ہی نہیں تھا۔ استاد شام کو یہاں اس وقت آتے ہیں جب آس پاس کی دکانیں بند ہوجاتی ہیں۔ اُن کے ساتھ شاگردوں کی پوری کھیپ ہوتی ہے۔ استاد چندو خانے کے برابر ایک دکان کے تختے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ شاگرد قریب کی دکانوں کے آگے رکھے ہوئے اسٹول موڑھے اور بنچیں اٹھا لاتے ہیں اور باقاعدہ محفل لگ جاتی ہے۔ شاگردوں کے کلام پر اصلاح گزرے ہوئے مشاعرے کے واقعات پر تبصرہ ہونے والے مشاعرے کے

متعلق گفتگو وغیرہ ہوتی ہے۔ اس دوران اگر کوئی ایسا شاعر آتا ہے جو استاد کی ٹکڑی کا نہیں ہے تو چنڈوخانے میں داخل ہونے سے پہلے وہ استاد کے پاس جائے گا، دعا سلام ہوگی۔ اگر شاگرد نے تازہ غزل کہی ہے یا کسی شاگرد کو استاد نے تازہ غزل دی ہے تو وہ سنے گا ورنہ دو چار منٹ بیٹھ کر داخلِ چنڈوخانہ ہوگا۔ اسی طرح جو واپسی میں چسکی دے کر جائے گا۔ استاد بہت کم خوراک ہیں۔ شام کو عام طور پر روپے کا ایک بڑا بسکٹ اور ایک پیالی دودھ کوئی بھی شاگرد ان پر یہ وقت لگا دیتا ہے۔ باقی وقت چائے چلتی ہے۔ چائے کا آرڈر عام طور پر ان کے شاگرد دیتے ہیں۔ کبھی کبھی استاد خود بھی چائے کے پیسے دے دیتے ہیں۔ استاد کو اپنے شاگرد بہت عزیز ہیں۔ ان میں ہندو، مسلمان، سکھ سب مذہب کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی تربیت میں استاد کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ اگر پوری کوشش کے باوجود کوئی شاگرد ایک مصرع بھی موزوں نہیں کر پاتا تو مجبوراً اپنی کہی ہوئی غزلیں اس کو دے دیتے ہیں۔

مشاعرے میں ہمیشہ پوری فوج لے کر پہنچتے ہیں۔ اسٹیج سکریٹری کو وہ خود ہدایت دے دیتے ہیں کہ وہ اور ان کے شاگرد کس ترتیب سے پڑھیں گے۔ وہ دراصل پہلے ترنم والے، بعد میں ترنم والے اور تحت اللفظ پڑھنے والے شاگردوں کے لحاظ سے ترتیب قائم کرتے ہیں۔ مشاعرہ ان کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بڑی احتیاط سے مورچے لگاتے ہیں۔ اگر مجمع نے بقول ان کے مشاعرہ جیت لیا یا لوٹ لیا تو سہرا ان کے سر اور اگر ناکام ہوا تو منتظمین کی ماں کا .... جس کی وجہ سے ان کی سبکی ہوئی۔

جب کوئی استاد کا شاگرد بنتا تو اس موقع پر چھوٹا سا جشن منایا جاتا۔ شاگرد بنانے کا باقاعدہ وقت مقرر کر لیا جاتا۔ استاد اپنے تمام شاگردوں، دوستوں کو دعوت دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے حریف نہیں آئیں گے لیکن انھیں بلایا ضرور جاتا۔ دراصل استاد اپنے حریفوں کو جلانے کے لیے اس موقع کا استعمال کرتے۔ ایک دفعہ استاد چنڈوخانے میں تشریف رکھتے تھے، سامنے ایک خوب صورت اور خوش پوش نوجوان بیٹھا تھا جو استاد کا شاگرد بننے آیا تھا۔ میز پر مٹھائی کا ڈبہ رکھا تھا۔ استاد نے چنڈوخانے میں بیٹھے تمام ادیبوں کو مٹھائی تقسیم کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ استاد کا خیال تھا کہ وہ لڑکا کسی دولت مند خاندان سے ہے اور یونیورسٹی کا طالب علم ہے۔ استاد کے لیے یہ بہت فخر کا مقام تھا۔ استاد نے اتنی اونچی آواز میں کہ سب سن سکیں ہونے والے شاگرد سے پوچھا، "بیٹا تم کیا کام کرتے ہو؟" لڑکے نے جواب دیا، "جی ردی کوٹتا ہوں"۔ استاد کا دل بیٹھ گیا۔ غصے سے فرمانے لگے، "بیٹا کچھ بھی کوٹ ---- شعر سنا شعر ----" چنڈوخانہ قہقہوں سے گونج اٹھا اور استاد نئے شاگرد کو ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

ان ہی شاگردوں کی خاطر استاد ہر اس مشاعرے میں جاتے ہیں جس میں انھیں بلایا جاتا ہے۔ چوں کہ شاگردوں کی مالی استعداد اچھی نہیں ہے اس لیے مشاعرے میں پہنچتے ہی استاد منتظمین کو بلاتے ہیں اور ٹیکسی کے نام پر سب شاگردوں کو ان کے مرتبے کے مطابق روپے دلواتے ہیں۔ یہاں ایک لطیفہ سنتے چلیے۔ دلّی میں کچھ تاجروں نے ایک مشاعرہ منعقد کیا اور شاعروں کو مدعو کرنے اور ان کی آؤ بھگت کے لیے ڈاکٹر کامل قریشی کی خدمات حاصل کیں۔ کامل صاحب نے استاد اور ان کے تین چار شاگردوں کو بھی مدعو کیا۔ مشاعرے میں جب استاد اور ان کے شاگرد پڑھ چکے تو استاد نے آمد و رفت کے خرچ کے لیے کامل صاحب کو تلاش کیا۔ وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ استاد نے مشاعرے کے منتظمین سے بات کی۔ انھوں نے استاد کو پچیس روپے دے دیے۔ استاد نے یہ رقم بھی وصول کر لی اور یہ نہیں بتایا کہ وہ منتظمین سے بھی رقم وصول کر چکے ہیں۔ کامل صاحب دعا سلام کر کے ہال میں واپس چلے گئے۔ منتظمین نے بتایا کہ انھوں نے استاد کو پچیس روپے دے دیے ہیں۔ وہ بھاگ کر ہال سے باہر آئے۔ استاد کچھ لوگوں سے گھرے باتیں کر رہے تھے۔ کامل صاحب غصے میں آپے سے باہر تھے۔ "استاد تم نے میری بے عزتی کر دی۔ دو دفعہ کرایہ وصول کر لیا۔ پچیس روپے واپس لاؤ۔" استاد پر یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ گھبرا گئے اور جیب سے پچیس روپے نکال کر دے دیے۔ کامل صاحب بپھرے ہوئے تھے اور غصے میں ناراضگی کا اظہار کیے جا رہے تھے۔ تین چار منٹ میں استاد سنبھل گئے۔ ان کی گھبراہٹ دور ہو چکی تھی۔ ایک دم چیخے۔ "ربا! ایک ساتھ عزت بھی چھین لی اور رقم بھی۔ عزت تو واپس آ نہیں سکتی۔ رقم ادھر لا۔" یہ کہہ کر کامل صاحب کے ہاتھ سے روپے چھین لیے اور اپنے شاگردوں کے ساتھ یہ جا وہ جا۔ دو چار دفعہ استاد کو مشاعروں میں بڑے تلخ تجربات بھی ہوئے۔ ایک دفعہ دلّی سے کچھ میل دور انھیں اور ان کے شاگردوں کو مدعو کیا گیا۔ گاڑیاں لینے آئیں۔ استاد پہنچ گئے۔ مشاعرہ جم کے ہوا لیکن رات کو دو تین بجے جب مشاعرہ ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ منتظمین میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ بہت تلاش کیا کوئی ہاتھ نہ آیا۔ مجبوراً پیدل چلنا پڑا۔ برسات کا موسم، اندھیری رات، کچا راستہ۔ استاد اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارتے، بھیگتے بھاگتے کیچڑ میں لت پت صبح کے قریب دلّی پہنچے۔ کئی دن تک اس واقعہ کا چرچا رہا۔ جو کوئی ملتا استاد یہ واقعہ ضرور سناتے۔ ایسا دلچسپ واقعہ اور پھر بیان استاد کا، لطف ہی تو آ گیا۔

ایک دفعہ تو واقعی حد ہو گئی۔ کچھ لوگ استاد کو بیس پچیس میل دور کسی مقام پر مشاعرے میں لے گئے۔ آدھی رات گئے جب مشاعرہ ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ جو ٹیکسیاں ان کو لے کر آئی تھیں وہ واپس چلی گئیں۔ استاد نے منتظمین کو آڑے ہاتھوں لیا تو گھبرا گئے۔ کچھ دیر بعد ایک صاحب آئے اور بولے چلیے آپ کو بس میں بٹھا دیں۔ استاد نے خدا کا شکر ادا کیا اور مع اپنے شاگردوں کے اُن صاحب کے ساتھ ہو لیے۔ مشاعرہ ہال سے کچھ دور ہی بس کھڑی تھی۔ وہ صاحب استاد کو اس میں بٹھا کر چلے گئے۔ آدھا گھنٹہ ہوا، پھر گھنٹہ بھر ہوا، کوئی

سواری آتی ہے۔ ڈرائیور آتا ہے نہ بس چلتی ہے۔ دو بجے سے بیٹھے بیٹھے چار بج گئے۔ بس چلنے کے آثار ہی نہیں۔ اتفاق سے کوئی راہ گیر اُدھر سے گزرا۔ استاد نے اس سے پوچھا کہ صاحب یہ بس کب چلے گی؟ وہ صاحب ہنسنے لگے۔ استاد نے پھر سنجیدگی سے وہی سوال دہرایا۔ ان صاحب نے قہقہہ لگا کر فرمایا کہ یہ بس تو برسوں سے یہاں کھڑی ہے۔ دیکھو تو پچھلے دونوں پہیے اینٹوں پر رکھے ہیں۔ بھنا ہی تو گئے اُستاد۔ لپکے مشاعرہ والی کی طرف۔ وہاں کیا رکھا تھا۔ گھپ اندھیرا۔ آدم نہ آدم زاد۔ گئے تھے اجمیری کو پڑ گئے جنگل میں۔ جنوری کے کڑکڑاتے جاڑے۔ اجنبی راستہ کوئی راہ بتانے والا نہیں۔ آٹھ دس میل گرتے پڑتے پیدل چل کر غازی آباد کے اسٹیشن پر آئے اور صبح تک دلی پہنچے۔

استاد خود جب مشاعرے میں غزل پڑھتے ہیں تو چھتیں اُڑنے لگتی ہیں۔ ایک تو استاد کا کلام کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان، دلی کے محاورے سونے پر سہاگہ، داغ کی سی معاملہ بندی اور سب سے بڑھ کر پڑھنے کا دل چسپ انداز۔ وہ مائیک کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھتے ہیں۔ پہلے مصرع کے درمیان سے زمین سے اُٹھنا شروع کر دیتے ہیں اور دوسرے مصرع کے اختتام تک فٹ بھر زمین سے اُٹھ چکے ہوتے ہیں اور ردیف پر پہنچ کر داد سمیٹ کر اپنے زور سے زانوؤں پر دو ہتڑ مارتے ہیں اگر ایسے ویسے کی ٹانگیں ہوں تو زمین سے نہ اُٹھ سکیں۔ استاد ہاتھ، آنکھیں، بھوں، ہونٹ، دانت غرض ہر چیز سے کام لیتے ہیں۔ بعض اشعار پڑھتے ہوئے تو بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کے سامنے بیٹھے عرض حال کر رہے ہیں۔ مثلاً جب وہ یہ شعر پڑھیں گے:

ہاتھ ٹوٹیں میں نے جو چھیڑی ہوں زلفیں آپ کی
آپ کے سر کی قسم بادِ صبا تھی میں نہ تھا

پہلے مصرع کے ابتدائی الفاظ بڑی عاجزی اور انکساری سے اُٹھائیں گے اور پھر مصرع کے اختتام پر پہنچتے پہنچتے زمین سے کافی اُٹھ جائیں گے آواز کانپنے لگے گی اور دوسرا مصرع پڑھتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ لیں گے آواز میں کپکپاہٹ زیادہ پیدا ہو جائے گی۔ پھر اس طرح ڈرتے ہوئے پیچھے ہٹیں گے جیسے محبوب بہت قریب ہے اور اس کے ہاتھ میں تلوار نہیں تو ڈنڈا ضرور ہے۔ چونکہ شعر کی ادائیگی میں استاد مکمل تصویر بن جاتے ہیں جس سے شعر کا اثر دوگنا ہو جاتا ہے۔ اس لیے دلی کے کالجوں کے مشاعروں میں انھیں بہت مقبولیت ہے۔

ایک شام جب ہم چنڈو خانے پہنچے تو استاد ایک میز پر تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ سر پر رکھی ہوئی ٹوپی عام دنوں سے زیادہ ترچھی تھی۔ ماتھے پر بل۔ سمجھ گئے کہ آج استاد کے پاس کہنے کے لیے کوئی دل چسپ قصہ ہے۔ میں نے مؤدبانہ سلام کر کے پوچھا کہ استاد خیریت تو ہے کیا ہوا جو آپ ’’تن کے بیٹھے ہیں۔ استاد نے بس دھیمی آواز میں کہا۔ یہاں کچھ لوگ اکٹھا ہو جائیں، تب سناؤں گا۔ آدھے پونے گھنٹے کے بعد جب چنڈو خانے کی رونق عروج پر آ گئی تو میں نے عرض کیا کہ استاد اب تو ارشاد فرمائیے! استاد نے خود کو مغلظات گالیاں دینی شروع کیں۔ یہ اُن کا قاعدہ تھا کہ دوسروں کو گالیاں دینے سے پہلے خود کو دس پانچ گالیاں ضرور دیتے تھے اور پھر کہا کہ میاں مجھ بد نصیب کا قصور بس یہ ہے کہ ہندوستان میں پیدا ہوا اور یہاں کے لوگ جیسے جاہل ہیں وہ آپ جانتے ہیں۔ عرض کیا کہ آپ واقعہ تو سنائیے۔ بہت لمبی تمہید باندھ کر فرمانے لگے کہ بھتیجو! ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے اس میں ایک بزرگ امام صاحب تھے۔ ہماری شامت آئی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ محلے کے لوگ کچھ دن پہلے ایک نوجوان امام صاحب کو لے آئے۔ شکل سے معقول، پڑھے لکھے، مہذب اور بہار کے رہنے والے۔ میں خوش ہو گیا تم جانتے ہو کہ میں ایسے ویسے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا لیکن یہ نوجوان ایسا معقول معلوم ہو رہا تھا کہ میں نے اس کے پیچھے نماز پڑھنا بھی قبول کر لیا۔ ہوا یہ کہ ان نوجوان امام صاحب کے ہاتھ کہیں سے لاؤڈ اسپیکر لگ گیا۔ چلو ٹھیک ہے اب امام صاحب اس لاؤڈ اسپیکر پر اپنی تقریر کا شوق پورا کرنے لگے۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ بھائی! چھ سات دن ہوئے کہ ایک رات کوئی دو بجے کا عمل ہوگا کہ امام صاحب مائیک پر بیٹھ گئے اور لگے وعظ دینے اور مسلمانوں کو قیامت سے ڈرانے۔ گھبرا کر میری آنکھ کھلی۔ سوچا چلو آج امام صاحب اپنا شوق پورا کر لیں۔ رات بھر کروٹیں لے کر جاگتا رہا۔ اب بھائی! امام صاحب تو روز رات کو دو بجے مائیک لے کر بیٹھ جاتے اور میں دن بھر کا تھکا ماندہ امام صاحب کی وجہ سے کروٹیں لیتا رہتا۔ میری طرح محلے کے اور لوگ بھی پریشان ہو اللہ سے بھی ڈرتے ہیں۔ چپکے چپکے تو امام صاحب کے خلاف بولتے رہے لیکن کوئی سامنے نہیں آیا۔ کل رات کو جب امام صاحب لاؤڈ اسپیکر لے کر بیٹھے میں مسجد کے دروازے پر پہنچ گیا۔ امام صاحب کو باہر بلایا۔ میاں! میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ امام صاحب کا گریبان پکڑ کے چار پانچ ہاتھ جما دیے اور کہا (سینے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے) ابے میری کاسٹ Cost پر خدا سے تعلقات بہتر بنا رہا ہے۔

اُستاد کا یہ کاسٹ Cost والا فقرہ اتنا مقبول ہوا کہ مدتوں چنڈو خانے کے شاعر اور ادیب مختلف سیاق و سباق میں اس لفظ کا استعمال کرتے رہے۔ ایک دن استاد کا سالانہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ مشاعرہ اپنے عروج پر تھا کہ اسٹیج کے نیچے بہت بڑے بڑے پٹاخے اتنی بلند آواز سے چھوٹے کہ سامعین اور شعرائے کرام جوتے چھوڑ کر بھاگے۔ استاد نے مائیک پر چیخ چیخ کر اعلان کیا کہ بھائی! یہ بم نہیں ہیں۔ کسی (بے شمار گالیوں کے ساتھ) نے پٹاخے رکھ دیے تھے۔ چونکہ ان دنوں جامع مسجد پر کچھ ملک دشمن بم چھوڑ رہے تھے اور کچھ لوگ زخمی ہو چکے تھے۔ اس لیے لوگ اتنا خائف ہوئے کہ استاد اور ان کے چاہنے والوں کو بہت صدمہ تھا۔ کیوں کہ استاد کی سال بھر کی محنت اکارت گئی۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشاعرہ یہ مشاعرہ تھا۔ کچھ دن کے بعد بعض لوگوں کو معلوم

ہوگیا کہ یہ کن نوجوانوں کی شرارت تھی۔ ایک صاحب نے ان نوجوانوں سے کہا کہ اگر انھوں نے استاد سے معافی نہیں مانگی تو بہت برا ہوگا۔ نوجوان ڈر گئے۔ چنڈو خانے میں ان سے ملاقات طے کرلی گئی۔ وقت مقررہ پر وہ پہنچ گئے اور انھوں نے استاد سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ اس طرح کی کوئی شرارت نہیں کریں گے۔ جب معافی تلافی ہو گئی تو استاد نے کھڑے ہو کر ایک ایک کر کے سب نوجوانوں کو گلے لگایا اور کہنے لگے بچو! تم شاعرہ کامیاب ہونے دیتے، پھر میری "اُس" میں چلتے تو کیا شک رکھ دیتے۔ اس آخری فقرے کی ادائگی میں بازو کے اشارے بھی شامل تھے۔ محفل کی سنجیدگی قہقہوں میں بدل گئی مگر استاد کے چہرے پر مسکراہٹ تک نہیں تھی۔

ایک دفعہ استاد کے ایک شاگرد نے اُن کی دعوت کی۔ ایک ہفتے پہلے سے اُس شاگرد کی شرافت اور سعادت مندی کی تعریف کے پل باندھنے شروع کر دیے۔ استاد سے کوئی ملنے آتا تو کسی نہ کسی بہانے اس دعوت کا ذکر ضرور کرتے اور شاگرد کی تعریف کرتے۔ چنڈو خانے والوں کی تو شامت آئی ہوئی تھی۔ ہر نشست میں اس دعوت کا ذکر ہوتا اور شاگرد کی قصیدہ سرائی ہوتی۔ اللہ اللہ کر کے وہ دن آیا استاد نے بال کٹوائے، نہائے دھوئے، کپڑے بدلے، حد تو یہ کہ کوٹ بھی دھلوا کر پہنا (یہ کوٹ سال دو سال میں ایک بار دھلتا تھا) عطر لگا کر سر شام چنڈو خانے آکر بیٹھ گئے آج اُس شاگرد کی مدح سرائی کے ساتھ ساتھ اُن "معصوم بے تحقیق" شاگردوں کا بھی ذکر ہوتا رہا، جن کو استاد شعر کہہ کر دیتے اور جنھیں کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ گھر بلا کر ایک وقت کا کھانا ہی کھلا دیتے۔ آج اگر کوئی استاد سے چائے کے لیے پوچھتا تو استاد بہت انکساری کے ساتھ فرماتے ۔میاں آج بچے نے کھانے پر بلایا ہے اگر یہاں پیٹ بھر گیا تو وہاں کچھ کھایا نہیں جائے گا اور بچے کی دل شکنی ہوگی۔ آخر وہ وقت آگیا، جس کا استاد کو ایک ہفتے سے انتظار تھا۔ شاگرد آیا اور استاد کو اپنے ساتھ لے گیا۔

دوسرے دن شام کو استاد چنڈو خانے میں معمول سے پہلے ہی آگئے۔ ٹوپی زیادہ ٹیڑھی، ماتھے پر بل، چہرے پر غم و غصے کے آثار۔ چنڈو خانے کی پوری محفل جمی ہوئی تھی۔ کسی نے استاد سے کہا۔ استاد رات تو خوب دعوت اُڑائی۔ یہ کہنا تھا کہ استاد پھٹ پڑے۔ شاگرد کو ایک لاکھ گالیاں سنا کر بولے۔ میاں دلی والوں کا تو نائٹ کا کھانا بھی اس سے بہتر ہوتا ہے۔ پانچ سات منٹ تک بھر کر گالیاں دے لیں تو اصل موضوع کی طرف آئے۔ بھائی! میں نے دوپہر کے چائے بسکٹ (یہ ان کا لنچ تھا) چھوڑے، شام کی چائے نہیں پی، اس خیال سے کہ رات کو کھانا ہے اگر کم کھایا تو شاگرد کا دل ٹوٹے گا۔ آٹھ بجے ہم سالے مزار (یعنی گھر) پر پہنچ گئے۔ جاتے ہی اپنی بیاض لے کر بیٹھ گیا۔ میں نے جو غزلیں اُس قرم ساق کو کہہ کر دی تھیں، مجھے ہی سناتا رہا۔ میں بھوک سے بدحال پریشان حال، پیٹ سوکھے ہوئے، حلق میں کانٹے، شعر سنتا رہا۔ سنتا رہا اور جہاں تک جسم میں طاقت تھی میں دہ دوڑتا رہا۔ غرض ساڑھے دس بجے کھانا آیا، میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ دسترخوان کے نام پر ایک پھٹا پرانا کپڑا لا کر بچھا دیا۔ میں نے سوچا کہ دسترخوان ایسی ہو مگر کھانا تو آئے۔ لیجیے صاحب کھانا بھی آ گیا۔ "۱۹۰۳ء کے ماڈل کی ایک رکابی اور اُس میں مچھلی کی جھانٹ ونٹ"۔ بس یہ تھا کھانا۔ اب تیری ماں کا نوں توں کروں استاد نے مغلظوں مشتق کرائی۔ مغلظوں ایسا بیہودہ کلام سنایا۔ بے تکلیف میں کسی قوم سے مچھلی کی شفقت کراتے ہیں تو اُسے پیٹ بھر کھانا تو دے دیتے ہیں۔ تو نے تو وہ بھی نہیں کیا۔ پھر جو استاد نے فراشی اور جھول بھر ادبی سطح سے دارو گالیاں دی ہیں بس اللہ دے اور بندہ لے۔ دس بارہ دن تک "۱۹۰۳ء کے ماڈل کی رکابی اور اُس میں مچھلی کی جھانٹ ونٹ" کا ذکر رہا۔

استاد کو اس پر ناز ہے اور بجا ناز ہے کہ وہ اہلِ زبان ہیں۔ زبان ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ اس معاملہ میں استاد کسی رو رعایت کے قائل نہیں جامع مسجد، چتلی قبر اور کوچہ چیلان کے رہنے والے اہلِ زبان ہیں اور دلی کے باقی علاقوں کے لوگ ان کے نزدیک Foreign Country کے رہنے والے ہیں جن کا اردو سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک فن ایسا بھی ہے جس میں دلی تو کیا پورے بر صغیر میں ان کا ثانی مشکل سے ملے گا اور وہ ہے گالیاں دینے کا فن۔ یوں تو سبھی گالیاں دے لیتے ہیں آپ نے بازاری آدمیوں سے سیکڑوں گالیاں سنی ہوں گی مگر استاد جیسی ہنر مندی اور سلیقہ شعاری کے نصیب ہو سکتی ہے؟ وہ بڑی سے بڑی گالی کو اس حسین انداز میں بیان کریں گے، معلوم ہوگا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ ماؤں کے آپس میں ایسے ایسے عجیب رشتے اور پھر بعض جانوروں کے ماؤں سے ایسے ایسے تعلقات بیان کریں گے جو کبھی آپ کے تصور میں بھی نہیں آسکتے۔ ان کی گالیاں سن کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر آدمی کو گالیوں پر پوری قدرت حاصل ہو جائے اور خدا ان کے استعمال کی توفیق بھی دے دے تو قوتِ اظہار میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ زندگی میں ایک دو نہیں کئی مقام ایسے آتے ہیں جب انسان کو اپنے خیالات کے اظہار پر قدرت نہیں رہتی وہ خود پر غصہ ہوتا ہے، جھنجلاتا ہے مگر کچھ کر نہیں سکتا۔ میری زندگی میں جب کوئی ایسا موقع آتا ہے تو بے ساختہ استاد یاد آتے ہیں۔ کاش مجھے بھی استاد کا فن آتا! اس سلسلے کے چند واقعات سن لیجیے۔

استاد بڑے خوددار ہیں اور خودداری غلو کی حد تک۔ جب اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتے تو دوسرے وہ زود رنج بہت ہیں، بہت جلد غصہ ہو جاتے ہیں لیکن بہت جلد من بھی جاتے ہیں۔ غالب کی کل فشائی کتاب اس وقت ہوتی تھی جب کوئی اُن کے آگے پان وصیا رکھ دیتا تھا مگر استاد تو معیوزے کی طرح ہر وقت بھرے بیٹھے رہتے ہیں، ایک ذرا چھیڑ دیجیے پھر دیکھیے بس اتنا کہنا کافی

ہے استاد ان مشاعرے میں آپ کی کامیابی سے فلاں بہت جل رہا تھا یا استاد فلاں آپ کے شعر پر یہ اعتراض کر رہا تھا۔ بس استاد کا دل پسیج جاتا ہے اور ایسا جلال آتا ہے کہ چھوٹے بڑے، امیر، غریب، شریف، رذیل کسی میں فرق نہیں کرتے۔ جلال اُن کو وہ کسی سے ڈرتے نہیں کسی کے ذلیل نہیں۔ پھر کیوں کسی سے دبیں۔ شعر سے پڑھتے ہی ایسی مغلظات سنانی شروع کریں گے کہ توبہ ہی بھلی۔ اب کیا اعتراض کرنے والے سے دشمنی ٹھن گئی۔ مستقل مورچہ قائم ہو گیا۔ ان دنوں کہیں جلسے مخالف پر گالیاں پڑ رہی ہوں گی، کچھ دن بعد استاد اس مخالف کے شجرہ نسب سے متعلق نئے نئے انکشافات کریں گے جن سے خود اس مخالف کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ وہ جس سے لپٹتے ہیں جہاز کا کانٹا بن کر۔ میں نے اُن کے کئی معرکے دیکھے ہیں۔ اکثر ان کے مخالف کو نہیں بولتے دیکھا۔ جب جھگڑا ہوتا ہے تو وہ ہر ممکن حربہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ دلّی والے ہیں، اس لیے یوپی کا ہونا عیب ہے۔ وہ جامع مسجد کے پاس رہتے ہیں اس لیے باڑہ ہندو راؤ والے کی زبان غیر مستند ہے۔ وہ سید ہیں اس لیے غیر سید کو جینے کا حق نہیں ہے لیکن ملاپ ہونے پر ان میں سے کوئی چیز عیب نہیں ہے۔

ایک دفعہ میں بھی استاد کا شکار ہو چکا ہوں۔ ہوا یہ کہ ہمارے کالج سے نظموں کا ایک انتخاب شائع ہو رہا تھا میں نے استاد سے بھی ایک قطعہ لے لیا۔ وہ نعتیہ قطعہ تھا۔ جب انتخاب کی ترتیب سے متعلق کالج میں میٹنگ ہوئی تو یہ تجویز پیش کی گئی کہ مزاحیہ نظمیں شامل نہ کی جائیں۔ سب ممبروں نے یہ تجویز منظور کر لی مگر مجھے ملال تھا اور بات صرف یہ تھی کہ میں جانتا تھا کہ کتاب چھپی اور اس میں استاد کا قطعہ شامل نہ ہوا تو میں جامع مسجد تو جا نہیں سکتا اور مصیبت یہ ہے کہ میرا گھر وہیں ہے۔ میری بہت مخالفت کے باوجود یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ کتابت کے بعد ایک نظم میں آدھا صفحہ بچ گیا، چوں کہ استاد کا قطعہ دلچسپ تھا میں نے دے دیا۔ کتاب چھپ کر آئی، میں نے استاد کی خدمت میں پیش کی۔ وہ بہت سادہ دل آدمی ہیں، بہت خوش ہوئے۔ دوسرے دن جو جامع مسجد جاتا ہوں تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ جو شخص ملتا ہے یہی اطلاع دیتا ہے کہ استاد بہت گالیاں دے رہے ہیں۔ بھئی میرا قصور؟ جواب ملا ایک تو قطعہ آدھے صفحے پر دے کر اس کی اہمیت کم کی اور دوسرے نام کے ساتھ سید نہ لکھ کر استاد کی سادات سے تحریری طور پر انکار کیا۔ سمجھ گیا کہ لوگ مجھ سے تفریح لے رہے ہیں۔ میں استاد کو کتاب دے کر آیا اُن کے ہم نشینوں نے انہیں چڑھا دیا۔ یا اللہ اب کیا ہوگا؟ دو چار دن میں وہ میرا شجرہ نسب بھی نکال لائیں گے۔ دوستوں نے مشورہ دیا خود جا کر معافی کر لو ورنہ بیچ والے کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ گیا استاد کے پاس حسب معمول چنڈو خانے کے برابر دکان کے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ میری کتاب ہاتھ میں تھی اور گل فشانیاں ہو رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی تیوری پر بل پڑ گئے۔ میں نے سوچا سلام کیا، صرف گردن کو جھٹکا دے کر جواب دیا تیوری پر بل بدستور ہے۔ میں نے ناراضگی کی وجہ پوچھی۔ خاموش بیٹھے رہے۔ استاد میرے چچا میاں کے دوستوں میں ہیں، اس لیے مجھ سے محبت کرتے ہیں اور بھتیجا کہا کرتے ہیں مگر یہ حالات ایسے ہیں جن میں استاد کسی کو نہیں بخشتے، اس لیے میرے بھتیجے استاد نے جو سنانی تھیں سنائیں۔ میں نے خود بات شروع کی۔" استاد اس کتاب کی ترتیب ہمارے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ نے کی ہے۔ میرا تو صرف اس پر نام ہے ورنہ میں ایسی گستاخی کر سکتا ہوں؟؟" یہ سنتے ہی استاد بہت بڑے اور شاگردوں سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے "میاں میں خود کہتا تھا میرا بھتیجا ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ ضرور اس پن کسی کا ہوگا ہے"۔ اور استاد نے گالیوں کا رخ ڈاکٹر سروپ سنگھ کی طرف کر دیا۔ اس سے قبل وہ ڈاکٹر صاحب کی ادب نوازی کی وجہ سے ان کی بہت عزت کرتے تھے مگر اب سب بالائے طاق تھا جب ان کی بھڑاس نکل گئی تو سمجھانا شروع کیا اور خدا کا شکر ہے آدھے گھنٹے میں استاد مان گئے اور انہیں ڈاکٹر صاحب اور مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہی۔

ان گالیوں کے سلسلے میں بہت سے دلچسپ قصے بھی ہوئے ہیں۔ ایک دو سن لیجیے۔ ایک دفعہ چنڈو خانے میں بیٹھے استاد رام پور کے لوگوں کو بے نقط سنا رہے تھے دس پندرہ منٹ گزر گئے اور استاد کی گل افشانی جاری رہی برابر کی میز پر ایک اجنبی صاحب کسرتی بدن اور مضبوط ڈیل کے خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے اچانک فرمانے لگے "صاحب میں بھی اس رام پور کا ہوں، ہم لوگوں نے آپ کا بگاڑا کیا ہے؟" اس اچانک آفت سے گھبرا گئے استاد مگر فوراً بات سنبھالی۔ فرمانے لگے "میاں عوام تو سب جگہ ایک سی ہوتے ہیں۔ ہم میں اور آپ میں کیا فرق۔ میں تو وہاں کے نواب کو گالیاں دے رہا ہوں جو بے چارے مظلوم عوام پر ظلم کرتا ہے"۔ (حالاں کہ ریاستیں ختم ہونے کے بعد نواب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں) بات سنبھل گئی اور وہ صاحب بظاہر مطمئن ہو گئے۔

ایک دفعہ ہندوستان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے استاد پٹھانوں کو تمام عمر کی گالیاں دے رہے تھے۔ میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اچانک استاد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا شاید انہیں یہ خیال آگیا کہ میں بھی پٹھان ہوں۔ فوراً بات بدل دی۔ "میاں سب پٹھان ایک سے تھوڑی ہوتے ہیں ان میں کچھ ایسے شریف اور نیک ہوتے ہیں جن کے آگے سید بھی کچھ نہیں، جیسے (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) میرا یہ بھتیجا ہے اس کے خاندان کے کسی فرد سے ملیے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں سے ملاقات ہو رہی ہے"۔ (حالاں کہ استاد کی میرے خاندان کے بارے میں ایمان داری سے یہ رائے نہیں ہے)۔

استاد نے برسوں سیاست میں حصہ لیا ہے وہ کسی بھی میدان میں اپنے حریف کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ کانگریسی تھے، اس لیے اکثر غیر کانگریسیوں سے معرکے ہوتے رہتے ہیں جامع مسجد پر اچھے خاصے لیڈر استاد سے کتراتے تھے۔ ایک دفعہ کسی کا سر بازو گریبان پکڑ لیا۔ ایک دفعہ کسی کے سر پر

کریم کی شیشی اس کی کھینچ کر ماری کہ سر پھٹ گیا۔ ایک دفعہ ایک تحصیلدار کو پیٹ دیا۔ کچہری عدالت ہوئی، برسوں مقدمہ چلا جب استاد کی ہوئی۔ آزادی کے بعد بہت سے ابن الوقت کانگریس میں شریک ہو گئے لیکن ایسے زور شور کے کانگریسی ہوتے ہوئے بھی استاد سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔

دس پانچ دشمن تو سب کے ہی ہوتے ہیں۔ استاد چوں کہ دو ٹوک کھری بات کرتے تھے۔ ذرا کسی سے ناراض ہوئے اور شروع ہوئی گالیوں کی بوچھاڑ۔ چناں چہ ان کے مخالف بھی زمانہ دیکھی ہیں۔ استاد کہتے ہیں اصل نسل سید ہوں۔ حاسدین کہتے ہیں کہ ان کا سادات سے کوئی تعلق نہیں۔ استاد کہتے ہیں خواجہ میر درد کے خاندان سے ہوں، دشمن کہتے ہیں ان کا خواجہ میر درد کے خاندان سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ استاد کو اس پر فخر ہے کہ وہ جانشین بیخود ہیں۔ حریف کہتے ہیں جانشین ہونا تو دور کی بات ہے استاد کو ان سے تلمذ بھی نہیں۔ رہا اللہ ہی جانتا ہے کہ کون ٹھیک کہتا ہے۔ ہم تو ان معاملوں میں استاد کے طرفدار ہیں۔ وہ کاہے کو جھوٹ بولیں گے۔

استاد کا بات کرنے کا انداز بہت دلچسپ ہے۔ معمولی سی بات کو لمبی لمبی تشبیہات و استعارات کے پردے میں بیان کرتے ہیں کہ لطف آجاتا ہے۔ ایک دفعہ استاد اپنے شاگرد کے متعلق فرما رہے تھے۔ "میاں شعر کیا تو کیا سالے کو بات کرنے کی تمیز نہیں تھی۔ سارا زور لگایا، سالے نے مصرعہ نہ کہنے دیا۔ مجبوراً میں نے اپنی غزلیں دیں۔ آواز اچھی تھی چل نکلے مشاعروں میں ---- اب جو پر نکلے تو جا بیٹھا دوسروں کی چھتری پہ"۔ (استاد کے شاگرد نے کسی اور کا تلمذ اختیار کر لیا تھا۔ اس شاعر نے پہلے بھی استاد کا ایک شاگرد توڑ لیا تھا)۔

ایک دفعہ استاد کے ایک شاگرد نے ایک بڑے غزل گو کا تلمذ اختیار کر لیا۔ اس شاعر کا تعلق ایک صوفی خاندان سے تھا ایک بزرگ کے جانشین تھے اور بڑے غزل گو۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ایک رجواڑے میں ملازم رہے تھے۔ استاد اس شاگرد کو سمجھاتے ہیں۔ "ابے کس کے چکر میں آ گیا۔ تیرے جیسے استادنے تو بڑی بڑی ریاستیں چٹ کر لیں اور تیرا باپ تو ایک ٹوٹی پھوٹی قبر چھوڑ کر مرا ہے"۔ یہ فقرہ بہت مقبول ہوا۔ بہت دن تک لوگوں کی زبان پر رہا خود وہ غزل گو بھی ان الفاظ سے لطف اٹھاتے رہے۔

ایک دفعہ استاد کی ایک جوان شاعر سے جھڑپ اور لمبی جھڑپ کر تو تو میں میں ہو گئی۔ جب بات حد سے گزر گئی تو کچھ لوگ اکٹھا ہوئے اور دونوں کو بٹھا کر ملاپ کرا دیا۔ استاد نے پہلا فقرہ ہی یہ کہا "صاحبزادے اگر سچے دل سے صلح منظور کرنا چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں اور اگر کوئی لمبا حرامی پن ہے تو صاف بتا دیں"۔ "لمبا حرامی پن" کی ترکیب ملاحظہ ہو۔

ایک دفعہ استاد بہت دن سے بیمار تھے۔ جامع مسجد کے قریب بہت سے حکیموں سے علاج کرایا۔ افاقہ ہوا تو کیا مرض اور بڑھ گیا۔ ایک دن سر راہ استاد سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے مزاج پوچھا فرمانے لگے "سمجھیے دلی کو بالعموم اور میرے خوردوں کو بالخصوص واضح ہو کہ جامع مسجد سے لے کر کرہ بنگش تک جتنے حکیم بنے بیٹھے ہیں ان میں کوئی حکیم نہیں ہے سب سالے عطار ہیں"۔ پھر استاد نے ان حکیموں کی خوبیاں اپنی بیماری اور علاج مخصوص زبان میں بیان کیں، مزہ ہی تو آ گیا۔

چند سال ہوئے استاد نے بیخود اکیڈمی قائم کی تھی، اگر چہ وہ خود کو اس اکیڈمی کا صرف جنرل سکریٹری لکھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں اور کوئی عہدہ دار نہیں ہے۔ اکیڈمی کا دوسرا نام استاد رسا ہے۔ اکیڈمی کا سال میں صرف ایک فنکشن ہوتا ہے اور وہ ہے "یوم بیخود" پر سالانہ مشاعرہ۔ سال بھر استاد کے موضوعات گفتگو میں ایک موضوع یہ مشاعرہ بھی رہتا ہے۔ شروع کے چھ مہینے گزرے ہوئے مشاعرے کے واقعات، مشاعرے کی کامیابی اور اس کامیابی سے دشمنوں کی شکست پر تبصرہ ہوتا ہے۔ باقی چھ مہینے آنے والے مشاعرے کی تیاریوں کے متعلق گفتگو میں صرف ہوتے ہیں۔ ایک مہینہ قبل استاد لنگوٹ باندھ کر میدان میں آجاتے ہیں۔ دلی کے تمام گلی کوچوں میں دلچسپ اشتہار لگنے شروع ہوتے ہیں جن کے عنوانات کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں "شاندار مشاعرہ"، "عالی شان مشاعرہ"، "بڑا مشاعرہ"، "عظیم مشاعرہ" وغیرہ وغیرہ۔ اشتہار میں یہ بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ اچھا کہنے والے اور اچھا پڑھنے والے شاعر شرکت کر رہے ہیں۔ اشتہار کے آخر میں استاد کا نام رفیق احمد رسا دہلوی اس طرح ہوتا ہے "نقش بردار بیخود رفیق ارباب سخن جنرل سکریٹری بیخود اکیڈمی"۔ یہ اشتہار دس دس دن کے فاصلے سے لگائے جاتے ہیں اور آخری اشتہار مشاعرے سے ایک دن قبل لگایا جاتا ہے جو اخباری سائز کا ہوتا ہے۔ کچھ حاسد اور استاد کی کامیابی سے جلنے والے بڑے اوچھے ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ بعض اشتہارات میں کالی سیاہی سے رسا کی "س" پر تشدید لگا کر رسّا کر دیتے ہیں۔

اس ایک مہینے میں استاد اپنے شاگردوں، دوستوں، معتقدوں اور ڈرنے والوں سے کچھ رقم جمع کرتے ہیں جو سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جب کہ خرچ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ چوں کہ سارا کام استاد کو خود کرنا پڑتا ہے اس لیے ایک ہفتے پہلے سے انھیں دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں رہتی، وہ خود اشتہار لگاتے ہیں۔ خود مشاعرے کی خبریں تمام اخباروں کے دفتروں کو پہنچاتے ہیں۔ یہ مشاعرے جامع مسجد کے سنگھاڑے میں ہوتے ہیں اس لیے میونسپل کارپوریشن سے اجازت لیتے ہیں۔ دریاں، چاندنیاں، تخت اور لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ ساری بھاگ دوڑ پیدل ہوتی ہے۔ مشاعرے کے دن صبح کی نماز پڑھ کر استاد سنگھاڑے (جامع مسجد پر واقع ایک پارک) میں آجاتے

ہیں۔ کاغذ کی جھنڈیوں اور پھولوں سے میدان سجایا جاتا ہے۔ ایک خوب صورت ڈائس بنتا ہے۔ شام ہوتے ہی چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ استاد خود دریاں چاندنیاں بچھاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک دو شاگرد بھی ان کی مدد کو آجاتے ہیں۔ مغرب کے وقت تک ہر چیز تیار ہو جاتی ہے۔ روشنیوں اور پھولوں سے میدان دلہن کی طرح سج جاتا ہے۔ نو بجے مشاعرہ شروع ہو جاتا ہے۔ مشاعرے کے دوران استاد ایک منٹ کے لیے بھی ٹک کر نہیں بیٹھتے۔ کسی شاعر کو پان پیش کیا جا رہا ہے، کسی کو سگریٹ دیا جا رہا ہے، کوئی روٹھ گیا ہے اُسے منایا جا رہا ہے۔ دو چار لونڈے اگلی صفوں میں آ گئے ہیں انھیں اُٹھایا جا رہا ہے (ضرورت پڑنے پر ایک آدھ بید بھی جماد ی جاتی ہے) کسی کونے سے داد کم دی جا رہی ہے وہاں جا کر لوگوں کو کم فہم اور سخن ناشناس کہہ کر ان کی غیرت کو جگایا جا رہا ہے۔ غرض استاد پھرکی کی طرح تمام مشاعرے میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اللہ اللہ کر کے رات کو تین چار بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ دری چاندنیاں سمیٹتے سمیٹتے صبح ہو گئی۔ استاد نے جامع مسجد میں نماز پڑھی۔ مشاعرے کی کامیابی کا شکرانہ ادا کیا اور چنڈو خانے میں آ کر بیٹھ گئے۔ سب لوگ رات بھر کے جاگے ہوئے گھروں میں بے سدھ سو رہے ہیں اور استاد چنڈو خانے میں بیٹھے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ دس بجے کے قریب لوگ آنا شروع ہوئے۔ ہر آنے والا انھیں مبارک باد دے رہا ہے۔ استاد خاکساری سے مسکرا رہے ہیں۔ استاد مشاعرے کو اپنے دشمنوں کی شکست سمجھتے ہیں۔ اس لیے اب انھیں گالیاں دینے کا موقع ملتا ہے "میاں فلاں کے گھر میں تو آج چولھا اوندھا پڑا ہے ان کی ماں کا........کذا ازش معرٗ ناتحقیق، ناخلف........استاد رسالے کر لیں گے۔ لوگ سوگ منا رہے ہیں سوگ.... اتنا سا منہ نکل آیا ہے"۔ (حالاں کہ انھوں نے ابھی اپنے دشمنوں کا منہ نہیں دیکھا ہے) مشاعرے کے بعد بعض دشمنوں پر اسی طرح گالیاں پڑتی رہیں گی۔ ایک دفعہ تو دشمنوں کی گردنیں جھکا ہی دیں۔ مشاعرے کے دوسرے دن انھوں نے رومال میں بندھی ہوئی مٹھائی کی پلیٹیں بانٹی تھیں۔

دلی کے دریبے کے جوہریوں کا ایک لڑکا تھا، اس کا نام تو مجھے یاد نہیں۔ "نسیم" تخلص کرتا تھا۔ کم عمر تھا، ایسے ہی کوئی اٹھارہ بیس سال کا، بہت ہی مہذب، شریف اور نیک، اُسے اردو شاعری کا شوق ہوا اور بقول گوپال متل مرحوم اُسے "اردو شاعری ہو گئی" وہ استاد کا شاگرد ہو گیا۔ موزوں طبع نہیں تھا، اس لیے استاد شعر کہہ کر دے دیتے تھے۔ اُس کا ترنم غضب کا تھا۔ مشاعرے میں پڑھتا تو سماں باندھ دیتا تھا۔ چوں کہ استاد پر خاصی دولت لٹاتا تھا اس لیے استاد اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ استاد نے اسے اردو رسم الخط اتنا سکھا دیا تھا کہ وہ آسانی سے پڑھ لیتا، البتہ لکھنے میں اُسے پریشانی ہوتی۔ ایک دفعہ جامع مسجد کے میدان میں آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ استاد نسیم کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی جیب میں چھوٹی چھوٹی سی پرچیاں تھیں۔ جن پر وہ کچھ لکھ لکھ کر لاؤڈ اسپیکر کو بھیج دیتے تھے۔ پرچے کی عبارتیں کچھ اس طرح تھیں:

"مشاعرہ عروج پر آ گیا ہے۔ اب دو شاعروں کے بعد نسیم کو پڑھوا دیجیے۔" غالباً استاد کا خیال تھا کہ ان شاعروں کے بعد مشاعرہ اور بھی زیادہ (بقول ان کے) چمک جائے گا جو نسیم کے لیے سازگار ہوگا لیکن پھر کچھ دیر بعد استاد کے ذہن میں نہ جانے کیا بات آئی کہ انھوں نے لاؤڈ اسپیکر کو ایک پرچی پر لکھ کر بھیجا۔ "ابھی نسیم کو نہ پڑھوائیے۔ میری اگلی ہدایت کا انتظار کیجیے۔" غرض کافی دیر تک اسی طرح پرچی بازی ہوتی رہی اور بالآخر وہ وقت آ گیا کہ استاد نے نسیم کو پڑھوانے کی فرمائش کر دی۔ چوں کہ لاؤڈ اسپیکر ہماری طرح استاد سے بہت ڈرتا تھا اس لیے اُس نے نسیم اور استاد کے تعارف میں وہ تمام فقرے کہے جو استاد نے اُسے یاد کرائے تھے پھر اپنی طرف سے بھی اس تعریف و توصیف میں اضافہ کیا۔ غرض نسیم مائک کی طرف آئے۔ صدر مشاعرہ اسٹیج پر بیٹھے تمام شعرائے کرام اپنے استاد محترم اور سامعین کرام کو جھک کر مؤدبانہ طریقے سے جھک کر آداب کیا، صدر محترم اور پھر اپنے استاد سے غزل پڑھنے کی اجازت مانگی۔ مطلع کا پہلا مصرع بہت ہی مترنم آواز میں اٹھایا۔ "اللہ رے تری "نچوں" مشاعرہ پر سناٹا چھا گیا۔ سامعین بالکل خاموش۔ اسٹیج پر بیٹھے تمام شعرا ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے ہیں کہ "نچوں" کیا بلا ہے۔ کنول سعیدی مرحوم نے سمجھا کہ "نچوں" ہندی کا لفظ ہے۔ انھوں نے پاس بیٹھے ہوئے ڈاکٹر اسلم پرویز سے پوچھا کہ ہندی میں "نچوں" کا کیا مطلب ہے؟ اسلم نے جواب دیا کہ مجھے اتنی ہندی نہیں آتی۔ اسی دوران میں نسیم نے مصرع پھر اٹھایا "اللہ رے تری "نچوں" استاد نے بڑے پیار سے کہا۔ بیٹے آپ کے ہاتھ میں جو کاغذ ہے اُسے پڑھیے دیکھیے کیا لکھا ہے۔ نسیم نے کاغذ غور سے پڑھا اور پھر وہی پڑھا "اللہ رے تری نچوں" استاد نے ذرا تیج لہجے میں نسیم کو ہدایت دی کہ ان کے ہاتھ میں کاغذ ہے اُسے غور سے پڑھیں۔ نسیم نے کاغذ پھر پڑھا اور پھر وہی "اللہ رے تری نچوں"۔ اب استاد کا ناریل چٹخ گیا۔ غصے میں کھڑے ہو گئے۔ پانچ چھ مغلظات سنائیں، ابے "پچون" "پڑھ" پچون" مشاعرہ قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ اب صورت حال یہ کہ نسیم پڑھ رہے ہیں۔ "اللہ رے تری پچون اور سامعین چیخ رہے ہیں۔ اللہ رے تری نچون" غرض اس "نچون" اور "پچون" کی تکرار میں مشاعرہ ختم ہو گیا"۔

میں نے یہ خاکہ شاہد احمد دہلوی کے حکم کی تعمیل میں لکھا تھا۔ جب یہ خاکہ "ساقی" میں چھپا تو چوں کہ اس میں دلی کے ادبی ماحول اور دلی کی جامع مسجد کا ذکر تھا۔ اس لیے پاکستان میں اُن لوگوں نے بہت پسند کیا، جو دلی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے کئی رسالوں میں نقل ہوا۔ جب یہ خاکہ ساقی میں چھپ کر آیا تو میں چنڈو خانے میں استاد کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ ان کی فرمائش پر پورا خاکہ پڑھ کر سنایا۔ ایک ایک لفظ پر جھومے، بے انتہا خوش ہوئے اور بار بار میری کمر تھپتھپائی۔ اپنے دو تین شاگردوں کو بلا کر خاکے کی پانچ چھ نقلیں کروائی گئیں اور ہر ملنے والے ادیب اور شاعر کو اپنے سامنے بٹھا کر پڑھایا گیا۔ استاد مجھ سے بہت خوش تھے لیکن ایک شام کو جب میں چنڈو خانے گیا تو مجھے

دیکھتے ہیں استاد کے ماتھے پر بَل پڑ گئے۔ میں نے سلام کیا تو صرف گردن کے جھٹکے سے جواب دیا۔ میں پریشان! استاد ناراض کیوں ہو گئے ہیں۔ کچھ دیر میں ایک صاحب نے بتایا کہ استاد کا خیال ہے کہ تم نے خاکے میں اُن کی ہجو لکھ دی ہے یا دوسرے لفظوں میں اُن کا مذاق اُڑایا ہے۔ اس لیے بہت ناراض ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یار لوگوں نے تفریح لینے کے لیے استاد کو چڑھا دیا ہے۔ میں استاد کو لے کر چنڈو خانے سے باہر گیا۔ بڑی مشکل سے میرے ساتھ چلنے پر راضی ہوئے۔ ایک بند دکان کے تختے پر بیٹھ کر میں نے استاد کو بتایا کہ خاکہ کتنا مقبول ہوا ہے کہ بہت سے رسالوں نے نقل کیا ہے اور خاکے میں جو استاد کے تعریفی پہلو نکلتے تھے، وہ میں نے ان کے ذہن نشین کرائے۔ استاد خوش ہو گئے اور ہم دونوں چلتے باتیں کرتے ہوئے چنڈو خانے میں داخل ہو گئے۔ دوسرے دن پھر یہی ہوا۔ استاد ناراض ـــــ ماتھے پر بَل جھٹکے سے سلام کا جواب دیا۔ میں استاد کو چنڈو خانے سے باہر لے گیا۔ پھر خاکے کے بعض فقرے پڑھ کر سنائے اور پھر استاد مان گئے۔ لیکن اب یہ روز کا سلسلہ ہو گیا۔ میں شام کو استاد کو منا کر جاتا، دن کو یار لوگ میرے خلاف چڑھا دیتے۔ یہ سلسلہ کئی دن تک چلا۔ ایک دن میں چنڈو خانے پہنچا تو میں نے دور سے دیکھا کہ استاد ماتھے پر بَل ڈالے اضطراب کے عالم میں چنڈو خانے کے باہر تیز تیز قدموں سے ٹہل رہے ہیں۔ استاد کی اس کیفیت کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ذرا تیز قدموں سے استاد کے پاس گیا، سلام کیا، استاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔ بھتیجے! میرے ساتھ آ! اور کھینچتے ہوئے جامع مسجد سے تھوڑے فاصلے پر پریڈ وڈ پارک میں اس طرح لے گئے، جیسے پولیس ملزم کو لے جاتی ہے۔ ایک جگہ گھاس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی اور پھر اچانک سر سے اپنی ٹوپی اُتار کر نیچے رکھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا۔ کہنے لگے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کر بتاؤ تم سے میرا کیا رشتہ ہے؟ عرض کیا کہ آپ میرے سگے چچا کے دوست ہیں۔ اس لیے میں نے آپ کو ہمیشہ اپنا چچا سمجھا ہے۔ بولے "چلو یہ بات ہو گئی" "اب بتاؤ کہ اس خاکے میں تم نے میری قدح کی ہے یا مدح؟ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں میری ہجو لکھی ہے۔ تم میری قسم کھا کر بتاؤ کہ اس میں کیا ہے۔ میں نے پھر وہی باتیں دوہرائیں جو کئی دن سے کہہ رہا تھا اور عرض کیا کہ یہ خاکہ آپ کو تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ زندہ و جاوید رکھے گا۔ استاد خاموش ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کا چہرہ کھل گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُن کے دماغ سے کوئی بہت بڑا بوجھ اُتر گیا۔ عام دنوں کی طرح ہم دونوں چلتے باتیں کرتے ہوئے چنڈو خانے میں واپس چلے گئے۔ اس کے بعد لوگوں نے استاد کو بہت چڑھایا ـــــ لیکن انھوں نے کسی کی نہیں سنی۔ ہمیشہ کہتے رہے کہ بھتیجے نے قسم کھا کر کہا ہے کہ اس میں میری تعریف ہے۔ وہ میرے سر کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا۔

میں نے اُن کی زندگی میں اُن کا خاکہ لکھا تھا اور اُن کی وفات کے تقریباً دس سال بعد ڈاکٹر اسلم پرویز نے اُن کا خاکہ لکھا۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے اپنے خاکے کے آخر میں استاد کی وفات کے حالات بیان کیے ہیں۔ میں وہ پورا پیراگراف یہاں نقل کر رہا ہوں۔

عمر کے آخری دنوں میں استاد رسا دن کو حاجی ہوٹل میں رہتے تھے اور رات شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مزار پر بسر ہوتی۔ آخری دنوں میں انھیں کینسر جیسے موذی مرض نے گھیر لیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ صبر و قناعت کے ساتھ زندگی کے دن کاٹتے رہے۔ ان کی خودداری نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ کسی سے کسی طرح کی امداد لیں۔ صرف ایک درخواست دینے کی دیر تھی انھیں حکومت سے بھی امداد مل سکتی تھی لیکن انھوں نے یہ بھی گوارا نہیں کیا۔ میر مشتاق صاحب نے ہسپتال میں ان کے داخلے کا انتظام کرا دیا تھا لیکن وہ صرف اس لیے ہسپتال میں داخل نہیں ہوئے کہ وہاں طہارت و پاکیزگی کا کوئی آسرا نہیں ہے۔ وہ اپنے مرض پر اپنے علم طب کی ہی آزمائش کرتے رہے۔ ان حالات میں بھی دوسروں کے دکھ درد کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ حاجی میاں نے انھیں ایک کمبل دیا تھا تو اسے ایک روز شیخ کلیم اللہ کے مزار پر ایک عورت کو جا کے اوڑھا دیا جو اپنے بچوں کے ساتھ سردی میں سکڑی پڑی تھی۔ انتقال سے چند روز پہلے آواز بند ہو گئی تھی۔ چل پھر بھی نہیں سکتے تھے بیٹھ بیٹھ کر چلتے تھے اس عالم میں حاجی میاں سے ان کی آخری بات چیت کاغذ پر لکھ کر ہوئی۔ ان کی یہ آخری تحریر حاجی میاں کے پاس موجود ہے۔ حاجی میاں نے کہا کہ موسم کا تقاضا ہے کہ آج آپ رات ہوٹل پر ہی بسر کر لیں۔ انھوں نے فرمایا میں اپنی وضع ترک نہ کروں گا۔ استاد رسا نے حاجی میاں کو یہ بھی لکھ دیا کہ اب مجھ سے گوارا نہیں ہوتا کہ میں آپ کے پانچ روپے کی چارپائی کا نقصان کروں یہ تجارت ہے۔ غرض اسی عالم میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو بعد نماز جمعہ ان کا انتقال ہو گیا۔ مغرب کی نماز کے بعد حاجی ہوٹل سے ان کا جنازہ اُٹھا جامع مسجد کے پارک میں مولانا یوسف صاحب نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور دہلی گیٹ کے باہر نئے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ان کا جنازہ قبرستان پہنچا تو قبرستان کے باہر ایک اور میت رکھی تھی جس کی نماز جنازہ پڑھانے والا کوئی نہیں تھا۔ چناں چہ جو لوگ استاد رسا دہلوی مرحوم کے جنازے کے ساتھ قبرستان گئے تھے انھوں نے ہی اس میت کی نماز جنازہ بھی ادا کی۔

استاد رسا کے انتقال کے بعد ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے عقیل ناروی صاحب نے مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا۔ استاد رسا کی یاد میں ہونے والا مشاعرہ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو منعقد ہوا جس کی صدارت اس وقت کے وزیر تعمیرات جناب سکندر بخت نے فرمائی۔ دوسرا مشاعرہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ہوا جس کی صدارت خلیق انجم صاحب نے فرمائی۔ ۱۹۷۸ء کے بعد سے اب سات سال بعد پھر آج یہاں استاد رسا دہلوی کا ذکر خیر ہوا ہے۔"

براہِ راست

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہے تقدیریں
(اقبال)

علامہ اقبال کا مذکورہ بالا شعر نہ معلوم کب کب اور کہاں کہاں اپنے مفہوم اور مضمون کا امانت دار بنا ہوگا۔ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی شخصی وفنی جہات کی روداد براہِ راست کی شکل میں مطالعے کے بعد علامہ اقبال کا شعر مذکور ایک بار پھر اپنی اہمیت و معنویت بشکل دیگر منوانا نظر آرہا ہے۔ کسی بھی عامی او رخاکی انسان کی جانب کاملیت اورکلیت کا دعویٰ بجائے خود کمزوری کی دلیل ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب دعووں پر یقین رکھتے ہیں نا مفرضوں کو بنیاد بناتے ہیں، جو کچھ بھی کرتے ہیں حقیقت سے آنکھیں چار کرکے، تن من دھن لگا اور انجام سے بے پرواہ ہو کر کرتے ہیں۔ان کے ایثار، لگن، جرأت اور بے خوفی نے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کو جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے وہ نصیب والوں کے حصے میں آیا کرتا ہے۔خدا کرے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی بے باکی جرأت اور بے خوفی کا یہ سفر یونہی رواں دواں اور ہردم جواں رہے تاوقتیکہ اردو زبان اور اردو ادب اس منزل کو پہنچے جس کا خواب اس زبان وادب کی بنیاد رکھنے والوں نے دیکھا تھا!!!

(گلزار جاوید)

☆ گفتگو کی ابتدا خاندانی پس منظر سے کی جائے تو قاری کے لئے بہت سی آسانیاں مہیا ہو سکتی ہیں؟

☆☆ ہم لوگ روہیلے پٹھان ہیں۔ہمارے خاندان کے ایک بزرگ کچھ لوگوں کے ساتھ افغانستان سے دہلی آئے تھے۔یہ سپاہی پیشہ تھے۔یہاں آکر انھیں شاہی فوج میں ملازمت مل گئی۔خاندان کے کچھ لوگوں نے لاہور میں رنجیت سنگھ کی ملازمت اختیار کرلی۔ہمارے پردادا شمشیر خاں کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ بہت بہادر اور جری سپاہی تھے۔پڑھے لکھے تو تھے لیکن زیادہ نہیں۔ہمارے دادا اصغر خاں اور اُن کے بھائی رامپور میں مقیم ہو گئے۔دونوں خاصے صاحبِ حیثیت تھے۔کسی بات پر دادا اوراُن کے بھائی میں اختلاف ہوا تو میرے دادا رامپور کی ساری جائداد چھوڑ کر دہلی آگئے اور پھر کبھی رامپور نہیں گئے۔ ہمارے خاندان کے کچھ لوگ اب بھی رامپور میں گھیر ملا غیرت خاں میں رہتے ہیں۔اُن میں ایک صاحب بڑے خاں تھے۔میں امتیاز علی خاں عرشی کے یہاں مقیم تھا۔میں نے اُن کو بتایا کہ میں بڑے خاں سے ملنا چاہتا ہوں۔اُن کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔کہنے لگے وہ آپ کے کیا ہیں؟ میں نے کہا کہ ہمارا رشتہ تو صحیح نہیں پتا لیکن وہ میرے رشتے دار ہیں۔عرشی صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔بھائی! وہ تو بڑے شہدے ہیں۔میں دو چار دن میں ایک دوست کی مدد سے گھیر ملا غیرت خاں میں پہنچ گیا۔بڑے خاں کا انتقال ہو چکا تھا۔میں نے اُن کے گھر پر دستک دی تو دو تین عورتیں ٹاٹ کے پردے کے پاس آگئیں۔میں نے جب اُن کو رشتہ بتایا تو اُنھوں نے کھڑے ہی کھڑے مجھ سے باتیں کیں۔مجھے لگ رہا تھا کہ غریبی کی وجہ سے مجھے گھر میں نہیں بلانا چاہتیں۔

میرے والد محمد احمد مرحوم ریلوے میں انجینئر تھے۔ایک اچھے آرٹسٹ بھی تھے۔بہت زیادہ دولت مند تو نہیں تھے لیکن اتنی آمدنی ضرور تھی کہ آرام سے زندگی گزر رہی تھی۔میرے نانا خاصے صاحبِ حیثیت تھے۔لال قلعے میں انگریزوں کو اردو پڑھانے کا ایک کالج تھا۔نانا اُس میں پرنسپل تھے۔فارسی اور اردو پر اُن کی گہری نظر تھی اور انگریزوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے انھوں نے انگریزی بھی بہت اچھی پڑھ لی تھی۔انھوں نے سات جلدوں میں حلیم بجلی، کے نام سے اردو شعروں کی ڈکشنری مرتب کی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔حال ہی میں اس کا ایک ایڈیشن دہلی کے پبلشر فرید بک ڈپو نے شائع کیا ہے۔انھوں نے انگریزوں کو اردو پڑھانے کے لیے نصابی کتابیں تیار کی تھیں۔ان کتابوں میں انگریزی فقروں کا اردو ترجمہ رومن میں لکھا گیا تھا۔مرحوم نے دہلی کی جامع مسجد پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی جسے اپنے زمانے میں خاصی مقبولیت حاصل تھی۔

میری والدہ قیصر سلطانہ مرحومہ غیر معمولی صلاحیتوں کی خاتون تھیں۔چوں کہ نانا مرحوم کی انگریزوں سے ملاقاتیں رہتی تھیں،اس لیے وہ عورتوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔انھوں نے اپنے لڑکے اور لڑکیوں دونوں کو برابر کی تعلیم دی۔والدہ کو ایک پبلک اسکول فرانسیس گرلز ہائی اسکول میں داخل کردیا گیا۔جہاں انھوں نے انگریزی پر خاصی قدرت حاصل کرلی۔انگریزی میں بہت روانی سے بات کرتی تھیں۔ابھی وہ مڈل پاس ہی کررہی تھیں کہ اُن کی شادی کردی گئی۔والدہ مرحومہ اپنے والد کے زیرِ اثر اردو میں مضامین بھی لکھتی تھیں۔یہ مضامین عورتوں کے سماجی مسائل پر ہی ہوتے تھے۔ہمارا گھر خاصا خوشحال تھا کہ اچانک ایک طویل بیماری کا شکار ہو کر میرے والد کا انتقال ہو گیا،جس کی وجہ سے ہمارے خاندان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔جو گھر میں اثاثہ تھا وہ والد کی بیماری میں خرچ ہو چکا تھا۔اُن کی وفات کے بعد آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔والدہ مرحومہ کو اُن کی والدہ نے اور ہمارے تایا نے کئی بار کہا کہ وہ بچوں کو لے کر اُن کے گھر آجائیں۔لیکن والدہ کی خودداری ہمیشہ مانع رہیں۔مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ یہ لوگ اس وقت تو بڑی محبت سے

بلا رہے ہیں لیکن کچھ ہی عرصے بعد ان گھروں میں میرے بچوں کی حیثیت نوکروں کی ہو جائے گی۔ چناں چہ والدہ مرحومہ نے دنیا بھر کی مصیبتیں اُٹھائیں لیکن خاندان میں کسی کا احسان نہیں اُٹھایا۔ ہمارے نانا اس علاقے میں قلعے والے بابوجی کے نام سے مشہور تھے اور ان کی بہت عزت تھی لیکن والد کے انتقال سے والدہ ہمت نہیں ہاریں۔ انھوں نے محلے کے لوگوں کے کپڑے سینا شروع کر دیے۔ گھروں میں جا کر ٹیوشن کیں اور ساتھ ہی دوبارہ تعلیم جاری رکھی۔ پانچ چھ سال ہی میں بی اے کا امتحان پاس کر لیا اور پھر اساتذہ کی تربیت حاصل کی۔ پہلے وہ ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر اور پھر ہیڈ مسٹرس کے عہدے پر فائز ہو گئیں۔ والدہ مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ ضرورت ہے کہ ہم اپنی لڑکیوں کو اتنی تعلیم دیں کہ اگر کوئی برا وقت آئے تو وہ گھر کو سنبھال سکیں۔ اسی لیے انھوں نے میری اور میری بہنوں کی تعلیم پر بہت زور دیا اور سب کو اعلا تعلیم دلوائی۔

میں ۲۳ ردسمبر ۱۹۳۵ء کو دلی میں پیدا ہوا۔ دلی میں پہلے تو ایک پرائمری اسکول میں تعلیم پائی اور پھر اینگلو عربک دریا گنج اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ تیرہ سال کا تھا اور ساتویں کلاس میں تھا کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے ہو گئے۔ اسکول بند کر دیے گئے۔ چھ مہینے بعد اینگلو عربک اسکول کی اجمیری گیٹ کی شاخ کھل گئی۔ میں داخلے کے لیے گیا۔ اس وقت اور کلاسوں میں تو طلبا تھے لیکن نویں کلاس میں بہت کم لڑکے تھے، اس لیے پرنسپل صاحب نے معمولی سے سوال و جواب کے بعد مجھے نویں میں داخل کر لیا۔ اس اسکول میں پہلے ہی دن میری ملاقات محمد اسلم خاں سے ہوئی جو بعد میں اردو دنیا میں اسلم پرویز کے نام سے مشہور ہوئے۔

☆ والد محترم کی بے وقت وفات نے آپ کی شخصیت پر کس قسم کے اثرات مرتب کیے نیز زندگی کے کسی مرحلے پر اس محرومی کے باعث نفسیاتی طور پر کسی کمی یا کجی کا احساس تو نہیں ہوا؟

☆☆ والد مرحوم کی وفات اس وقت ہوئی تھی جب میں سات یا آٹھ سال کا تھا۔ یہ بہت کچی عمر ہوتی ہے۔ ہم پانچ بھائی بہن تھے جن میں چار بہنیں تھیں۔ والد کے نہ ہونے سے مجھ پر ایک منفی اثر یہ پڑا کہ میں اکثر گھر سے غائب رہ کر دوستوں میں وقت گزارنے لگا بلکہ بعض اوقات میں نے کچھ ایسے کام کیے کہ اگر والد مرحوم حیات ہوتے تو نہیں کر سکتا تھا۔ مثلاً ہمارے گھر کے پاس میراثی رہتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں لال قلعے سے پانچ یا سات روپے کا بلاناغہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ یہ لوگ گانے بجانے کا پیشہ کرتے تھے۔ میں اُن کی صحبت میں پڑ گیا۔ میں نے طبلہ بجانے کی تربیت حاصل کی۔ جب اچھی خاصی تربیت ہو گئی تو موسیقی کے استاد اپنی ٹولی میں لے جانے لگے۔ ایک دن کسی نے میرے چچا مرحوم سے اس کی شکایت کر دی اور عین اس وقت جب میں جھوم جھوم کر طبلہ بجا رہا تھا، چچا آ گئے۔ وہ تحصیلدار تھے اور اُن کا علاقے میں خاصا رعب تھا۔ انھوں نے ہمارے استاد کو بہت بری طرح ڈانٹا اور کہا کہ تم میرے بچے کو خراب کر رہے ہو۔ یہ کہہ کر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھر لے آئے۔ جب والدہ کو یہ قصہ معلوم ہوا تو وہ والد کو یاد کر کے بہت روئیں اور نماز پڑھ کر دعا مانگتی رہیں کہ میں صحیح راستے پر آ جاؤں۔ یہ میری والدہ کا خاص طریقہ تھا۔ مجھ سے کچھ نہیں کہا لیکن خدا سے دعائیں مانگتی رہیں۔ میں کچھ دن تک تو ٹھیک رہا لیکن پھر اسی راستے پر آ گیا۔ میرے گھر کے پاس سپیرے رہتے تھے، میں اُن کے چکر میں آ گیا اور اُن کے ساتھ جنگلوں میں جا کر سانپ پکڑنے لگا۔ اس فن میں مجھے اتنی قدرت حاصل ہو گئی کہ میں سانپ پکڑ لیا کرتا تھا۔ جب چچا مرحوم کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بے انتہا ناراض ہوئے اور گھر لا کر مجھے بہت ڈانٹا اور کہا کہ تم خاندان کی عزت سے کیوں کھیل رہے ہو۔ میری والدہ کو بھی یہ بات سخت بری لگی۔ انھوں نے اپنے قاعدے کے مطابق نماز پڑھی اور میرے لیے دعائیں مانگیں۔ اس طرح کی شرارتیں بچپن کی بہت ہیں۔ میں غریبی کی وجہ سے کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال تو نہیں کھیل سکا تھا لیکن گلی ڈنڈا اور پتنگ بازی میں ماہر ہو گیا تھا اور اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ میں کم عمری ہی میں پتنگ بازی کے مقابلے میں شریک ہونے لگا اور دو تین دفعہ انعام کا مستحق قرار پایا۔ اگر چہ میں دبلا پتلا تھا لیکن گلی ڈنڈے میں اتنا ماہر تھا کہ جب اس لگاتا تھا تو گلی کو اُچھال کر ڈنڈے سے ملاتا تھا تو وہ آسمانوں سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ یہ شوق میرے زیادہ دن نہیں رہے۔ پتنگ لوٹ رہا تھا، ایک پتنگ اس طرح سے آئی کہ میں اس کے پیچھے بھاگا اور میں نے پتنگ لوٹنے کے لیے چھت پر سے چھلانگ لگا دی۔ چھت کے نیچے ایک بزرگ عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اُن کے پاس پلنگ پر گرا اور پلنگ کے ڈنڈے ٹوٹ گئے۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کی ڈنڈی سے بہت مارا لیکن اس عمر میں مجھ پر کسی مار پیٹ کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ اور سن لیجیے۔

ایک دفعہ سائیکل چلا رہا تھا۔ سامنے سے سر پر کپڑوں کی گٹھری لادے ایک دھوبن آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ میں پوری کوشش کے باوجود اس دھوبن سے ٹکرا گیا۔ دھوبن زمین پر گری اور اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر دو چار طمانچے ایسے رسید کیے جو مجھے آج تک یاد ہیں۔ مجھے بچپن میں لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ انھیں اتنا چھیڑتا تھا کہ وہ رونے لگتی تھیں۔ لڑکوں کو بھی بہت ستاتا تھا۔ ایک لڑکے کے ساتھ شرارت کا ایک واقعہ سن لیجیے۔ گلی کے نکڑ پر ایک بنیے کی دکان تھی۔ بنیے نے آٹے کے لیے ایک بوری بنا رکھی تھی۔ اُن کا بیٹا میرا دوست تھا اور میں اکثر اس سے شرارتیں کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ بوری میں جھکا آٹا تول رہا تھا۔ میں نے اُسے پیچھے سے دھکا دے دیا۔ وہ آٹے کی بوری میں سر کے بل گرا۔ اس کے سر اور جسم پر آٹے کی ایک موٹی سی تہہ جم گئی۔ وہ میرا ہم عمر تھا، اس لیے دکان سے چھلانگ لگا کر والدہ سے شکایت کرنے کے لیے میرے گھر کی طرف آیا۔ جب گلی اور بچوں نے اس کی یہ ہیئت دیکھی تو بچے تالیاں بجاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ اس کے بعد

میرے گھر پہنچا اور امی نے جیسے ہی اُس کو دیکھا فوراً سمجھ گئیں کہ شرارت میری ہے۔ اُن کی ہنسی نکل گئی پھر اُنھوں نے ہنسی پر قابو پاتے ہی مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔ خود کھڑے ہو کر والدہ نے اُس کا منہ دھلوایا اور کپڑے جھاڑے۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر اُس بچے کے لڑکے کو واپس بھیجا۔ اس طرح کی شرارتوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ میں نے طوالت کے خوف سے چند شرارتیں ہی بیان کی ہیں۔

غرض یہ ہے کہ والد کے انتقال سے مجھ پر اچھا خاصا منفی اثر مرتب ہوا لیکن میری والدہ کی کوششوں اور اُن کی دعاؤں نے مجھے محفوظ کر دیا مگر ایک اثر یہ بھی ہوا کہ مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ میں آج بھی ہندوستان کے وزیر اعظم اور صدرِ جمہوریہ ہند سے اس طرح بات کرتا ہوں جیسے وہ عام آدمی ہوں۔

☆ اسلم پرویز صاحب نے تو آپ کی جائز و ناجائز حمایت کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے مگر اس کے باوجود ہم اس غیر شریفانہ لفظ کا پس منظر جاننا چاہتے ہیں جو اینگلو عربک اسکول میں دوبارہ داخلے پر آپ کو دیکھتے ہوئے ایک لڑکے نے آپ کی بابت ادا کیا تھا۔ جس کا ذکر اسلم پرویز صاحب نے اپنے مضمون میں بھی کیا ہے؟

☆☆ اسلم پرویز صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ میں اور اسلم صاحب دو ہی کلاس سے ایک ساتھ پڑھتے آئے ہیں۔ ہم لوگ علی گڑھ یونیورسٹی میں چار سال تک ایک ہی کمرے میں رہے ہیں۔ ہمارے تعلقات میں اسلم صاحب کی غیر معمولی شرافت کو زیادہ دخل رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اینگلو عربک اسکول میں جب میں داخلے کے لیے پہنچا تھا تو مجھے دیکھتے ہی اسلم صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ایک طالب علم نے کہا "ابے یہ بھی یہاں آ گیا۔ یہ تو بہت حرامی ہے"۔ اور یہ بات اُس نے ایسے گھبراہٹ کے عالم میں اور اتنے زور سے کہی کہ میں نے اور سب لڑکوں نے سنا۔ ماسٹر جی اس لڑکے پر بہت ناراض ہوئے لیکن کچھ ہی دن میں میری اُس سے بھی دوستی ہو گئی۔ اس لڑکے کا نام تابش عشرت تھا۔ یہ ۱۹۴۲ء میں میرے ساتھ اینگلو عربک کی دریا گنج شاخ میں پڑھتا تھا۔

☆ سنا ہے آپ اینگلو عربک اسکول میں کئی بار فیل بھی ہوتے رہے ہیں۔ فیل ہونے والے مضامین اور اسباب کی بابت کچھ روشنی ڈالیے؟

☆☆ جناب! میں نے امتحان کے نقطۂ نظر سے کم پڑھا ہے پھر بھی میں کبھی فیل نہیں ہوا۔ میں نصابی کتابوں کے علاوہ سب کچھ پڑھتا تھا۔ اب تو میری یادداشت وہ نہیں رہی جو لڑکپن میں اور جوانی میں تھی لیکن اس وقت حال یہ تھا کہ ایک دفعہ ایک چیز پڑھنے کے بعد وہ دماغ پر نقش ہو جاتی تھی اور یہی میری کامیابی کا راز ہے۔ بس ایک واقعہ سن لیجیے۔ میرے ایک ماسٹر جی تھے نعیم۔۔۔ بہت ظالم تھے اور بہت مارتے تھے۔ میں اُن سے بہت چڑتا ہوں۔ طالب علم کی معمولی سی غلطی پر سخت سزا دیتے تھے۔ اُن کے پاس ایک چھڑی تھی جس کا وہ بہت زیادہ استعمال کرتے تھے۔ ایک دفعہ اُنھوں نے کلاس کو ہوم ورک کے طور پر انگریزی کی ایک نظم رٹنے کے لیے کہا۔ دوسرے دن جب میں کلاس میں آیا تو اُنھوں نے سب سے یہ نظم سنانے کے لیے کہا۔ کچی پکی سب نے سنا دی۔ میں پریشان تھا کیوں کہ میں نے یہ نظم رٹی نہیں تھی۔ نعیم صاحب اکثر میرے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ مگر کوئی لڑکا بہت زیادہ بدتمیزی کرتا یا ماسٹر جی کی حکم عدولی کرتا تو وہ جا کر پرنسپل کو بلا لاتے اور پرنسپل صاحب اپنی چھڑی ہاتھ میں لہراتے ہوئے کلاس میں آتے۔ اُس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ نظم بہت بڑی نہیں تھی۔ کیوں کہ ماسٹر جی نے مجھے بینچ پر کھڑا کر رکھا تھا، اُن کے جاتے ہی میں نے برابر میں بیٹھے ہوئے لڑکے سے کہا کہ کتاب کھول کر میرے سامنے رکھ دو۔ اُس نے ایسا ہی کیا اور ایک دو دفعہ نظم پڑھنے کے بعد میں نے یاد کر لی۔ تھوڑی دیر میں پرنسپل صاحب ہوا میں اپنی بید گھماتے ہوئے کلاس روم میں داخل ہوئے۔ آتے ہی اُنھوں نے اونچی آواز میں مجھ سے پوچھا۔ تم نے یہ نظم کیوں یاد نہیں کی۔ میں نے بہت ہی معصوم چہرہ بنا کر پرنسپل صاحب سے کہا کہ ماسٹر جی ہر وقت میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ مجھے تو نظم پوری یاد ہے۔ اُنھوں نے کہا سناؤ اور میں نے ایک بھی غلطی کیے بغیر پوری نظم سنا دی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نعیم صاحب پر بہت ناراض ہوئے۔ کہنے لگے کہ بچوں کے پیچھے اس طرح نہیں پڑتے۔ جانیں آپ کو اس لڑکے سے کیا بیر ہے؟ کئی دفعہ آپ اس کی شکایت کر چکے ہیں اور ہر دفعہ میں نے پایا کہ یہ بے قصور ہے۔

☆ بطور طالب علم آپ کی شرارتوں کا بڑا چرچا رہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ آپ کا سزا سے محفوظ رہنا بھی موضوعِ بحث ہوا کرتا تھا؟

☆☆ میں پرائمری اسکول کی تعلیم کے دوران ہی سے بہت شرارتی تھا۔ اگر ان شرارتوں کو بیان کروں تو یہ انٹرویو اتنا طویل ہو جائے گا کہ شاید اس کی طوالت کے آپ متحمل نہ ہو سکیں۔ میری پٹائی بھی خوب ہوتی تھی۔ پرائمری اسکول میں خوب پٹائی ہوئی اور ہائر سیکنڈری اسکول میں بھی میری پٹائی خوب ہوئی مگر میں اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میرے ایک استاد تھے صدیقی صاحب۔ وہ میرے والد مرحوم کے بہت اچھے دوست رہے تھے۔ اُنھیں میری شرارتوں کی سزا پر بہت تکلیف ہوتی تھی۔ کئی بار وہ میرے گھر آئے اور والدہ سے کہا کہ اس کو سنبھالیے۔ یہ اسکول میں شرارتیں کرتا ہے اور ماسٹر اسے مارتے ہیں۔ میں بول نہیں سکتا کیوں کہ دوسرے ماسٹروں سے اختلاف ہو جائے گا۔ میں نے علی گڑھ میں بھی بہت شرارتیں کیں۔ ہاں یہاں میں سزا سے ہمیشہ بچ جاتا۔

☆ کیا آپ ہمیں اس ٹیڑھی کی تفصیل بتانا پسند کریں گے جو لڑکپن سے آپ کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا؟

☆☆ میں لڑکپن میں ہمیشہ کچھ نیا کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا جن کے دو واقعات بیان کر چکا ہوں۔ ایک تو حقہ بجانے کا اور دوسرا سانپ پکڑنے کا۔ اس

کے علاوہ بھی بہت سے ایسے واقعات ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اگر سر پر باپ کا سایہ نہ ہو تو لڑکا کیسا بے بہرہ ہو جاتا ہے بلکہ بگڑ جاتا ہے۔ یہ صرف میری والدہ کی دعاؤں کا اثر تھا کہ میں برباد ہونے سے محفوظ رہا۔ میری والدہ مجھ سے کہا کرتی تھیں کہ تو شرارتیں کرتا ہے مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ بس ایک اصول یاد رکھنا کہ اپنی تعلیم سے لاپرواہ نہ ہونا اور میں نے یہ اصول پرائمری اسکول سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کے دوران ہمیشہ اپنائے رکھا۔

☆ N.C.C ٹریننگ اور MARK MAN بن جانے کی کہانی کیا ہے؟

☆☆ میرے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ میں دنیا میں کچھ کرسکوں۔ ہندوستان سے چین کی لڑائی کے بعد گورنمنٹ نے ہر کالج کو خط لکھا کہ وہ NCC کی تربیت کے لیے دو اساتذہ کو نامزد کریں۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ نے ڈاکٹر تارک ناتھ بالی کے ساتھ میرا نام بھی بھیج دیا۔ یونیورسٹی میں انٹرویو ہوا تو مجھے منتخب کر لیا گیا۔ میں بہت دبلا پتلا تھا اور ہرگز فوجی تربیت کے لائق نہیں تھا۔ اس انٹرویو میں ایک کرنل ہوشیار سنگھ بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ کیا آپ کی صحت اس کا ساتھ دے گی کہ آپ فوجی ٹریننگ لیں۔ آپ تو بہت کمزور ہیں۔ میں نے کہا کہ صاحب! میرے آباو اجداد سب سپاہی پیشہ تھے۔ وہی خون میری رگوں میں بھی ہے۔ رہا سوال دبلا پتلا اور کمزور ہونے کا تو میری گزارش ہے کہ لڑائی جسمانی طاقت سے نہیں، دماغی طاقت سے لڑی جاتی ہے۔ اگر بہت اچھی صحت فوج میں داخل ہونے کے لیے لازمی ہوتی تو ہماری فوج میں سارے گاما پہلوان بھرے ہوتے۔ اس پر کرنل ہوشیار سنگھ بہت زور سے ہنس پڑے اور انھوں نے کہا کہ تم میں صلاحیت ہے اس لیے ہم تمھیں منتخب کرتے ہیں۔

☆ کچھ یاد پڑتا ہے، پہلی بار کب اور کس وسیلے سے طاہر صدیقی صاحب عرف طاہر علیگ کو چھپے دار خط تحریر کیا اور کس مقصد کے تحت کیا؟

☆☆ طاہر علیگ ماہنامہ 'جھلک' نکالتے تھے اور میں علی گڑھ میں فرسٹ ایر کا طالب علم تھا۔ میں نے دو تین کہانیاں چھپنے کے لیے طاہر صاحب کو بھیجیں۔ انھیں کہانیاں پسند آئیں اور انھوں نے یہ کہانیاں چھاپ دیں۔ ایک دن طاہر صاحب ہمارے ہاسٹل آگئے۔ یہاں سے میری پہلی ملاقات تھی۔ انھوں نے کہا کہ آپ اس 'جھلک' کے سب ایڈیٹر ہوجائیں۔ جو مناسب ہوگا آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ میرے لیے اس سے بڑی کوئی پیش کش ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے ان کی تجویز فوراً منظور کر لی اور دوسرے ہی دن میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز ان کے دفتر پہنچ گئے۔ میں نے کام شروع کیا۔ اسلم صاحب کا اس رسالے سے کوئی باقاعدہ تعلق نہیں تھا پھر بھی رسالے کا کوئی کام ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں وہ میرے برابر کے شریک نہ ہوتے ہوں۔ یہ رسالہ ایک جھگڑے میں پھنس کر بند ہوگیا جس کا میری مالی حالت پر برا اثر پڑا۔

☆ دہلی کیفے کھولنے والی داستان پر بھی کچھ روشنی ڈالیے؟

☆☆ ایک دن ہم علی گڑھ کی شمشاد بلڈنگ کے ایک ریستوران میں چائے پی رہے تھے۔ □Ž□¤□'□„□¢□Ž□□□ کا مالک ہمارے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ میں اس ہوٹل کا مالک ہوں لیکن اب مجھے ہمیشہ کے لیے اپنے گاؤں جانا پڑ رہا ہے۔ اگر آپ کسی ایسے صاحب کو جانتے ہوں جو یہ ریستوران کرایے پر لے لیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں اس وقت تو خاموش ہوگیا اور دوسرے دن اسلم صاحب اور میں نے مشورہ کیا اور یہ ریستوران کرایے پر لے لیا۔ کیفے خوب چل پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ اس میں روٹی کے علاوہ سب کھانا پکانے کی ذمے داری اسلم صاحب کی تھی۔ اسلم دہلی کے کھانوں کے بہت ماہر تھے۔ مشکل یہ ہوئی کہ ہمارے دوستوں کا حلقہ بہت بڑا تھا اور علی گڑھ میں قرض کی بہت بڑی روایت تھی۔ گاہکوں پر اتنے بڑے بقایے پر قرض ہوگیا کہ ریستوران چلانا ناممکن ہوگیا اور مجبوراً ہمیں ریستوران بند کرنا پڑا۔

☆ تعلیم سے فراغت کے بعد کن دوستوں سے رابطے رہے۔ میرٹھ والے اعجاز صاحب کی نسبت ہمارا اشتیاق کچھ زیادہ ہے؟

☆☆ تعلیم سے فراغت کے بعد کسی پرانے دوست سے رابطہ نہیں رہا۔ سردھنے کے ایک صاحب تھے بابو، ایک جھگڑے میں ان کا قتل کر دیا گیا۔ وہ دوست تھے متبول اور اعجاز۔ یہ دونوں پاکستان چلے گئے۔ میرٹھ میں حاجی آفتاب ہیں جو اپنے کاروبار میں بہت مصروف ہیں۔ بس میں اور اسلم باقی رہ گئے یا وہ لوگ جن سے دوستی تو نہیں صاحب سلامت تھی۔

☆ مرزا غالب کے اردو اشعار کا سلسلہ آج کل کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ میرے اسکول میں ایک ماسٹر صاحب تھے نمبر پرتاپ گڑھی۔ انھیں پتا تھا کہ مجھے اور اسلم صاحب کو ادب سے دلچسپی ہے اس لیے اسکول بند ہونے کے بعد وہ ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر تین چار لڑکوں سے شعر و شاعری کی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ اکثر مشہور شاعروں اور خاص طور سے غالب کے اشعار کا مطلب بیان کرتے۔ وہ اپنی جیب میں ایک کاغذ میں گڑ کی ایک چھوٹی سی ڈلی لپیٹ کر لاتے تھے اور ہمیں غالب کا ایک شعر دیتے، کہتے کہ کل تم میں سے جو بھی اس شعر کا مطلب صحیح بتائے گا اسے گڑ کی ڈلی انعام میں ملے گی۔ میں نے ایک ترکیب نکالی کہ دیوان غالب کی ایک شرح خریدی۔ غالب کے تمام اشعار کا مطلب جہاں تک ممکن ہوا یاد کرلیا۔ پھر یہ ہوا کہ اکثر مجھے یا اسلم کو گڑ کی ڈلی انعام میں ملا کرتی۔ ایک دن نمبر صاحب نے غالب کی غزل کا ایک مصرع طرح کے طور پر دیا اور کہا کہ

کل اس پر غزل کہہ کر لاؤ۔ دوسرے دن میں اور اسلم غزل لکھ کر لے گئے۔ پہلے میں نے رہبر صاحب کی خدمت میں غزل پیش کی۔ رہبر صاحب نے پوری غزل پڑھی اور پھر ایک طرف رکھ دی اور اس کے بعد پھر وہ اسلم کی غزل پڑھنے لگے۔ بیچ بیچ میں انھوں نے میری غزل اٹھائی۔ پڑھی اور پھر رکھ دی۔ میں سمجھ گیا کہ رہبر صاحب کو میری غزل بہت پسند آئی ہے۔ جب وہ اسلم صاحب کی غزل پڑھ چکے تو انھوں نے میری غزل اٹھائی اور ایک بار پھر شروع سے آخر تک پڑھ ڈالی۔ پوری غزل پڑھنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ''آپ شاعری پر رحم فرمایئے اور نثر لکھیے۔'' اسلم صاحب کی غزل پر انھوں نے ایک آدھ جگہ اصلاح کر دی۔ میں نے بعد میں اسلم کو غزل دکھائی تو انھوں نے دو مصرعوں کے بارے میں بتایا کہ وہ وزن سے گرے ہوئے ہیں۔ بس میں نے شاعری سے توبہ کر لی۔ اس کے بعد سنجیدگی سے شاعری کبھی نہیں کی۔

خاکہ نگاری کا معاملہ یہ ہے کہ شاہد احمد دہلوی کا بہت بڑا عاشق تھا۔ اکثر انھیں طویل خط لکھا کرتا تھا۔ ان کی فرمائش ہوتی تھی کہ میں دہلی کے حالات اُن کو لکھوں۔ ایک دفعہ میں نے چنڈو خانے کی تفصیل اُن کو لکھی۔ میری اس تحریر کے بارے میں فوراً ہی اُن کا تعریفی جواب آیا۔ اُن کو میری تحریر بہت پسند آئی۔ وہ استاد رسا کے زبردست عاشق تھے۔ انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں استاد رسا، علامہ انور صابری وغیرہ کے خاکے لکھوں۔ میرے لیے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے کچھ ہی دنوں میں خاکے لکھ کر اُن کو بھیج دیے۔ شاہد صاحب کو یہ خاکے پسند آئے۔ انھوں نے ماہنامہ 'ساقی' میں دونوں خاکے شائع کر دیے اور اس کے بعد خاکہ نگاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے استاد رسا، علامہ انور صابری، مولانا عبدالسلام نیازی، پنڈت ترجمون ناتھ زتشی زار دہلوی، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، بیگم حمیدہ سلطان وغیرہ کے خاکے لکھے۔

میری خاکہ نگاری میں رفعت سروش صاحب کا بھی بہت دخل ہے۔ یہ آل انڈیا ریڈیو پر اردو مجلس کے پروڈیوسر تھے۔ اُس وقت تک تین چار خاکے لکھے تھے۔ انھوں نے میرے خاکے پڑھے تھے اور فرمائش کر کے مجھ سے مزید خاکے لکھوائے تھے۔

☆ آپ کی حیثیت محقق، ناقد، مترجم، ماہر غالبیات، ماہر آثار قدیمہ اور منتظم کے طور پر تو مسلم ہے مگر الیکٹریشن، مکینک، فوٹو گرافر، باغبانی وغیرہ کے اشغال کی بابت بھی تو کچھ تفصیل بیان فرمایئے؟

☆☆ میں فوٹو گرافر اپنے شوق سے بنا لیکن الیکٹریکل مکینک میری مجبوری تھی۔ والدہ کی لگی بندھی آمدنی تھی جس میں انھیں پانچ بچوں کی پرورش کرنی ہوتی تھی۔ میں سگریٹ بہت پیتا تھا اور پھر دوستوں میں گھومتا رہتا تھا۔ اکثر چائے خانوں میں جاتا، اُس کے لیے پیسے درکار ہوتے۔ اس لیے میں نے بجلی کے پنکھوں کی مرمت کا کام شروع کیا اور ڈیڑھ دو مہینے کام سیکھ کر میری آمدنی شروع ہو گئی جس کی وجہ سے مجھے پیسوں کی تکلیف نہیں رہی۔

فوٹوگرافی کا مجھے بہت شوق تھا اور آج بھی ہے۔ میں ہندوستان سے اگر کینیڈا جاتا ہوں تو میری بچیاں مجھے کیمرے تحفے میں دیتی ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ میرے پاس دس بارہ کیمرے ہیں۔ ہوا یہ کہ جب میں کسی محفل میں کیمرہ لے کر جاتا تو دوست احباب اور وہ لوگ جنھیں میں جانتا بھی نہیں تھا، آ کر کھڑے ہو جاتے کہ ہمارا بھی گروپ لے لو۔ میری حیثیت ایک پروفیشنل فوٹوگرافر کی بن گئی، اس لیے میں نے یہ کام چھوڑ دیا۔ صرف دفتری میں اگر کوئی باہر سے آتا ہے تو میں دفتری میں اس کا ایک فوٹو کھینچ لیتا ہوں۔ اب میں نے یہ کام دفتر کے اور لوگوں کے حوالے کر دیا ہے۔ میرے اس فوٹوگرافی کے شوق کا نتیجہ یہ ہے کہ انجمن کے اردو آرکائیوز میں اس وقت پانچ سو کے قریب اردو مصنفین کی تصویریں ہیں اور اکثر دہلی سے شائع ہونے والے رسالے انجمن کے اردو آرکائیوز سے تصویریں منگاتے ہیں۔ باغبانی کا شوق مجھے بہت تھا اور اب بھی ہے لیکن اس کام کے لیے اب زیادہ وقت نہیں ملتا۔

☆ کروڑی مل کالج سے وزارت تعلیم، گجرال کمیٹی کی ڈائریکٹری اور انجمن کی ذمہ داریوں کی روداد و ثمرات پر گفتگو بھی لازمی ہے؟

☆☆ میں ایم اے کرنے کے بعد کروڑی مل کالج میں پہلے پارٹ ٹائم اور پھر سال ڈیڑھ سال کے بعد مستقل ہو گیا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ کو اردو والوں اور خاص طور سے دہلی کے اردو والوں سے بہت محبت تھی۔ غالب کے وہ عاشق تھے۔ جب بھی کسی سفر پر جاتے تو 'دیوان غالب' اُن کے ساتھ رہتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ مجھے اپنے کمرے میں بلاتے اور غالب کے کسی شعر کا مطلب یا لفظ کا مطلب پوچھتے۔ میں ڈاکٹر سروپ سنگھ کے اس رویے سے خائف ہو گیا اور میں نے غالب کی شرحیں خرید کر ہر شعر کو اچھی طرح سمجھ لیا تا کہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے میری سبکی نہ ہو۔

☆ بیگ صاحب نے ڈاکٹر سروپ سنگھ کو آپ کا نام کس خدمت اور کرامت کے باعث تجویز کیا تھا؟

☆☆ ڈاکٹر سروپ سنگھ دہلی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہو چکے تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے کمیٹی برائے فروغ اردو تشکیل دی جس کا چیئرمین وزیر اطلاعات و نشریات جناب آئی۔ کے۔ گجرال کو بنایا۔ جب کمیٹی کا کام کچھ آگے بڑھا تو اُس کی رپورٹ لکھنے کا سوال آیا۔ گجرال صاحب نے ایک میٹنگ میں کہا کہ کوئی ایسا آدمی تلاش کیجیے جو رپورٹ لکھنے کی ذمے داری سنبھال سکے۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ نے میرا نام لیا اور اُسے کمیٹی نے منظور کر لیا۔ میں نے

کمیٹی کی رپورٹ لکھنے میں بہت محنت کی۔ کمیٹی کے اراکین نے بھائی اور مالک رام صاحب میرے کام سے بہت خوش ہوئے۔ اکثر نے بھائی میری تعریف کرتے رہے۔ انھیں دنوں انجمن کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور مستعفی ہوگئے اور انجمن میں جنرل سکریٹری کی تلاش شروع ہوئی۔ مالک رام صاحب نے میرا نام پیش کیا لیکن معاملہ کیا آگے بڑھاتیں۔ کیوں کہ انجمن کی جنرل سکریٹری شپ کے لیے سردار جعفری، سکندر علی وجد، جمیل عظیم آبادی جیسے بڑے ادیب اور شاعر اور کچھ دوسرے اور تیسرے درجے کے ادیب امیدوار تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان لوگوں کے ہوتے ہوئے کون میرا نام منظور کرے گا لیکن ایک دن صبح ہی صبح انجمن کے صدر پنڈت آنند نرائن ملا صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ کل انجمن کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا تھا جس نے آپ کو جنرل سکریٹری منتخب کیا ہے۔ آپ فوراً علی گڑھ جا کر چارج لے لیں۔ میں اس وقت گجرال کمیٹی میں کام کر رہا تھا۔ مجھے انجمن زیادہ پسند تھی۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ہر نوجوان ادیب کے لیے انجمن ایک آئیڈیل تھی۔ میں نے چارج لے لیا اور اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا اور خدا کا شکر ہے کہ میری والدہ کی دعائیں تھیں کہ مجھے غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اتنی کامیابی کہ میرے قریب ترین دوست بھی میرے دشمنوں کی صف میں شامل ہونے پر مجبور ہوگئے۔ میں نے پہلی بار اپنے حاسدوں کو اتنی بڑی تعداد میں دیکھا تھا۔ یہاں ایک واقعہ سن لیجیے۔ ایک دن میں سخت پریشان بیٹھا تھا۔ والدہ مرحومہ نے پوچھا کیا بات ہے؟ کیوں پریشان ہو؟ میں نے ان کو بتایا کہ کل تک ایک صاحب جو میرے اچھے دوست تھے، میرے انجمن میں آنے سے اتنے ناراض تھے کہ انھوں نے اپنے ایک شاگرد سے میرے خلاف اخباروں میں خط چھپوایا ہے۔ میں نے اس خط کے بارے میں والدہ کو بتایا۔ والدہ نے جو جواب دیا وہ اتنے برس گزرنے کے باوجود میرے ذہن پر نقش ہیں۔ انھوں نے فرمایا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم محسود ہو حاسد نہیں۔ حاسدوں کی پروا کیے بغیر اپنا کام کرتے رہو۔ ان شاء اللہ خدا تم کو کامیاب کرے گا۔

☆ اگر آپ کو ماہر غالبیات تصور کر لیا جائے تو دیگر مسلم و مستند غالبیات کے ماہرین سے اپنا موازنہ کس طرح فرمائیں گے؟

☆☆ جناب! ماہر کا لفظ تو بہت بڑا ہے۔ میں یہ بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں خود کو غالب کا طالب علم سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اردو میں مالک رام، غلام رسول مہر، شیخ اکرام، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود ایسے حضرات ماہرینِ غالبیات کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

☆ آپ کے خیال میں آج کل اردو کی تنقید کا معیار اور مزاج کس قسم اور نوعیت کا ہے نیز تنقید کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ میں اردو کی تنقید کے مضامین بہت کم پڑھتا ہوں اور معیار میں جو تنقیدی مضامین پڑھنے کا موقع ملتا ہے دوسرے یا تیسرے درجے کے ہوتے ہیں۔ غزل کی طرح تنقید لکھنا بھی ایک آسان فن سمجھ لیا گیا ہے۔ میرا ہمیشہ سے خیال رہا ہے کہ تنقید حاصل کیے ہوئے کچھ نظریات اور خیالات کو اردو کی تخلیقات پر اطلاق کرنے کا کاروبار ہے۔

☆ آپ سے اتفاق کرتے ہوئے تنقید کے باب میں مغربی اصولوں اور نظریات سے استفادہ نہ کیا جائے تو پھر رہنمائی کا ماخذ کیا ہونا چاہیے؟

☆☆ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ ہمیں مغربی تنقید سے استفادہ نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ استفادہ صرف اتنا ہو کہ یہ نہ ہو کہ تنقید محض مذاق بن کر رہ جائے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ جن حضرات کا انگریزی کا بہت اچھا مطالعہ ہوتا ہے وہ اکثر وہی تنقید کا پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ مشرقی تنقید میں بھی بہت جان ہے اور آپ فارسی اور عربی کی قدیم ترین کتابیں اٹھا کر دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ ہمارے بزرگوں نے تنقید کے میدان میں بھی بہت اچھا کام کیا ہے۔

☆ ہم چاہیں گے کہ آپ ہمارے قارئین کو آثار قدیمہ کی بابت اپنی دلچسپی، خدمات اور کارناموں سے آگاہ فرمائیں؟

☆☆ میں دلی کا رہنے والا ہوں اور ایک زمانے میں تو دلی کے آثار قدیمہ کے بارے میں دلی والوں کی معلومات بہت اچھی ہوتی تھی۔ میرے چچا اور تایا کو آثار قدیمہ سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ اکثر ان علاقوں میں گھومنے جاتے اور مجھے بھی ساتھ لے جاتے، جس کی وجہ سے مجھے آثار قدیمہ میں دل چسپی پیدا ہوئی۔ دلی اردو اکیڈمی کے سکریٹری سید شریف الحسن نقوی صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ آپ اکاڈمی کے رسالے 'ایوانِ اردو' میں قسط وار مضمون لکھیے۔ میں نے دلی کے آثار قدیمہ پر ایک دو قسطیں لکھیں جو خاصی مقبول ہوئیں اور پھر میں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ آثار قدیمہ پر میری چودہ پندرہ قسطیں چھپ چکی تھیں کہ ایک دن نقوی صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں سر سید احمد خاں کی 'آثار الصنادید' مرتب کروں۔ میرے بزرگ محققوں نے میری خاصی ذہنی تربیت کر دی تھی۔ میں نے 'آثار الصنادید' مرتب کی۔ سر سید احمد خاں کی 'آثار الصنادید' ایک جلد میں تھی، میرا مرتب ایڈیشن تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ سر سید احمد خاں کی تحریروں میں کون اضافہ کر سکتا ہے۔ میں نے تو صرف اس کے حواشی لکھے ہیں۔ سر سید احمد خاں نے یہ کام ڈیڑھ سو سال پہلے کیا تھا اور اب ان آثار قدیمہ کی حالت بالکل بدل گئی تھی، جن کا ذکر سر سید احمد خاں نے اپنی کتاب میں کیا تھا۔ میں نے ان کی موجودہ حالت دوبارہ لکھی۔ اس طرح گویا ایک اور آثار الصنادید وجود میں آ گئی۔ سر سید احمد خاں نے دلی کے بعض بزرگوں کا حال لکھا تھا، میں نے ان پر اچھے خاصے طویل حواشی لکھے۔ اس کے بعد میری

ایک اور کتاب دہلی کے آثار قدیمہ کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب کسی محترمہ نے پاکستان سے دہلی کے مقدس مقامات کے نام سے اس کا جعلی ایڈیشن شائع کیا۔ اُس پر مصنف کا نام صوفی خلیق احمد انجم لکھا۔ دہلی کے آثار قدیمہ پر میری ایک اور کتاب ہے درگاہ شاہ مرداں۔ اس درگاہ میں اہم حضرات کی قبریں ہونا دلچسپ عبارتیں تھیں۔ میں نے ان کی تفصیل بیان کی ہے۔

☆ اس مرحلے پر خدا بخش ہائے تحقیق صورت بنانے کی تشریح بھی ضروری ہے؟

☆☆ میں نے اکثر کہا ہے کہ خدا بخش ہائے تحقیق صورت بنانے اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اردو کے عظیم محقق قاضی عبدالودود کی خدمت میں اکثر حاضر ہونے کا موقع ملا تھا۔ میں نے گھنٹوں اُن سے گفتگو کی لیکن کبھی اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ وہ نجی گفتگو میں بھی صرف دوسروں کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے رہتے تھے۔ اُن کی گفتگو اور چہرے پر دور دور تک شگفتگی کا نام نہیں تھا۔ انھیں دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ خدا بخش ہائے تحقیق صورت بنائے۔

☆ ایک خاص انداز رائے یہ ہے کہ کسی بھی صاحب امتیاز شخص کا محقق یا ماہر ہونا اُس کے معاونین کا کارنامہ ہوا کرتا ہے؟

☆☆ مجھے آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ محقق ہونا یا کسی فن کے ماہر ہونے میں اس کے معاونین کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ جیسے غالبؔ کے محقق اور نقاد مالکؔ رام، مسعود حسین رضوی ادیب، قاضی عبدالودود، مالک رام، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولانا غلام رسول مہر، شیخ اکرام اور پروفیسر نذیر احمد کی تحقیقی کتابیں اور ادبی ورثے میں ملی ہیں، اُسے کسی اور معاون کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اپنی آخری کتاب غالبؔ کا سفر کلکتہ اور ادبی معرکہ ان تمام بزرگ محققین کے نام منسوب کی ہے جو ان حضرات کی غیر معمولی ادبی خدمات کا ایک معمولی سا اعتراف ہے۔

☆ عود ہندی کی چوری کی بابت اپنے محسوسات اور تصورات کی نسبت کچھ فرمایئے؟

☆☆ آپ جانتے ہیں کہ یونیورسٹی میں حسد اور سازشیں بڑے پیمانے پر ہوتی ہیں۔ مجھے دہلی یونیورسٹی کی لائبریری نے ایک کمرہ دے رکھا تھا جس میں میں کلاس سے فارغ ہو کر صبح سے شام تک کام کرتا تھا۔ وہاں میرے پاس اسٹیل کی ایک الماری تھی۔ ایک صاحب جنھیں میری ادبی زندگی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ میری عدم موجودگی میں کمرے میں آتے تھے۔ نہ جانے کس طرح انھوں نے میری الماری کی چابی بنوالی۔ ایک دن ایک ریسرچ اسکالر نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا کہ وہ مجھ سے ملاقات کے لیے میرے کمرے میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ فلاں استاد میری الماری کھولے ہوئے کھڑے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی میں فوراً اپنے کمرے میں گیا معلوم ہوا کہ عود ہندی اور کئی بیش قیمت کتابیں غائب ہیں۔ نیز جو خطوط میں نے ایڈٹ کر لیے تھے۔ بیچ بیچ میں سے اُن کو غائب کر دیا گیا تھا۔ میں بے انتہا مایوس ہو گیا۔ کیوں کہ میرا خیال تھا کہ اب اتنا زیادہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ ایک دن میں نے بیوی سے اُس چوری کا ذکر آیا اور انھیں بتایا کہ اب میں کسی اور موضوع پر کام کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس کام کا بھی یہی حشر ہوا تو۔ میں خاصا پریشان تھا۔ میں نے کہا کہ پھر میں کیا کروں؟ انھوں نے جواب دیا۔ جو خطوط گم ہو گئے ہیں پہلے وہ خط دوبارہ ترتیب دیجیے اور پھر اس کام کو مکمل کرنے کے لیے سارے کام شروع کر دیجیے۔ اُن کی اس بات میں کیا جادو تھا کہ میں دوسرے ہی دن سے اس کام پر لگ گیا۔ یہاں اتفاق تھا اپنے سارے نوٹس اور ترتیب شدہ خطوط گھر لے آیا۔ عود ہندی کی چوری سے مجھے بہت فائدہ ہوا جس کی تفصیل میں نے اپنی مرتبہ غالبؔ کے خطوط کی پہلی جلد کے آغاز میں دے دی ہے۔

☆ انجمن ترقی اردو (ہند) کا دائرہ کار، توقعات اور مستقبل کے امکانات کیا ہیں؟

☆☆ آپ نے پوچھا کہ انجمن کا مستقبل میں امکان کیا ہے؟ میں ایک بات کا تو آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسے اردو والوں کی تعداد بہت کم ہے جو ہر وقت اردو کی تباہی اور بربادی کا ماتم کرتے رہتے تھے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اردو جیسی زبان کو مارنے والا ابھی پیدا نہیں ہوا اور نہ کبھی ان شاء اللہ ہوگا۔ اردو ہے تو انجمن بھی زندہ رہے گی اور اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے لگاتار کام کرتی رہے گی۔ اردو ان شاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔

☆ انجمن ترقی اردو (ہند) پر چلنے والے مقدموں اور آپ کی پیروی کا بیان قتیاز دلچسپی کا حامل ہونا چاہیے؟

☆☆ انجمن پر کئی سرکاری دفتروں نے مقدمے دائر کر رکھے تھے۔ الزام یہ تھا کہ ہم نے عمارت کے کچھ حصے کرایے پر کیوں اٹھائے؟ مختلف اداروں کے کل ملا کر مقدمات کی تعداد انیس (۱۹) تھی۔ میں جوں مردی سے ان مقدمات کا مقابلہ کرتا رہا اور خدا کا شکر ہے کہ سوائے دو کے سب مقدمات میں انجمن کو کامیابی حاصل ہوئی۔ باقی دو مقدمات کا سلسلہ پچھلے تیس سال سے جاری ہے اور ان شاء اللہ ان میں بھی کامیاب ہوں گے۔ مقدمے کا سارا کام میرے دفتر کے لوگ کرتے ہیں۔

☆ "اردو" کو دہلی کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلوانے میں کن کن

مراحل سے گذرنا پڑتا ہے اس سے "اردو" اور "اردو" والوں کو کیا فوائد حاصل ہوئے؟

☆☆ دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے میں انجمن نے بہت اہم رول ادا کیا۔ جب اردو سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی تو اس کا آرڈیننس تیار کیا گیا۔ اس کا بس ایک لطیفہ سن لیجیے۔ پہلی میٹنگ میں دہلی کی وزیر اعلا شیلا دکشت جی، چیف سکریٹری اور دوسرے افسروں کے علاوہ اردو کی بہت اہم شخصیات شریک تھیں۔ جب چیف سکریٹری صاحب نے آرڈیننس کا مسودہ پڑھ کر سنایا تو باوجود اس کے کہ مجھے معلوم تھا کہ یہ مسودہ انھیں بزرگ نے تیار کیا ہے میں نے غصے سے یہ کہا کہ جن صاحب نے یہ مسودہ تیار کیا ہے انھیں اردو تو کیا دنیا کی کسی بھی زبان کے بارے میں قطعی علم نہیں ہے۔ آرڈیننس میں کہا گیا تھا کہ اگر اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا دیا جائے تو ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کا خرچ آئے گا۔ میں نے غصے سے کہا کہ کون سے ایسے ٹیکس ہیں جو ہم ادا نہیں کرتے۔ کروڑوں روپے ہم مختلف ٹیکسوں کی صورت میں ادا کرتے ہیں پھر بھی صرف ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ نہ دینے کے لیے بہانا بنایا جا رہا ہے۔ آپ اقلیتوں سے ایک سال میں جو ٹیکس وصول کریں وہ مجھے دے دیجیے۔ میں اقلیتوں کے سارے مطالبات پورے کرنے کے بعد ۸۰% فی صدی رقم آپ کو واپس کردوں گا۔ کیوں کہ اقلیتوں پر کبھی روپیہ خرچ ہی نہیں کیا جاتا۔ جب شیلا دکشت جی نے دیکھا کہ مجھے بہت غصہ آ گیا ہے تو انھوں نے کہا پلیز رفعت آپ لے جایئے اور اس کو دوبارہ بنوایئے۔ میں نے انجمن کے کچھ اراکین اور کچھ اردو ادیبوں کو بلا کر ایک آرڈیننس کا مسودہ تیار کیا۔ مجھے اس کام کا تجربہ تھا کیوں کہ اس سے پہلے بہار میں دوسری سرکاری زبان اور آرڈیننس کا جو مسودہ تیار ہوا تھا، اُسے مکمل کرنے میں پروفیسر عبدالمغنی کے ساتھ میں بھی شامل تھا۔ اس لیے اس سلسلے میں میری معلومات اچھی خاصی تھیں۔ انجمن کا تیار کردہ مسودہ معمولی تبدیلی کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔

☆ آج کل دنیا بالخصوص بھارت میں "اردو" کے رسم الخط کی نسبت چلنے والی بحث میں آپ کا موقف کیا ہے؟

☆☆ بھارت میں اردو رسم الخط بدلنے کا نعرہ صرف اردو دشمن لگاتے ہیں۔ یہ وہ دشمن ہیں جو سوچتے ہیں کہ اگر اردو کا رسم الخط بدل جائے تو اردو اور ہندی ایک ہی زبان بن جائے گی اور پھر اس کے بعد اردو کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ پہلے تو اردو والے رسم الخط بدلنے کے حق میں تھے لیکن اردو مخالفوں کی نیت کو سمجھ کر اب کوئی بھی اس حق میں نہیں ہے۔

☆ صحافتی تربیت کا اردو نصاب اور ڈپلومہ کے نتائج کی بابت بھی آگاہی ضروری ہے؟

☆☆ ہم نے بڑے شوق سے صحافتی تربیت کا کورس شروع کیا تھا اور اس میں بڑی تعداد میں لڑکے اور لڑکیوں نے داخلہ لیا تھا۔ ایک سال کے کورس کے بعد ہم نے پوری کوشش کی کہ کوئی یونیورسٹی یا گورنمنٹ کا کوئی ادارہ ہماری سند کو تسلیم کر لے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بعض یونیورسٹیوں کی شرط تھی کہ پہلے فی طالب علم ہم دو ہزار روپے داخل کریں تب وہ اپنی یونیورسٹی سے ہمارا الحاق منظور کریں گے۔ طالب علم اتنی بڑی فیس ادا نہیں کر سکتے تھے، اس لیے ہم یہ کورس بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔ آج کل ہم انسانی فروغ برائے انسانی وسائل کے زیر اہتمام ایک کمپیوٹر کورس چلا رہے ہیں جس میں ہر سال اسی (۸۰) کے قریب طلبا داخلہ لیتے ہیں۔ کامیاب طالب علموں میں بیشتر کو بہت جلد ملازمت مل جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارے یہاں ٹیلنٹ اردو ٹیچنگ کا ایک کورس ہے جس میں عام نوجوانوں سے لے کر گورنمنٹ کے اعلا ترین افسران پڑھنے آتے ہیں۔ پھر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ کے زیر اہتمام ہم لائبریری سائنس کا ایک کورس چلاتے ہیں جس میں ہر سال تقریباً چالیس طالب علم ہوتے ہیں۔

☆ بچوں کا ادبی ٹرسٹ آج کل کس حال میں ہے اور اس کے دائرۂ کار سے کل کتنے بچوں کو کس قسم کے فوائد حاصل ہو رہے ہیں؟

☆☆ بچوں کا ادبی ٹرسٹ اس طرح نہیں چل رہا ہے جس طرح میں چاہتا تھا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ بچوں کے لیے اچھی کتابیں چھاپنے کے لیے بہت بڑی رقم چاہیے اور گورنمنٹ نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ انجمن کو کسی بھی نام پر ایک پیسے کی گرانٹ نہیں دے گی۔ چناں چہ ادبی ٹرسٹ چل رہا ہے لیکن اس کی حالت بہت اچھی نہیں ہے۔

☆ ڈاکٹر صاحب! آپ کی بذلہ سنجی کے ڈنکے بج چکے ہیں۔ جس کے بطن سے لگتا ہے تیر و تفنگ کا سا الفاظ کے علم اور بحالی کی معافت ادا کرتے ہیں؟

☆☆ آپ یقین جانیے کہ اگر میری حسِ مزاح ساتھ نہیں دیتی تو ایسے نامساعد حالات میں میرے لیے زندہ رہنا مشکل ہوتا۔ میں نے یہ خصوصیت اپنی والدہ محترمہ سے سیکھی تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ اگر رونے پیٹنے سے کوئی تکلیف دور ہوتی تو سب لوگ مصیبت پڑنے پر رو رو کر اپنا دکھ دور کر لیتے، اس لیے ہر حال میں آنسو پونچھ ڈالو اور خدا کی ان دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرو جس سے دنیا کے بیشتر لوگ محروم ہیں۔ میری حالت یہ ہے کہ آج بھی بڑے بڑے لوگوں کی موجودگی میں اپنے مزاج سے باز نہیں آتا مگر میں ہمیشہ یہ خیال رکھتا ہوں کہ میرے منہ سے کوئی بات ایسی نہ نکل جائے جس سے بزرگوں کو تکلیف پہنچے۔

☆ آپ کی بابت چونکہ لڑنے کا تصور بھی عام ہے کہیں اس کے ڈانڈے جنگجویانہ خاندانی پس منظر سے تو نہیں ملتے؟

☆☆ میں جنگ کبھی اپنی طرف سے شروع نہیں کرتا اور ہر ممکن کوشش کرتا

ہوں کہ کسی کے خلاف جنگ میں میں اپنا وقت خراب نہ کروں لیکن زندگی میں ایک یا دو واقعات ایسے ہوئے ہیں جب میں نے تختہ یا تختہ کہہ کر میدانِ جنگ میں قدم رکھا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بڑے بڑے مادی طاقت وروں کو منہ کی کھانی پڑی۔

☆ آپ کی نسبت اپنی شرافت پر جیسے کا ناز اور عقل کی رہنمائی کے تصور سے کیا مراد لی جائے؟

☆☆ میں نے کہیں لکھا ہے کہ میں اس دنیا میں اپنی شرافت پر جیتا ہوں۔ میں چوں کہ اصل نسل پٹھان ہوں (اور یہ پتا نہیں کتنا اصلی پٹھان ہوں لیکن پٹھانوں کی ساری خصوصیات مجھ میں ہیں) میں نہ کسی کو دباتا ہوں نہ کسی سے دبتا ہوں۔ زندہ رہنے کے میرے اپنے طریقے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ مجھے ان طریقوں میں ناکامی نہیں ہوئی۔

☆ چلتے چلتے ان خساروں کی تفصیل بھی بیان فرما دیجیے جن کا آپ کو سامنا رہا اور آپ کے احباب انھیں آپ کی شخصیت کا ضعف گردانتے ہیں؟

☆☆ انجمن میں خدا کا شکر ہے کہ آج تک کوئی خسارہ نہیں ہوا۔ یہ تو خدا کا کرم ہے اور میری والدہ کی دعائیں ہیں کہ میں نے انجمن کے جس کام میں ہاتھ ڈالا اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں جب بھی کسی کام کو شروع کرتا ہوں تو ہر ممکن کوشش کرتا ہوں کہ مجھے کامیابی حاصل ہو اور مجھے یقین ہے کہ جو لوگ اس عقیدے کے ساتھ کام کرتے ہیں وہ مشکل ہی سے ناکام ہوتے ہیں۔

☆ یہاں اگر ہم آپ کی گرل فرینڈ (بیگم صاحبہ) کی خدمات کی بابت دریافت نہ کریں گے تو زیادتی کے مرتکب ہوں گے۔ آپ کو اور آپ کے اندر چھپے شریر بچے کے علاوہ آپ کے ہشتر کر بچوں کو سنبھالنے سنوارنے اور کامیاب انسان بنانے میں ان کا کردار کیا ہے؟

☆☆ مجھے بچپن ہی سے اپنے والد کی محرومی کا احساس رہا ہے۔ میرا کوئی چھوٹا یا بڑا بھائی نہیں تھا، اس لیے مجھے زندگی میں عزیز ترین سرپرست مردوں کی حمایت نہیں ملی۔ اگر کبھی کوئی لڑکا اپنے باپ کے ساتھ بازار میں جا رہا ہوتا تو میں اسے حسد سے نہیں حسرت سے بہت دیر تک دیکھا کرتا۔ کیوں کہ میرے پاس ایسا کوئی نہیں تھا جس سے میں ضد کر کے اپنی خواہش پوری کرتا۔ والدہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں انھیں پریشان کرتا۔ ہاں، ڈاکٹر سروپ سنگھ نے بڑے بھائی کی طرح قدم قدم پر میری مدد کی۔ گزارا صاحب! اگر ایک طرف مجھے والد کی محرومی کھلتی تھی تو دوسری طرف ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنی محبت دی اور میری زندگی بنائی۔ والدہ کے علاوہ جن کی محبت مجھے آج بھی حاصل ہے اُن میں پانچ بہنیں ہیں۔ بہنیں تو چار تھیں لیکن والدہ نے ایک بچی کو گود لے لیا تھا۔ اس کی شادی کراچی میں ہوگئی۔ جب میں کراچی جاتا ہوں تو یہ بہن یعنی عذرا ایک لمحے کے لیے مجھے نہیں چھوڑتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں ایسی بہنوں کی محبت نصیب ہے۔ بیوی کا حال یہ ہے کہ واقعی میری بیوی نہیں گرل فرینڈ ہیں۔ ہم لوگوں نے ایک فیصلہ کر رکھا ہے کہ خاندان کے کسی آدمی کا ذکر نہیں کریں گے۔ کبھی کسی بات پر خاندان والے رنجیدگیاں بھی کریں تو ہم توجہ نہیں کریں گے۔ پھر ایک اصول اور ہے جس نے ہماری زندگی کو انتہائی خوشگوار بنا رکھا ہے کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے ایک دو منٹ سے زیادہ ناراض نہیں رہتے۔ اگر میں نے کبھی غصے سے کوئی بات کہہ دی تو تھوڑی دیر بعد معافی مانگ لیتا ہوں اور یہی رویہ میری بیوی کا بھی ہے۔

☆ گزشتہ دنوں آپ خاصے علیل رہے ہیں۔ کہیں یہ آپ کی چین سموکنگ کا شاخسانہ تو نہیں۔ ذرا جلدی سے ہمارے قارئین کو صحت مندی کی خوشخبری سنا دیجیے؟

☆☆ یہ ٹھیک ہے کہ پچھلے دنوں میں سخت علیل رہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں زندگی میں نزلے اور بخار کے علاوہ کبھی کسی مرض میں گرفتار نہیں ہوا۔ رہا سوال سگریٹ کا تو برمنگھم میں ایک دفعہ مجھے پاکستان کے ایک صاحب ڈاکٹر نسیم کے ساتھ ان کے اسپتال میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ کینسر کے مریضوں کے وارڈ کے انچارج تھے۔ ہم نے اُن مریضوں کو جس حالت میں دیکھا، اس سے مجھے بے انتہا تکلیف ہوئی۔ ڈاکٹر نسیم نے بتایا کہ اُن مریضوں کی یہ حالت ہے کہ ہر مہینے دو یا تین مریض خدا کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ میرے بیوی اور بچوں نے کیا قصور کیا ہے جو میں انھیں اس طرح بے یار و مددگار دنیا میں چھوڑ جاؤں۔ اپنے والد کی وفات کے بعد والدہ کی مصیبتیں یاد آ گئیں۔ اس لیے میں نے اسی دن سگریٹ نوشی بند کر دی اور خدا کا شکر ہے کہ پھر سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میری بیماری کا قصہ مختصر یہ ہے کہ بلڈ پریشر کی شکایت ہوئی تو ایک ڈاکٹر نے دوا دے دی۔ اس دوا سے جسم میں نمک اتنا کم ہو گیا کہ ایک دن جب میں صبح کو اٹھا تو مجھ سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا نہ بولا جا رہا تھا۔ ایک مقامی ڈاکٹر کو بلا کر دکھلایا گیا تو اُس نے کہا کہ ان پر فالج کا اثر ہے۔ اب میں یہ باتیں سن کر ہوش میں آ چکا تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں اُن ہی کا علاج کروں گا۔ میری بیوی نہیں مانیں۔ ڈرائیور اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ میری بیوی مجھے گاڑی میں بٹھا کر دہلی کے سب سے مہنگے اور سب سے بڑے اپولو اسپتال میں لے گئیں۔ وہاں میں پندرہ بیس دن رہا۔ اس اسپتال نے میرے سارے چیک اپ کیے اور آخر میں ڈاکٹر نے کچھ دوائیں لکھ دیں اور یہ ہدایت دی کہ کھانا کھانے کے بعد آدھا چمچ نمک پانی میں گھول کر پی لیجیے اور صرف یہ بتانے کے

لیے ہمیں باربڑھا کر دوپٹہ کا بل بھرنا پڑا۔

☆ ہندوستان میں اردو زبان و ادب سے وابستہ اداروں کو عموماً "ادبی اڈوں" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انجمن کے بارے احباب کی رائے اور تاثر کس طرح کا ہے؟

☆☆ ہندوستان میں اردو زبان کے ادبی ادارے ادبی اڈوں سے کم نہیں ہیں لیکن میں چوں کہ پاکستان اکثر جاتا رہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ پاکستان میں بھی ادبی اڈوں کا یہی حال ہے۔ انجمن کے بارے میں جو میرے کرم فرما اور مہربان ہیں۔ وہ میری خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو انجمن میں آتے ہیں تو خود کو میری کرسی پر بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ میں بار بار اپنی والدہ محترمہ کا ذکر کرتا ہوں مگر میری زندگی میری والدہ کی بنائی ہوئی ہے۔ میں نے جب انجمن کا چارج لیا تو اس کی حالت بڑی خراب تھی۔ لوگوں کی بیٹھکوں پر ہرے رنگ کے کپڑے بچھے ہوئے تھے اور اس پر سیاہی کے بڑے بڑے داغ ہوتے تھے۔ ہر کمرے کے باہر پرانے زمانے کے دروازوں کی چلمنیں پڑی ہوتی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دم گھٹتا تھا۔ میں نے عہد کیا کہ ان شاء اللہ انجمن کو ایک جدید ادارہ کا ادارہ بناؤں گا۔ میں نے جب اپنی والدہ سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ ضرور بناؤ لیکن یہ خیال رکھو کہ تمھارے دشمنوں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ ان سے انجمن کی اچھی حالت دیکھی نہیں جائے گی۔

☆ ہندوستان میں آج کل اردو زبان اور ادب کی حالت کیا ہے نیز آنے والے زمانوں میں کس قسم کی نظر آتی ہے؟

☆☆ ہندوستان میں اردو کی حالت بہت اچھی نہیں ہے تو بہت بری بھی نہیں ہے۔ جموں اینڈ کشمیر کی پہلی سرکاری زبان اردو ہے۔ آندھرا پردیش میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ تو حاصل نہیں ہے لیکن مراعات اور سہولتیں وہ ساری فراہم کی گئی ہیں جو دوسری زبانوں کو دی جاتی ہیں۔ دہلی اور بہار میں یہ باقاعدہ سرکاری زبان ہے۔ اتر پردیش میں بھی اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے لیکن اردو دشمنوں نے عدالت میں ایک مقدمہ کر دیا ہے جو ابھی چل رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب اردو کا مرکز شمالی ہندوستان سے تبدیل ہو کر جنوبی ہند کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ پہلے تو آپ آئیے مہاراشٹر کی طرف۔ یہاں ہزاروں کی تعداد میں اردو میڈیم کے پرائمری، مڈل اور ہائر سیکنڈری اسکول ہیں۔ ابھی کچھ سال پہلے دو سال لگاتار لاکھوں طلبا میں سے اردو میڈیم کے طلبا نے ٹاپ کیا تھا اور اب بھی وہاں اردو میڈیم کے طالب علم امتیازی نمبروں سے پاس ہوتے ہیں۔ آندھرا پردیش، کرناٹک، تامل ناڈو، کیرالا وغیرہ میں اردو کی حالت خاصی بہتر ہے۔ اب حکومت کو اور خود اردو والوں کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ اردو ہندوستان کا اہم ترین ورثہ ہے اور اسے زندہ رکھنا اُن کا فرض ہے۔ اگر ہندوستان کے اردو والے سنجیدگی سے اردو کی ترقی و فروغ کے لیے کام کریں تو بہت جلد یہ زبان ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ہم پلہ ہو جائے گی۔ مگر ہم اردو والوں کی مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ اردو کی ترقی و فروغ کے لیے کام کرتے ہیں اور باقی لوگ ان کام کرنے والوں کو اور حکومت کو کوستے اور گالیاں دیتے ہیں اور کام کرنے والوں کو ہر طرح بدنام کرتے ہیں۔ خود کوئی کام نہیں کرتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں گورنمنٹ اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے کروڑوں روپے خرچ کر رہی ہے۔ نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بجٹ تیرہ کروڑ کے قریب ہے۔ ہندوستان کی تیرہ ریاستوں میں اردو اکیڈمیاں قائم ہیں جن کی لسانی اور ادبی خدمات غنیمت ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے بعض اکیڈمیاں ایسا کام نہیں کرتیں جسے ہم معیاری کہہ سکیں۔

☆ یہی سوال اگر پاکستان کی نسبت کیا جائے تو آپ کی رائے کس قسم کی ہوگی؟

☆☆ پاکستان میں اردو کی حالت ہندوستان کے مقابلے میں خاصی بہتر ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آزادی کے فوراً بعد ہی اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنا دیا گیا تھا اور اس کی ترقی اور فروغ کے لیے وہ سارے کام شروع کر دیے گئے تھے جو کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔

☆ سمندر پار اردو کی نئی بستیوں سے آپ کس قسم کی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں؟

☆☆ ہندوستان اور پاکستان کے باہر کی بستیوں میں جو اردو کا ماحول ہے وہ خاصا حوصلہ افزا ہے۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ جب کوئی سیمینار یا مشاعرہ ہوتا ہے تو وہ ہال بھرا ہوا ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اردو کے ان شائقین کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں۔ اگر ایسا ہوا تو برصغیر سے باہر اردو کا مستقبل بھی روشن رہے گا۔

☆ تیسری دنیا بالخصوص عالم اسلام کے خلاف استعماریت کی جنگ کا وقت آپ کے خیال میں کس سمت بڑھنے کے امکانات ہیں اور برصغیر خاص کر بھارت کے سیکولر کلچر کے حامل مسلمان کس طرح سے اس کے نتائج سے متاثر ہو سکتے ہیں؟

☆☆ اگر مسلمان اسلام کی ڈوری مضبوطی سے تھام لیں تو امریکہ، فرانس اور انگلینڈ کوئی بھی مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسلام نے مسلمانوں میں جو ہمت اور حوصلہ پیدا کیا ہے وہ پوری دنیا پر فتح پانے کے لیے کافی ہے لیکن میں کہوں گا کہ لوگ اسلام کے اس طرح پیرو نہیں ہیں جیسا انھیں ہونا چاہیے۔

میں اور شیطان

اسلم پرویز

(دہلی بھارت)

میں اور شیطان کا روایتی تصور تو یہی ہے کہ وہ ملعون ہے مطعون ہے خدا کی نافرمانی کرنے والا ہے اور انسان کو تمام برائیاں وہی سکھاتا ہے۔ شیطان کا یہ تصور آسمانوں سے آیا ہوا ہے۔ ہماری زمینی زندگی میں شیطان کے کچھ اور تصورات بھی ہیں۔ مثلاً معصوم بچے کی شرارت کو شیطانی اور ایسے بچے کو شیطان کہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک شیطان، انسان کی اس زندگی کا شریک ہے جو دردو داغ و سوز و ساز و آرزو و جستجو سے عبارت ہے۔ پھر ہمارے مصلحین اخلاق نے بھی گناہ گار لوگوں کے اس رویے کی مذمت کی ہے جہاں وہ اپنے کاموں کے لیے شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے راجا مہدی علی خاں کی نظم 'میں اور شیطان' کو بھی تھوڑا یاد کرتے چلیں:

میں اور شیطان دیکھ رہے تھے
جنت کی دیوار پہ چڑھ کر
جنت کے دل چسپ مناظر
نیارے نیارے پیارے پیارے
میں اور شیطان دیکھ رہے تھے
موٹی موٹی توندوں والے
لمبی لمبی داڑھی والے
خوف زدہ حوروں کے پیچھے
چٹکی بجاتے ناچتے گاتے
دوڑ رہے تھے بھاگ رہے تھے
میں اور شیطان دیکھ رہے تھے

ہماری شعری روایت میں شاعر حق کا علم بردار ہے اور اپنا سلسلہ ابراہیم، منصور، سرمد اور سقراط سے ملاتا ہے اور بقول حافظ ثنائی زہد کو ریا کا مترادف قرار دیتا ہے: 'کہ حافظ توبہ از زہد ریا کرد'۔ اور جب راجا مہدی علی خاں کی نظم 'میں اور شیطان' میں شاعر اور شیطان دونوں ہی ایک ساتھ مولوی کی جنت کا منظر دیکھ رہے ہیں تو اس کا مطلب گویا یہی ہوا کہ راجا مہدی علی خاں کی رو سے زندگی کی اس تگاپوئے دمادم میں شاعر اور شیطان دونوں ہی ایک دوسرے کے ہم رتبہ اور ہم پلہ ہیں ۔۔۔۔ اپنے اپنے شخصی امتیاز کے ساتھ۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی مجھ سے میرے سٹوڈنٹ کے تخلص پر سوال کرے تو میں جواب دوں گا: 'میں کہ خود اپنے ہی مذاق طرب آگیں کا شکار' جب کہ شیطان اسی سوال کے جواب میں کہے گا: 'میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو'۔ یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ مجھ میں اور خلیق انجم میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں تب ہی تو ہم اتنا لمبا ساتھ نبھاتے چلے آرہے ہیں لیکن ان مشترک خصوصیات کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کی کاربن کاپی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئلہ اور پانی دونوں کی ایک مشترک خصوصیت بجلی پیدا کرنا ہے پھر بھی کوئلہ کوئلہ ہے اور پانی پانی۔ ہاں آپ مجھے اور خلیق انجم کو ایک ہی سکے کے دو رخ کہہ سکتے ہیں اور سکہ بھی دھات کی اکہری ٹکلی کا جس کی ایک ہی پرت ہوتی ہے جہاں دوسری پرت کے چھوٹ کر علاحدہ ہو جانے کا کوئی خطرہ ہی نہیں۔ اس انجذاب و انضمام کے باوجود ایک ہی سکے کے یہ دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک ہیڈ اور دوسرا ٹیل جس کے لیے تقسیم سے پہلے کی اردو میں ملکہ وکٹوریہ کی تصویر والے سکے کے تعلق سے میم حرف کی اصطلاح رائج تھی۔ میم سے مراد انگریز عورت یعنی ہیڈ اور حرف گویا ٹیل۔ اب وہ دنیا جس میں میں اور خلیق انجم رہتے ہیں یہ بات تو بخوبی جانتی ہی ہوگی کہ اس سکے کا ہیڈ تو خلیق انجم ہی ہیں اور ٹیل اسلم پرویز۔ اور اس بات کی تصدیق تو میں خود میں اپنے ساتھ خلیق انجم کی اس سدا بہار اور پر شفقت ہیکڑی سے کر سکتا ہوں جسے اسی ہیڈ اینڈ ٹیل کے ایک محاورے میں Head I win , tail you lose. کہتے ہیں۔ شیطان کے زمینی تصور میں شیطان کی وہ ذہانت اور فطانت اور وہ قوت مقابلہ اور مجادلہ بھی محفوظ ہے جسے اقبال جیسے شاعر نے خراج تحسین پیش کیا ہے اور جب میں اپنے ساتھ خلیق انجم کو شیطان کہہ رہا ہوں تو اس کا سیدھا سا مطلب یہی ہوا کہ اس ایک سکے کا، جس کے ہم دونوں دو رخ ہیں، ہیڈ تو خلیق انجم ہی ہوئے اس لیے کہ ذہانت اور فطانت یا بالفاظ دیگر شیطنت کا تعلق تو سر ہی سے ہے۔ اب میری مشکل یہ ہے کہ اگرچہ میں اس سکے کی ٹیل یعنی دم ہوں جس کے کہ خلیق انجم ہیڈ یعنی سر ہیں لیکن اکثر لوگ مجھے بجائے اس سکے کی دم کے خود خلیق انجم ہی کی دم سمجھتے رہے تا آں کہ میری شادی نہیں ہوگئی اور میں ہر شوہر مسکین کی طرح اپنی بیوی کی دم نہیں ہوگیا۔ خلیق انجم کی ہیکڑی تو مجھ پر آج تک ہے لیکن اس ہیکڑی اور بیوی کی ہیکڑی میں فرق ہے۔ خلیق انجم کی دھونس تو مجھ پر یہ ہے کہ 'یا وہ کام تو میں تیرے ہاتھ سے کروا کے رہوں گا جس کام کے کرنے کی توفیق ہے' اور میری بیوی کا ٹھینگا یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ایسا کام جو خود ان کے بس کا نہیں اس کا مجھ سے بس کا تو ہونا ہی چاہیے۔ اب میں کہ ان دو پاٹوں کے بیچ میں برابر رگڑے کھا رہا ہوں۔ بس یوں نہیں پستا کہ سخت جان ہوں اور چنگل کے باہر جاؤں تو کہاں کہ ان سے باہر سوائے ایک بے اماں خلا کے اور کچھ بھی نہیں۔

یہ ۱۹۴۸ کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں، جب میری اور خلیق انجم کی ملاقات ایک دوسرے سے ہوئی تھی۔ ۱۹۴۷ سے پہلے اینگلو عربک ہائر

سیکنڈری اسکول کی دلّی شہر میں کئی شاخیں تھیں۔ ایک شاخ دریا گنج میں پٹودی ہاؤس پر بھی تھی جہاں ظلیق انجم پڑھتے تھے۔ یہ اسکول کلاں محل سے قریب تھا جہاں ظلیق انجم کا گھر تھا۔ میں شروع ہی سے اجمیری دروازے والی مین برانچ میں تھا۔ ۱۹۴۷ کے فسادات میں سب کچھ تہس نہس ہوگیا۔ مارچ ۱۹۴۸ میں جب فسادات کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو اجمیری دروازے پر مدرسہ غازی الدین میں اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول پھر سے شروع ہوا۔ اب پوری دلّی میں ایک ہی اینگلو عربک اسکول رہ گیا تھا۔ چناں چہ اینگلو عربک کی تمام ماتحت شاخوں کے بچے کھچے طلبہ نے یہیں داخلہ لیا۔ ایک روز انگریزی کی کلاس جاری تھی۔ مولانا زبیر قریشی جو کبھی سینٹ اسٹیفنس کالج کے طالب علم رہے تھے زور شور سے مینس فیلڈ کی گرامر سے analysis کا سبق پڑھا رہے تھے کہ ایک لڑکا شلوار قمیص میں ملبوس پیروں میں چپل پہنے سر پر بالوں کا گچھا بنائے بغل میں کچھ کتابیں دبائے کلاس روم میں داخل ہوا۔ بظاہر یہ نیو ایڈمیشن کیس تھا۔ مولانا زبیر قریشی نے خلاف عادت اس لڑکے سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا۔ بعد میں اس کا سبب بھی معلوم ہوگیا کہ اس لڑکے سے ان کی عزیز داری تھی۔ مولانا زبیر قریشی نے نو وارد کو ایک خالی بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے analysis کا سبق پھر وہیں سے شروع کردیا جہاں سے منقطع کیا تھا۔ میرے برابر کی سیٹ پر عشرت نام کا ایک لڑکا بیٹھتا تھا۔ یہ لڑکا اس سے پہلے پٹودی ہاؤس کی برانچ میں تھا۔ عشرت نے اس لڑکے کے داخل ہوتے ہی کہا 'ابے یہ بھی یہاں آ گیا'۔ میں نے پوچھا کون؟ وہ بولا 'یہی جو ابھی آیا ہے۔ ظلیق ہے اس کا نام بڑا حرامی ہے سالا'۔ اس وقت اس لفظ حرامی کا استعمال تو عشرت ہی نے سوچ سمجھ کر کیا تھا ورنہ میں ہی اس کے دور رس امکانات کا اندازہ لگانے کا اہل تھا۔ آج باون برس بعد جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو میری سمجھ میں اس لفظ حرامی کے معنی یہ آرہے ہیں کہ ظلیق انجم دنیا میں صرف اپنی شرطوں پر جینے کے لیے پیدا ہوا ہے اور اس انداز سے جینے کے عذاب و ثواب کا بھی وہ تنہا ہی حصے دار ہے۔ عام طور پر لوگ جب کسی کام کی طرف بڑھتے ہیں تو پہلے وہ یہ جاننے کے لیے کہ آیا وہ یہ کام کر بھی سکیں گے اپنے آپ کو ناپتے تولتے ہیں۔ ظلیق انجم کا مزاج یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے تو بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتا ہے اسی کے ساتھ وہ ہاتھ کے ہاتھ اپنے اندر ایک عملی فراست کو جنم دیتا ہے اور پھر اس فراست کے سہارے نازی کی راہیں کھینچتے ہوئے وہ اس آگ کے دریا کے پار اتر جاتا ہے۔ ہمارے شاعروں نے عقل کو کہیں عشق کا آئینہ دکھلایا ہے کہیں دل کا، کہیں جنوں کا اور کہیں خرد کا۔ ظلیق انجم عقل کو عمل کا آئینہ دکھاتے ہوئے چلتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ظلیق انجم کاروبار حیات میں عمل سے کتنا کام لیتے ہیں یہ تو آپ کو ان کے معترضین میں سے کوئی بھی بتا سکتا ہے۔ بہرحال یہ کہ انھیں عقل کی رہنمائی کتنی حاصل ہے یہ سوال خود انھی سے پوچھنے کا ہے۔ ہم تو بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ عقل سے کام لینے والے زندگی میں زیادہ تر مصلحتی ہی ثابت ہوتے ہیں۔

ہاں تو میرے کلاس فیلو عشرت نے ظلیق کے لیے لفظ حرامی کا جو استعمال کیا اس کے تعلق سے میرے نزدیک کسی مرتب اخلاق رویے کی عدم موجودگی کے باوجود کسی کو حرامی کہنے کی نفسیات یہی ہے کہ یہ شخص ہم سے آگے کیوں نکلا جارہا ہے۔ کہنا دراصل یہ ہے کہ بعض لوگ یوں بھی حرامی ہیں اور وہ بھی حرامی اور وہ اپنے اس طرح کے حرامی پن کو اس طرح کے حرامی پن سے آلودہ کیے رکھتے ہیں لیکن جو حرامی پن ظلیق انجم سے منسوب کیا جاسکتا ہے وہ انتہائی شفاف transparent اور مستحسن قسم کا حرامی پن ہے اور جس کے حوالے سے عشرت نے ظلیق کے بارے میں یہ بات کہی وہ تو معصومیت کی وہ شرارت ہے جسے ہم شیطانی کہتے ہیں۔ خیر تو لگے ہی روز اسکول میں جب تفریح کا گھنٹہ بجا تو میں معمول کے مطابق اپنے ایک دوست کے انتظار میں کینٹین کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ساتھ چائے پینے کے لیے۔ وہ دوست تو نہیں آئے البتہ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے ظلیق چلے آرہے ہیں۔ مجھے ایک دم ان کے بارے میں عشرت کا دیا ہوا خطاب یاد آگیا اس لیے انھیں دیکھ کر کچھ دیر کے لیے سراسیمہ سا ہونے کی تیاری میں لگ گیا اتنے میں وہ قریب پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے ایک دم بے تکلفی برتتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا 'چائے پئیں گے؟' اور اس کے ساتھ ہم چائے کی میز پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ ہم چائے کے ساتھ ایک دوسرے کے بارے میں باتیں پوچھتے رہے اور کچھ زیادہ ہی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب بھی آتے گئے۔ چائے کا کپ ختم ہونے کے بعد ظلیق نے جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا اور پہلے مجھے سگرٹ پیش کیا جو میں نے بلا تردد قبول کرلیا۔ میں نے مکمل اناڑی پن سے اور ظلیق نے کمال مہارت سے اپنا اپنا سگرٹ جلایا۔ میں سگرٹ کا دھواں باہر کے باہر ہی چھوڑتا رہا اور وہ جلدی جلدی لمبے لمبے کش اندر کی طرف بھرتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے اپنے اپنے سگرٹ کے ٹوٹے کینٹین کی بھٹی میں جھونکے اور چل دیے پھر کلاس کی طرف۔ آہستہ آہستہ ہم اسکول سے واپسی پر بھی ساتھ نکلنے لگے جہاں سے ہم ادھر ادھر گھومتے اپنے اپنے گھر پہنچتے۔ ایک روز ہم اسکول کے باہر اس گھاس کے میدان میں بیٹھے سگرٹ پی رہے تھے جو اس زمانے میں شاہی کا تالاؤ (شاہ جی کا تالاب) کہلاتا تھا اور جہاں اب کملا مارکیٹ ہے۔ باتوں باتوں میں ظلیق نے مجھ سے پوچھا 'آپ نے سگرٹ کیسے شروع کیا'۔ میں نے کہا 'میں تو سگرٹ پیتا ہی نہیں بس جب آپ پیش کرتے ہیں تو ایک آدھ لب پی لیتا ہوں'۔ ظلیق نے یہ سن کر میرے ہاتھ سے جلتا ہوا سگرٹ لے کر توڑ کر پھینک دیا اور کہا 'نہیں پیتے تو مت پیجیے یہ لت بہت بری ہے لگ جائے تو پیچھا مشکل ہی سے چھوٹتی ہے'۔

انسان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں ان میں تقدیر کو ماننے یا نہ ماننے سے قطع نظر ماحول، وراثت اور سرشت کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ جس وقت میں اور ظلیق انجم ایک دوسرے سے ملے باوجود اس کے کہ اس وقت ہماری عمریں ہی کیا تھیں ظلیق کے والد کو گزرے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے

پر میرے والدین جیات تھے۔ اس اعتبار سے ظلّی کی حیثیت ایک آوارہ پنچھی کی سی تھی اور میری شہری پنجرے کے قیدی کی سی۔ گویا ظلّی نے 'جہنم کے آزاد شعلوں' کی لپیٹ میں جینا سیکھا اور میں نے غلامی کی 'جنت' میں پرورش پائی۔ چناں چہ ظلّی نے شروع ہی سے اختر الایمان کے 'آوارہ عشّاق' آزاد سیلانی عشق کے کی طرح زندگی کی رزم گاہ میں دوڑنے لگا نے شروع کردیے تھے۔ اس طرح ظلّی نے مارک ٹوین کے ہمیرو ہکل بری فن کی طرح زندگی کے بہت سے ایڈونچرز کا مزا لڑکپن ہی کی عمر میں چکھ لیا تھا۔ میری شخصیت پر اس عہد کے اس روایتی باپ کا سایہ تھا جس کے بُرز بیت ہلال کو سامنے رکھ شاید ہماری زبان میں 'باپ رے باپ' کا محاورہ وجود میں آیا ہے۔ باپ کی بالواسطہ شفقت اور براہ راست خشونت، بچّی مٹی کے گھڑے جیسے میرے لڑکپن پر دباؤ ڈالنے والی ان کی ملامت ایمان میرے مستقبل کے تحفظ کی فکر میں میری شخصی آزادی کو معطل رکھنے کی ان کی سوچ جو جھ سونے کا نوالا کھلانے اور قہر کی نگاہ سے دیکھنے کا ان کا رویہ مکمل کود کو مجھ پر اس طرح حرام کردینے کا فتویٰ جیسے مسلمان پر سور کھانا، وضع قطع اور لباس کے معاملے میں خود میری پسند ناپسند پر اپنی پسند ناپسند کو ترجیح، گھر سے باہر نکلنے پر پہرے سے بیوقوف نہ تھا جس سے گھر کی چہار دیواری میں میں ملال تھا۔ لیکن ظلّی کی طرح گھر سے باز ادمیں بالی عمریا کو سر اٹھا کر لے چلنے کا میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ اس صورت حال میں ظلّی کا وجود نا نہ ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ اس کھڑکی کی طرح مجھ پر کھلا جس کے اس طرف اُن خوش گوار آوارگیوں کا بہارستان تھا جس میں شخصیت الاؤ خودرو کی طرح نشو و نما پاتی ہے۔ اس بہارستان میں ظلّی جیسوں کی عمل داری تھی اور ہم جیسے تو اس میں گھر سے بھاگی یا بھگائی ہوئی لڑکیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کے بعد ۱۹۴۸ میں جب اینگلو عربک اسکول دوبارہ کھلا تو دو تین سال تک پڑھائی کی اتنی بری حالت رہی کہ بورڈ کے امتحانات میں فیل ہونے والوں کی شرح صدفی صد رہی۔ اس میں بڑا دخل ہم مسلمان بچوں کے لیے Higher mathematics کے اس مضمون کا تھا جو اس وقت لازمی تھا۔ چناں چہ اینگلو عربک اسکول کے بیشتر لڑکوں نے اس زمانے میں دو یوپی کے امتحان کے بعد علی گڑھ کا رخ کرنا شروع کردیا۔ ظلّی نے علی گڑھ چلنے کے لیے مجھے بھی اکسایا۔ مجھے یہ کام ظاہرا ممکن نظر آتا تھا اس لیے کہ میرے والد تو گھر ہی سے نکلنے کی اجازت مشکل سے دیتے تھے کجا کہ دلی چھوڑ کر علی گڑھ چلے جانا۔ میں نے ظلّی سے کہا کہ مجھے تو اس بارے میں اپنے باپ سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے لیکن معاملہ اصل میں والد کے رعب سے زیادہ اس کمیونی کیشن گیپ کا تھا جس کے سبب میں والد سے خود ان کی قوت رعب سے بھی کہیں زیادہ مرعوب تھا۔ حالاں کہ معاملہ یہ تھا کہ تمام سختی کے باوجود میری اعلا تعلیم کے لیے ہمیشہ کوشاں اور فکر مند رہتے تھے۔ ظلّی کے لیے یہی کہنے کی بات تھی۔ چناں چہ کسی نے سمجھایا کہ اس وقت دلّی میں مسلمانوں کے لیے جو ما ساز گار فضا ہے اس میں مسلمان بچوں کے لیے تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے کے راستے بند ہیں اور اب علی گڑھ جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ کیس کی وکالت کے لیے جناب اختر ہاشمی کو مع ان کی داڑھی، ٹوپی اور اچکن کے ساتھ لایا گیا اور تھوڑی ہی سی رد و کد کے بعد میرے حق میں یہ مقدمہ فیصل ہوگیا کہ والد صاحب مجھے علی گڑھ بھیج دیں گے ہیں اور بھی کہ وہاں میں اکیلا نہیں ہوں گا ظلّی بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ اب علی گڑھ پہنچ کر تو ہم کو گویا ہوا لگ گئی۔ اب مجھ پر سرشاری کا کچھ وہی عالم تھا جو ہجناں کی بکری چاندنی پر رسی تڑوا کر آزاد ہونے کے بعد طاری ہوا تھا اور یہاں ہجناں کی رعایت بھی یوں خوب تھی کہ میرے والد بھی خاں صاحب تھے۔ میرے والد نے اگرچہ مجھے علی گڑھ اپنی مرضی ہی سے بھیجا تھا لیکن ان کے ذہن کے کسی گوشے میں کہیں نہ کہیں وہی ایک پرشفقت ناگواری بھی تھی جس سے ماں باپ کو بچّے جدا کرتے ہوئے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس نفسیاتی گرہ کو ڈھیلا کرنے کے لیے وہ کبھی کبھی کوئی حیلہ لطیف ہی سرزنش کا تکمیل لیا کرتے تھے۔ ایسے موقعوں کے لیے انھوں نے ظلّی کا نام چودھری ظلّی اخرماں رکھ چھوڑا تھا۔

ظلّی نے دوستی کا ناتا جوڑتے ہی اپنی جھپّی جس کے ذریعے میرے بارے میں بہت سے فیصلے خود ہی کر لیے تھے۔ یعنی یہ کہ یہ شخص گلّس ہے بھروسے کے قابل ہے تابع دار ہونے کی حد تک وفادار ہے صاف دل ہے اور یہ بھی کہ ایسا آدمی اندر سے انتہائی کم زور ہوتا ہے وہ مروت کے دائمی مرض میں مبتلا ہوتا ہے وہ خود نتائج نہیں ہوسکتا، اس میں اخلاقی جرأت کی کمی ہوتی ہے لہٰذا اس کے ساتھ ایک ایسے جری سرپرست کا ہونا نہایت ضروری ہے جو اپنی مشکلات کی باڑ کاٹتے ہوئے اپنا راستہ صاف کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بھی راستہ دکھاتا چلے۔ لیکن جس طرح ریڑھے کے اڑیل ٹٹو کا مالک بیچ سڑک پر اکڑوں بیٹھے ہوئے ٹٹو کو اپنے کندھوں پر ڈھو کر لے چلنے کے بجائے چابک مار مار کر اسے بالآخر چلا کرتا ہے اسی طرح ظلّی بھی مجھے چلاتے رہے ہیں میری اپنی ہی ٹانگوں کے بل پر۔ یہ ظلّی کا میری زندگی میں ایک اہم رول ہے۔ خیر تو ان کے اس سرپرستانہ رویے کے حق ہمارے تعلقات میں ہمیشہ کے لیے یہ طے پائے کہ یہ پاس اور میں ان کا سب آرڈی نیٹ۔ اب ان تعلقات میں ایسے مقامات بھی آتے رہے ہیں جہاں وہ داستانوں کے بادشاہ اور میں ان کا وزیر با تدبیر ثابت ہوا ہوں مگر بادشاہ پھر بادشاہ ہے اور وزیر وزیر۔ چناں چہ کبھی کبھی وزیر کی تدبیر بھی بادشاہی کے کھاتے میں چلی جاتی ہے۔

علی گڑھ میں ہم چار سال رہے۔ ہمارے علی گڑھ پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد شہرت 'صبح' کی طرز کا ایک قلمی رسالہ 'جھلک' جاری ہوا۔ ایک انٹرمیڈیٹ فرسٹ ایئر کے طاہر صدیقی عرف طاہر علیگ اس کے ایڈیٹر تھے۔ ظلّی نے رسالے میں چھپنے کے لیے کچھ بھیجا اور ایڈیٹر کے نام پچھ دار قسم کا ایک خط بھی لکھا۔ جواب میں طاہر علیگ صاحب نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور پھر ایک دن خود ہی

ملاقات کے لیے ممتاز ہاسٹل چلے آئے اور اسی ملاقات میں یہ طے پا گیا کہ اگلے شمارے سے ظلیق جھلک کے ایڈیٹر ہوں گے۔ علی گڑھ جیسے چھوٹے سے شہر سے جھلک جیسا ضخیم فلمی ہم اوبی پرچہ نکالنے کا مطلب یہ تھا کہ آدھا پرچہ تو خود تصنیف کیجیے اور باقی آدھا چلتے ہوئے فلمی پرچوں سے نقل کیجیے۔ اب یہ اس اور سب آرائی سے دوالا معاملہ جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے میرے اور ظلیق کے درمیان ہمیشہ سے ایک طرح کی باہمی انڈرسٹینڈنگ رہا ہے یہ کوئی باقاعدہ معاہدہ نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کے ڈرائنگ روم میں دو شخص ایک ساتھ داخل ہوں اور اپنے اپنے حوصلہ یا کم ہمتی، خود اعتمادی یا انکساری، رعونت یا بردباری کے مطابق یا کسی رو رعایت، یا کسی کی خوشنودی، یا کسی کی خاطر تکلفات ان میں سے ایک زیادہ آرام دہ اور قدرے ممتاز اور دوسرا نسبتاً کم آرام دہ اور دور افتادہ نشست اختیار کر لے۔ علی گڑھ میں بی اے کے آخری سال میں چلتے چلتے ہم نے ایک دہلی کینٹین بھی کھول ڈالا۔ یہ کوئی آئیڈیا بھی ظلیق انجم ہی کا تھا۔ یوں تو حقیقتاً یہ ہم دونوں کا مشترکہ وینچر تھا لیکن عملی طور پر فیصلے کرنے اور پالیسی بنانے کی ملا نہ قسم کی ترجیحات ظلیق انجم کا حصہ تھیں اور انتظامی امور کی پیروی میری ذمے داری تھی۔ اس وینچر کا کیا انجام ہوا اس پہیلی کا حل آپ سوچتے جائیے:

یہ لوگ کیوں مری عریانیوں پہ ہنستے ہیں
لباس پھونک کے میں خود کو تو بچا لایا

مسلم یونیورسٹی کے ممتاز ہاسٹل میں ہم دس گیارہ لڑکوں کا گروپ تھا۔ ہم لوگوں میں ہاسٹل لائف کی جھونک کچھ زیادہ ہی بھری ہوئی تھی activity کیا، پروکٹوریل قوانین کی خلاف ورزی کرنا ہمارا صبح و شام کا معمول تھا۔ اس گروپ کے دو سرغنے تھے ایک میرٹھ کی اودل بلڈنگ کے کسی پولیس افسر کے فرزند اعجاز اور دوسرے ظلیق انجم۔ ہم نے شرارتوں کے میدان میں کئی تاریخی کارنامے انجام دیے جن کے نتیجے میں مجھ کو یونیورسٹی سے فرار ہونا پڑا۔ کچھ پر جرمانے ہوئے لیکن سزا سے صاف بچ نکلنے والوں میں جو لوگ شامل تھے ان میں ایک ظلیق انجم بھی تھے۔

علی گڑھ میں ہم دونوں کا ہر وقت کا ساتھ تھا اس لیے ہم دونوں انجم اسلم ہی کے نام سے مشہور تھے۔ بعض لوگوں کو ہمیں دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی اس لیے کہ ہم دونوں کی مثال کسی چلتی ہوئی سائیکل کے ایسے دو پہیوں کی سی تھی جس کا اگلا پہیا سو میل فی گھنٹے اور پچھلا دس میل فی گھنٹے کی رفتار سے گھومتا تھا پھر بھی دونوں اس چلتی ہوئی سائیکل کا اٹوٹ انگ تھے۔ بعض لوگ کہا کرتے تھے یہ ظلیق بڑا چلتا پرزہ ہے مگر اس کے ساتھ جو دوسرا لڑکا رہتا ہے وہ بہت سیدھا ہے۔ مگر میں اس کا مثبتی حیثیت سے کچھ خوش نہیں ہوتا تھا اس لیے کہ مجھے اس موقعے پر منٹو کی ایک کہانی کا وہ کردار یاد آ جاتا تھا جو والنٹیر تھا اور جب ایک بار اس کی محبوبہ نے اس سے اس لفظ والنٹیر کی وضاحت چاہتے ہوئے یہ پوچھا تھا کہ والنٹیر کسے کہتے ہیں تو اس نے برملا جواب دیا تھا 'الو کے پٹھے کو'۔

آج میں جہاں بھی ہوں جو کچھ بھی ہوں کبھی جب اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر ظلیق کا وجود میری زندگی میں نہ ہوتا تو جانے میری زندگی کا رخ آج کیا ہوتا۔ یوں تو آدمی زندگی میں جو کچھ بنتا ہے اپنی ذاتی صلاحیتوں ہی کے بل پر بنتا ہے لیکن اس کے کچھ بھی بننے کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ اسے اپنی ابتدائی زندگی میں کیسے ساتھی ملے وہ کن لوگوں کے حلقۂ اثر میں رہا۔ ظلیق انجم کے مزاج میں بلا کی سماجیت ہے وہ ہمیشہ سے ایک بہت ہی ambitious انسان رہے ہیں۔ ہر ambitious انسان کی اپنے ambitions پورا کرنے کی ایک ethics ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ethics مجھ جیسے unambitious انسان کی ethics سے یقیناً مختلف ہوتی ہے لیکن ambitious لوگوں میں اس ethics کے ان کی اپنی اپنی اچھی یا بری فطرت کے مطابق الگ الگ درجات ہوتے ہیں۔

بے جا مروت، جرأت اظہار کی کمی، شائستگی کی بلندیوں کو چھونے کی للک، اپنے حقوق کا گلا گھونٹنے کا رویہ، چوری چھپے محنت کرنے کی عادت، اپنے مفاد کے لیے کچھ بھی نہ کہہ سکنے یا نہ کر سکنے کی کمی یہ میری شخصیت کی وہ کمزوریاں رہی ہیں جو کسی شخص کو کہیں کا بھی نہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن پھر بھی ایسا کیوں ہوا کہ میرے حصے میں کہیں کا بھی نہ رہنا نہیں آیا۔ اس کا جواب اگر صرف ایک لفظ میں پوچھیے تو یہ ہے کہ ظلیق۔ اگر خدانخواستہ یہی مزاج جو میرا ہے ظلیق کا بھی ہوتا تو "ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے" والا مضمون ہو جاتا لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور اگر ہوا تو یہ کہ ہم تو تیرے ہیں صنم تم کو بھی لے تیریں گے۔ ظلیق انجم کی نظر ہمیشہ accomplishment پر رہی ہے ایسا آدمی پیچھے نہیں اپنے نشانے کی طرف تیزی کی تیزی کے ساتھ دوڑتا رہتا ہے میں اس کے برخلاف perfectoinism کے خواب زاروں کا سیلانی ہوں۔ ایسے آدمی کا ایک ایک قدم بھاری پڑتا ہے۔ وہ دو قدم آگے چلتا ہے تو دس قدم پیچھے پھسل پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں میری زندگی کو ایک ایسا آدمی چاہیے تھا جو مجھے وقتاً فوقتاً دھکا دے رکھے اور وہ آدمی ظلیق انجم کی صورت میں وقت سے بہت پہلے مجھے مل بھی گیا۔ دراصل ایک لکھنے پڑھنے والے کی حیثیت سے میں نے اپنے آپ کو جتنا دریافت کیا ہے وہ ظلیق انجم ہی کے توسط سے کیا ہے۔ اب اگر اس میدان میں میرا بھی اپنا کوئی جوہر ہے جو ان تمام جوہروں سے علاحدہ ہے جو ظلیق انجم کی ذات سے مخصوص ہیں تو اس میں عجب بات کیا ہے۔ اگر زمانے نے زمین کی قوت کشش کو نیوٹن کے توسط سے دریافت کیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہی قوت کشش خود نیوٹن میں بھی ہو اور ایسا ہے بھی نہیں۔ اس کے باوجود نیوٹن کی عظمت اپنی جگہ برقرار ہے۔

اگر ہم دلی چھوڑ کر علی گڑھ نہ گئے ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ دہلی ہائر سیکنڈری بورڈ کی Higher methemetics کے لازمی مضمون کی خلیج کو ہم کبھی پار نہ کر پاتے اور ہم پر یونیورسٹی ایجوکیشن کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند

ہو جائے۔ مجھ کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر علی گڑھ لے جانے والے بھی خلیق ہی تھے علی گڑھ سے واپس آ کر میں نے ہفت روزہ 'آئینہ' کی ملازمت اختیار کر لی اور خلیق انجم بجلی کے پرانے پنکھے بنانے کی فری لانسنگ میں لگ گئے۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ دن کے گیارہ بجے خلیق میرے پاس 'آئینہ' کے دفتر میں آئے اور دفتر سے چھٹی دلا کے سیدھے دلی کالج پہنچے۔ میرے پوچھنے پر کہ آخر قصہ کیا ہے بتایا کہ کالج کے پرنسپل مرزا محمود بیگ صاحب سے بات کرنی ہے اردو ایم اے میں داخلے کے لیے۔ بس یہیں سے ہماری زندگیوں کا رخ اس طرف مڑ گیا جہاں آج ہم ہیں۔

ہمارے ایم اے فائنل کے امتحانات قریب تھے کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا جس کے سبب میں امتحان اس سال نہیں دے سکا۔ خلیق کا ایم اے مجھ سے ایک سال پہلے مکمل ہو گیا۔ ان دنوں ڈاکٹر سروپ سنگھ کروڑی مل کالج کے قائم مقام پرنسپل تھے۔ وہ کالج میں اردو کا شعبہ بحال کرنے کی فکر میں تھے۔ انھوں نے بیگ صاحب سے رجوع کیا کہ وہ اپنے کالج کا کوئی ایسا ایم اے پاس طالب علم انھیں دیں جو ذہین ہو اور بیگ صاحب اس کی لیاقت سے مطمئن ہوں۔ بیگ صاحب نے فوراً ہی خلیق انجم کو ڈاکٹر سروپ سنگھ کی جانب روانہ کر دیا۔ خلیق انجم نے پہلے سال پارٹ ٹائم لیکچرر کی حیثیت سے پڑھایا اور اس ایک ہی سال میں نہ صرف پورے کالج میں اپنے لیے فضا ہموار کر لی بلکہ ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور ڈاکٹر سروپ سنگھ کے دلوں میں بھی جگہ پیدا کر لی۔ ایک سال بعد جب لیکچرر کی پوسٹ کے فل ٹائم اور پرمننٹ ہونے کا موقع آیا تو ایک صاحب جو سینٹ اسٹیفنس کالج میں پارٹ ٹائم لیکچرر تھے وہ بھی میدان میں آ کودے اور کچھ ایسا لگتا تھا کہ شاید یونی ورسٹی کے صدر شعبہ بھی ان پر مہربان تھے۔ خلیق انجم نے ان خدشات کا اظہار ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر سروپ سنگھ سے کیا اور بیگ صاحب کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ ٹھہرے کھرے جاٹ۔ انھوں نے خلیق سے کہا دیکھو میں نے یہ پوسٹ صرف تمھارے لیے کلوائی ہے اور میں نے تمھاری ایک سال کی کارکردگی میں یہ دیکھ لیا ہے کہ آگے چل کر کیمپس کے کالجوں میں اگر کروڑی مل کالج کے شعبۂ اردو کو اپنا کوئی امتیاز قائم کرنا ہے تو وہ تم جیسے آدمی کے یہاں رہتے ہی ہو سکتا ہے۔ تم فکر نہ کرو اگر صدر شعبہ نے کسی اور شخص کو کالج پر تھوپنے کی کوشش کی تو میں یہ پوسٹ ہی ختم کر دوں گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ نوبت آئے صدر شعبہ کو ڈاکٹر سروپ سنگھ کا ارادہ پتا چل گیا اور پھر وہی ہوا جو ڈاکٹر سروپ سنگھ چاہتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں خلیق انجم نے کروڑی مل کالج کے شعبۂ اردو کو آسمانوں پر پہنچا دیا۔ شعبے میں ان کے کارناموں کی طویل فہرست ہے جسے یہاں دہرانے کا محل نہیں۔

کروڑی مل کالج سے چل کر وزارت تعلیم میں گجرال کمیٹی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے خلیق انجم، انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر پہنچے۔ یہاں ایک دلچسپ بات کا ذکر ضروری ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے ممتاز ہاسٹل میں ہمارے ونگ کا بیرا ہماداسی ایک بوڑھا شخص تھا۔ پاس ہی کے حالی پور گاؤں کا رہنے والا۔ وہ اسی زمانے سے خلیق انجم کو انجمن صاحب کہا کرتا تھا۔ اس کی یہ پیش گوئی خلیق انجم کے حق میں پتھر کی لکیر بن گئی۔ چناں چہ آج وہ اردو گھر میں اپنے پورے شان و شکوہ کے ساتھ انجمن صاحب بنے بیٹھے ہیں۔ اردو گھر کی یہ بلند و بالا اور شان دار عمارت جو ہم دیکھ رہے ہیں اس میں کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم کی سرپرستی اور رہنمائی کے ساتھ خلیق انجم کی شخصیت کا وہ ڈائنامزم بھی شامل ہے جس کی تعریف کرنے والے، جس پر رشک کرنے والے اور جس سے جلنے والے سبھی طرح کے لوگ موجود ہیں۔

خلیق انجم نے اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں ہی سے روزگار کے وسائل کی تلاش میں کبھی چھوٹے موٹے کو اپنے راستے کا پتھر نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر کام کو خواہ وہ اکادمک نوعیت کا ہو یا کسی اور طرح کا اور کسی بھی سطح کا پوری dignity of labour کے ساتھ کیا۔ ان کاموں میں ڈاک خانے کے باہر بیٹھ کر خط لکھنا، سر بازار دکان کے تھڑے پر بیٹھ کر بجلی کے پرانے پنکھوں کی مرمت کرنا، کروڑی مل کالج کی لیکچررشپ، گجرال کمیٹی کی ڈائرکٹرشپ، جامعہ اردو کی وائس چانسلری اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی جنرل سکریٹری شپ یہ سبھی شامل ہیں۔

میں نے کچھ دیر پہلے خلیق انجم کے حوالے سے accomplishment اور perfectionism کی بات کہی تھی۔ معاملہ یہ ہے کہ جس شخص کو ایک ہی ساتھ بہت سارے کام کرنے ہوں اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی کام کو لے بیٹھا اس میں مینا کاری کرتا رہے۔ وہ نقالوں کی بھی پروا نہیں کرتا۔ وہ صحیح کام کو ہر قیمت پر تیزی کے ساتھ آگے بڑھانے میں کوشاں رہتا ہے چاہے اس کے لیے کبھی کبھی غلط راستہ ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ وہ ایک کام کی تکمیل کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر دم لینے کا بھی قائل نہیں ہوتا بلکہ پچھلے کام کی تکمیل سے پہلے ہی وہ کسی اگلے کام کا منصوبہ بنا کر اس کی ابتدا بھی کر چکا ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کی ایک نفسیات اور بن جاتی ہے۔ اس کے پاس دوسروں کی سننے کا وقت نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بات کو اسی طرح صادر کرتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ دوسروں کو ان کی بات کہنے کا موقع کم ہی دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ دوسروں کے پاس تو اپنی بات کہنے کا وقت ہی وقت ہے لیکن اسے تو انجمن ترقی اردو (ہند) جیسی کل ہند تنظیم کو چلانا ہے، اردو تحریک کے جلوس میں جھنڈا اٹھا کر چلنا ہے، شاعروں کے مزارات کی بازیافت کے لیے سپریم کورٹ میں وکیل کی جگہ خود کھڑے ہو کر مقدمے کی پیروی کرنی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں خطوط غالب اور آثار الصنادید کی تدوین جیسے علمی اور ادبی کارنامے بھی انجام دینے ہیں جو آگے چل کر تاریخ ادب اردو کا ایک حصہ بننے والے ہیں۔ اس درجہ فعال شخصیت میں تھوڑا بہت عنصر

خودی کا شائل ہوا لازمی سی بات ہے اس خودی کو بعض لوگ چودھراہٹ سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن کام کے راستے میں اڑنگے لگانے والوں کے ہجوم کے سروں پر سے چھلانگ لگانے کے لیے کبھی کبھی چودھراہٹ بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ صالح مقاصد کے حصول کے لیے چودھری بننے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ situatioonal ethics کی رو سے تو بسا اوقات قتل کرگزرنا بھی مستحسن قرار پاجاتا ہے۔ چودھری کہیں آسمان سے نازل نہیں ہوتے وہ ان حالات کی کوکھ ہی سے پیدا ہوتے ہیں جن حالات کو چودھری چاہیے ہوتے ہیں۔ چودھری مرزا محمود بیگ، چودھری خواجہ احمد فاروقی، چودھری انور جمال قدوائی، چودھری سروپ سنگھ یہاں تک کہ چودھری خلیق انجم بھی ایسی ہی کچھ مثالیں ہیں۔

جب شاعر یہ کہتا ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تو اس شعر میں خرابی کا سیدھا سادا اشارہ بظاہر برقِ خرمن ہی کی طرف ہے۔ لیکن کبھی کبھی خونِ گرم بھی تھوڑی بہت خرابی کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہاں 'تھوڑی بہت' کے لفظ پر اصرار کرتے ہوئے اس شعر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے:

جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

میں جانتا ہوں کہ خلیق انجم ہائپر ٹینشن کے مریض نہیں ہیں۔ میں یہ بات بھی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تخریب پسند بھی نہیں۔ ان کے ہاں مخالف کو نیست و نابود کر دینے کا نہیں اس پر سبقت لے جانے کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ ہر محاذ پر مقابلے کے لیے ڈٹے رہنا ان کا مزاج ہے۔ نئے نئے مقابلوں کی تلاش ان کی زندگی کا مشغلہ ہے۔ ان کاموں کے لیے لہو گرم رکھنے کی ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے مخالفین کے ساتھ یہاں تک کہ دوستوں کے ساتھ بھی کبھی کبھی چھوٹی موٹی جھڑپیں چلتی رہنی چاہئیں۔ ایسی جھڑپوں میں مد مقابل کو زچ کر دینے کے خلیق انجم کے پاس بہت سے ہتھکنڈے ہیں۔ مثلاً کسی بحث کے آغاز ہی میں اپنی بات زور شور سے کہی اور سامنے والے شخص کی جانب سے اس بات کا جواب آنے سے پہلے ہی بجلی کی سی تیزی سے گفتگو میں گریز کا پہلو نکال کر کوئی اور بات شروع کر دی یا اپنی بات کے جواب میں اگر دوسرے کی بات سن بھی لی تو اس کے سامنے اس بات کو یہ کہتے ہوئے کہ ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا 'اچھا چھوڑو یار کوئی اور بات کرو'۔

میرے ساتھ خلیق انجم کا معاملہ دنیا سے نرالا ہی ہے۔ وہ کوئی پروگرام، کوئی اسکیم، کوئی پراجیکٹ بناتے ہیں اس کے لیے میرا نام ان کی سمجھ میں سب سے پہلے آتا ہے۔ پھر ساتھ میں یہ بھی کہیں گے یار تم کام تو کرتے نہیں اب تمہارا نام لکھا ہے تو مجھے رسوا نہ کر دینا میرے کام نہ کرنے سے ان کی عزت آبرو واقعی خطرے میں پڑتی ہے جس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اکثر لوگوں کے پاس سیمناروں کے دعوت نامے آتے ہیں جن میں سے بعض لوگ شرکت کی منظوری بھیج دینے کے بعد بھی نہ سیمنار کے لیے مقالہ لکھتے ہیں اور نہ اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اور منتظمین بھی پہلے سے ان تماشوں کا حساب کتاب لگا کر چلتے ہیں کہ اتنے لوگوں کو دعوت نامہ بھیجا جائے گا ان میں سے اتنے آپائیں گے اور جتنے آجاتے ہیں کبھی کبھی وہ بھی زیادہ ہی پڑ جاتے ہیں۔ مگر یہ منتظمین بقول خلیق صاحب انھیں یہ کہہ کر شرمندہ کرتے ہیں دیکھیے خلیق صاحب آپ کے مشورے پر ہم نے اظہر پرویز صاحب کو دعوت نامہ بھیجا تھا وہ نہیں آئے ہمارا سارا پروگرام گڑبڑ ہو گیا۔

لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ اگر دنیا میں خلیق انجم کے سب سے قریب کوئی ہے تو وہ میں ہوں لیکن روح اللہ میں کے عروج سے بھی ایک اگلی منزل معراج کی ہے۔ اس کا مطلب آپ خود ہی سمجھ لیں۔ نزدیک ترین کی اصطلاح بھی دو چیزوں یا دو افراد کے درمیان کسی نہ کسی نوع کے فصل کا اشارہ ہے خواہ وہ فصل بال برابر ہی کیوں نہ ہو۔ خیر تو اس نزدیکی کی بنا پر بعض لوگ جو خلیق انجم سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں تو وہ مجھے پکڑتے ہیں یہ سوچ کر کہ سب سے زیادہ تو خلیق انجم پر شاید میرا ہی ہے۔ خلیق انجم پر بھلا کس کا زور چلا ہے اور اگر چلے گا بھی تو صرف اس کا جس کا زور وہ اپنے پر چلانا چاہیں گے۔ میں ٹھہرا گھر کی مرغی۔ میرے ان سے قریب ترین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بات کے لیے جتنا صاف صاف مجھے منع کر سکتے ہیں دنیا میں کسی کو بھی نہیں کر سکتے۔ کسی دوسرے کی کوئی بات مانیں گے تو اس کی کوئی رگ بھی دبے گی ان سے۔ میری بھلا وہ کون سی رگ دبائیں گے پہلے ہی سے ساری رگیں دبائے بیٹھے ہیں۔

خلیق انجم بلا کے حاضر جواب ہیں اور اتنے ہی بلا کے حاضر دماغ بھی ہیں۔ اکثر بحث و مباحثے میں وہ اپنی اسی طاقت کے بل پر دوسروں کو چت کر دیتے ہیں۔ وہ باتوں باتوں میں ہاتھ کے ہاتھ ایسی پھرتی سے کوئی دلیل گھڑ کر پیش کر دیں گے کہ اس دلیل کے غیر معتبر ہونے کا دوسرے کو کوئی گمان بھی نہیں گزرے گا۔ مثلاً ایک بار میں نے ان سے کہا کہ یار میرا فلاں شاگرد ترقی اردو کونسل میں فلاں پوسٹ کے لیے درخواست دینا چاہتا ہے اس کے لیے اسے ایک experience سرٹیفکٹ چاہیے۔ تم اپنے دفتر کے لیٹر ہیڈ پر اسے ایک سرٹیفکٹ بنوا کر دے دو۔ ابھی میرا فقرہ پوری طرح مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ادھر سے اس کا جواب بھی نکل پڑا۔ "یار میں پہلے ہی دو امیدواروں کو اس قسم کا سرٹیفکٹ دے چکا ہوں اب اور نہیں چلے گا" میری سمجھ میں فوراً ان کی یہ بات آ گئی۔ میں نے کہا "اچھا تو اس نوکری کے لیے اس کی وہاں سفارش ہی کر دو"۔ اس بات کا برجستہ جواب یہ ملا کہ "یار صرف ایک پوسٹ ہے اور اب تک سو درخواستیں وہاں پہنچ چکی ہیں ان میں دس بیس تو یقیناً بڑی سفارشوں والی بھی ہوں گی ایسے میں میری سفارش

کیا کرے گی۔" میں ان کی یہ بات سمجھنے پر بھی مجبور ہو گیا۔ بہر حال طالب علم
سے کہا کہ وہ مزید وقت ضائع کیے بنا پہلی فرصت میں درخواست تو دے ہی آئے
اور پھر آکر مجھے بتائے۔ پھر اگلے روز جب وہ طالب علم پہلی ہی فرصت میں
درخواست داخل کر کے میرے پاس آیا تو اس نے مجھے بتایا کہ اس پوسٹ کے
لیے دفتر میں سب سے پہلے پہنچنے والی درخواست تو خود اسی کی تھی۔ خلیق انجم کا بیٹا
ٹم جیٹ ڈویژن میں کسی اچھی پوسٹ پر لگا ہوا ہے۔ ایک روز میں نے خلیق انجم
سے کہا کہ ذرا کہہ کر فلاں لڑکے کو جیٹ ڈویژن میں کسی چھوٹی موٹی نوکری پر لگوا
دو۔ فوراً سے بھی دو ٹوک جواب آیا ابھی ٹھہر جاؤ یار وہ پہلے ہی دس پندرہ دوستوں کو
وہاں لگوا چکا ہے۔ بہر حال جہاں تک ان کی طرف سے خود اپنے طور پر میری
ذات کو فائدہ پہنچانے کا تعلق ہے اس معاملے میں وہ اسی قدر فعال رہتے ہیں
جس قدر کہ میں خود مجہول ہوں۔

خلیق انجم اپنے روزانہ کے معمولات پر سختی سے کاربند رہتے
ہیں۔ وہ ہر حالت میں رات کو دس بجے اپنے بستر پر ہوتے ہیں۔ صبح ساڑھے چار
بجے اٹھ کر اپنے مطالعے کی میز پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اب آٹھ ساڑھے آٹھ تک یہ
تین چار گھنٹے کا ٹائم ان کا اپنا ہے جو ان کی ادبی کاوشوں کے لیے وقف
ہے۔ انھوں نے بالخصوص تحقیق و تدوین کے میدان میں اپنی جو شناخت قائم کی
ہے وہ اسی سحر خیزی کے معمول کی دین ہے۔ دفتر کا ٹائم ساڑھے نو بجے کا ہے۔ پونے
اور سوا نو کے بیچ دفتر پہنچ کر اپنی میز سنبھال لیتے ہیں۔ اور اب شام تک دنیاداری
ہوتی رہتی ہے۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہے۔ یار خوش، چاہنا خوش۔ دفتر
کے مسائل اور تعمیر سے الگ، اس کے علاوہ کتابوں کی اشاعت، بک ڈپو، انجمن
کمپیوٹر سینٹر، قیصر تعلیمی مرکز، بچوں کا ادبی ٹرسٹ، ملک بھر میں پھیلی ہوئی انجمن کی
شاخوں کی خبر گیری، اردو کے مسائل اور ان سے متعلق مطالبے، جلسے، جلوس اور
تحریکیں غرض اتنی مصروف زندگی کہ خدا کی پناہ۔ اتنی مصروف زندگی میں آدمی کو
تھوڑا بہت کامک ریلیف تو چاہیے ہی ہوتا ہے۔ اس کامک ریلیف کا سامان بھی
قدرت نے خود خلیق انجم کی ذات ہی میں چھپا کر رکھ دیا ہے۔

خلیق انجم تہذیب اور شائستگی کا مطلب بخوبی جانتے ہیں لیکن
مختلف مراتب کے لوگوں کے ساتھ ایک ہی طرح کی تہذیب کو برتنے کے وہ
قائل نہیں۔ وہ شائستہ لوگوں کے ساتھ شائستہ، نیم شائستہ لوگوں کے ساتھ نیم
شائستہ، یہاں تک کہ ناشائستہ لوگوں کے ساتھ ناشائستہ تک بن کر دکھا سکتے
ہیں۔ ان کی وضع اس معاملے میں بقول سید ضمیر یہ ہے

کاٹے ہیں ہم نے یوں ہی ایام زندگی کے
سیدھے سے سیدھے سادے اور کج سے کج رہے ہیں

یہ بڑی جرأت کی بات ہے جو ہر شخص میں نہیں ہوتی۔ خلیق انجم
ایک انتہائی مہذب انسان ہیں اس بات کی گواہی دینے والے کچھ لوگ تو اس دنیا
سے اٹھ گئے جیسے کرنل بشیر حسین زیدی، پنڈت آنند نرائن ملا، پروفیسر خواجہ احمد
فاروقی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مرزا محمود بیگ، پروفیسر محی الدین قادری زور
۔ جو لوگ بفضل خدا ہمارے بیچ موجود ہیں ان میں اندر کمار گجرال، ڈاکٹر سروپ
سنگھ، سید حامد، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اس بات کے گواہ ہیں۔
ان کے ساتھ ہی کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں خلیق انجم نے رسم عقیدت کو کج کلا
ہی اور بانکپن سے نبھایا ہے۔ ایسے لوگوں میں پروفیسر آل احمد سرور، مالک
رام، حیات اللہ انصاری اور پروفیسر مسعود حسین خاں شامل ہیں۔

خلیق انجم میں ظرافت طبع بھی بلا کی ہے۔ ان کی حس مزاح انتہائی
تیز ہے جو ان کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی سے مل کر بڑے گل کھلاتی ہے۔ کوئی
بھی برجستہ جملہ، کوئی زوردار چٹکی، کوئی انتہائی موزوں مذاق دوستوں کی محفل میں یا
سیمیناروں کے اسٹیج پر ملا ان کے منہ سے پھوٹ پڑتا ہے اور پوری محفل کو زعفران
زار بنا دیتا ہے۔ تاہم خلیق انجم کو بذلہ سنج کہنے میں مجھے تھوڑا تامل سا ہے ان کے
مزاج کے ایک گونہ پھکڑپن کے سبب۔ بذلہ سنجی تہذیبی سطح پر ایک ایسے مزاج کی
متقاضی ہے جو پھکڑپن ذرا سا بھی برداشت نہیں کرتا۔ گویا بذلہ سنجی میں لطیف قسم
کے تصنع کی بھی ہلکی سی رمق ہوتی ہے اسی لیے بذلہ سنجی کا علاقہ بھی قدرے محدود
ہوتا ہے۔ خلیق انجم کی ظرافت طبع کو تو ایک بے کراں میدان چاہیے اور کھل کر بات
کرنے کی ان کی طبیعت کو رواداری کی سپر سے زیادہ بے باکی کی تیغ کی ضرورت
ہے۔ اور اس بے باکی کی انتہا ہے منہ پھٹ اور پھکڑ ہونا جو کبھی کبھی خلیق انجم کو ہونا
پڑتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال وہ براہ راست کبھی نہیں کرتے۔ وہ مجلسی خوش گپیوں
کے حیلے سے یہ کام کر جاتے ہیں۔

میں کافی دیر سے اس مضمون کو اختتام پر پہنچانے کی فکر میں ہوں لیکن
اس کی باگ میرے ہاتھ سے کب کی چھوٹ چکی ہے۔ مجھے اپنی زندگی کا سب
سے مشکل کام خلیق انجم کا خاکہ لکھنا ہی لگتا تھا اسی لیے میں اس کو اب تک ٹالتا رہا
تھا۔ اگر خلیق انجم میرے لیے کوئی معروضی حقیقت ہوتا تو میں اسے ماڈل کی طرح
اپنے سامنے بٹھا کر کب کا اس کا نقش اتار چکا ہوتا۔ لیکن ماڈل اور رول ماڈل
میں جو فرق ہو سکتا ہے وہی فرق خلیق انجم کی معروضی شخصیت اور اصلی خلیق انجم میں
ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ یہ اصلی خلیق انجم کیا ہے۔ تو اس اصلی خلیق انجم کی بھی کئی
اصلیتیں ہیں خود ان لوگوں کی اپنی اصلیتوں کے تعلق سے جن کے وجود میں خلیق
انجم کسی نہ کسی طور رچا بسا ہوا ہے۔ تو میرے وجود میں بھی خلیق انجم پچھلے پچاس برسوں
سے پوری طرح سمایا ہوا ہے۔ میں اسے کسی منفرد اکائی کی شکل میں اپنے اندر سے
باہر لا کر آپ کو دکھا ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے تھوڑا تھوڑا سا کہیں کہیں سے کھرچ
کھرچ کر باہر لا لا کر دکھانے میں لگا ہوں۔ اور یہ قضیہ میتھی کی روٹی کے اس
گندھے ہوئے آٹے کے پیڑوں کی طرح ہے جہاں آٹا اور میتھی کا ساگ اپنے
اپنے دونوں سفید اور سبز رنگوں میں دیکھے تو جا سکتے ہیں لیکن انھیں علاحدہ علاحدہ
کر کے نہیں بتایا جا سکتا۔

غالب کا سفرِ کلکتہ

شمیم حنفی (دہلی بھارت)

ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

O

ایسی جہاز رانوں سے لے کر الف لیلہ کے سندباد اور ہماری اپنی داستانوں، مثنویوں، قصوں میں بھانت بھانت کے سفر کا حال، کبھی خود مسافر کی زبانی، کبھی کسی فرضی کہانی کے واسطے سے بیان کیا گیا ہے۔ ایسے عجیب و غریب، تحیر انگیز تجربے دیکھنے میں آتے ہیں کہ ان پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن معاملہ جب کسی مانوس، جیتے جاگتے کردار کا ہو اور اس کے سفر کی روداد محققوں کی جانچ پرکھ سے خوب گزر چکی ہو تو یقین نہ کرنے کا کیا مطلب؟ پھر بھی ذرا اس طرح کی تفصیلات پر نظر ڈالیے:

"اتفاق دیکھیے کہ کان پور پہنچتے ہی میں بیمار پڑ گیا۔ اچانک نوبت یہاں تک پہنچی کہ مجھے چلنے کی طاقت بھی جاتی رہی۔ چوں کہ مجھے اس شہر میں کوئی مناسب طبیب نہ مل سکا اس لیے مجبوراً دریائے گنگا کو عبور کر کے کرایہ کی ایک فینس میں مجھے لکھنؤ کی راہ لینی پڑی۔ میں لکھنؤ میں پانچ مہینے اور چند روز صاحب فراش رہا"۔

O

"اعیانِ سرکار لکھنؤ مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ملے لیکن (معتمد الدولہ آغا میر) کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے جو شرط قرار پائی وہ میری خودداری کے خلاف اور ننگ شیوہ خاکساری تھا---- مختصر جو کچھ شہر میں اس گراں طبع اور سلطان صورت یعنی معتمد الدولہ آغا میر کی فیاضی اور کرم گستری کے بارے میں سنا ہے خدا کی قسم حقیقت اس کے برعکس ہے"۔

O

"چوں کہ میرے اور نواب ذوالفقار علی بہادر کے آبا و اجداد میں دوستانہ مراسم زمانہ قدیم سے چلے آ رہے تھے اور میرے دل میں بھی نواب بہادر کے لیے بڑی محبت اور لگاؤ تھا، اس لیے میں نے ایسی تدبیریں شروع کر دیں کہ جس طرح بھی بن پڑے میں بندیل کھنڈ میں باندے پہنچ جاؤں"۔

اس سفر کے دوران کچھ راستہ یکے پر طے کیا گیا:

O

"جب باندہ پہنچا تو میں نے نواب صاحب سے دو ہزار روپے قرض مانگے ---- میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی غنیمت ہے یہ روپے لو اور یہاں سے چلو"۔

"یہ جنگل کا راستہ تھا۔ اس راستے پر سفر کے لیے گھوڑوں یا گاڑیوں کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ باندے سے چلا، مودہا اور وہاں سے باقی سفر بذریعہ ناؤ"۔

"جمعرات کے دن مودہا پہنچا۔ اتوار تک آرام کیا اور پیر کے روز پھر سفر پر روانہ ہو گیا۔ رات ایک گاؤں میں گزاری۔ منگل کو چلا تارا پہنچا۔ الحمد للہ بخار اتر گیا اور سر کا درد بھی باقی نہیں رہا۔ آج کی رات چلا تارا میں گزاروں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب بخار اور درد سر نہیں رہا۔ اگر زندگی باقی ہے تو کل صبح فتح پور تک کا راستہ طے کروں گا"۔

O

"میں پیر کو مودہا سے روانہ ہوا۔ ایک چھکڑا جسے اس علاقے میں لڑھیا کہتے ہیں، سامان لے جانے کے لیے کرایہ پر لیا۔ یہ چھکڑا تو مجھ سے بھی زیادہ کمزور و ضعیف نکلا۔ آہستہ خرام بلکہ خرام کی حالت تھی۔ بارہ کوس کا سفر بھی طے نہ کر سکا۔ (دن بھر میں) مودہا سے چلا تارا تک نہ پہنچ سکا مجبوراً راستے میں ایک گاؤں میں رات گزارنی پڑی۔ منگل کی آخر شب روانہ ہوا اور دوپہر کو چلا تارا پہنچا۔ (اور یہ چھکڑا) جس کی حالت ہیچ خرامی کی تھی، رات کا ایک پہر گزرنے پر یہاں تک پہنچا۔ ملازموں نے ابھی چراغ روشن نہیں کیے تھے۔ میں نے رات کے اندھیرے میں خط لکھا"۔

O

"لیکن اگر اس طاعت مآب کے پہنچنے کی حالت بھی وہی ہے جو اس چھکڑے کی ہے تو پھر یہ خط باندہ اسی وقت پہنچے گا جب میں (بہ آسانی) کلکتے پہنچوں گا۔ اس سے کم وقت میں اس خط کا چلا تارا سے باندہ پہنچنا ممکن نہیں۔ واللہ علیٰ کل شئی قدیر"۔

"مختصر یہ کہ گردون دوں (گردوں چھکڑے اور آسمان دونوں کو کہتے ہیں) کے ظلم و ستم سے میں نے کشتی کرایہ پر لی۔ تمام سامان گھوڑے اور ساتھ چلنے والے لوگوں کو کشتی میں بھر کر بسم اللہ مجریہا و مرسہا پڑھ کر دریائے جمنا میں سفر کر رہا ہوں۔ میں بنارس میں جو وقت گزارنا چاہتا تھا اب ارادہ ہے کہ وہ الہ آباد میں گزاروں----"

O

"ساتویں دن میں اس ویرانے (الہ آباد) میں پہنچا۔ الہ آباد ایسے خرابے پہ خدا کی لعنت کہ جہاں بیمار کے لیے کوئی دوا نہ ملے کوئی اور چیز ملے۔ لوگ آداب محفل سے ناواقف ہیں۔ عورتوں اور مردوں میں محبت اور مروت نہیں۔ اس شہر کی آبادی و سیاہی کا سبب ہے یہ بد شہر ہے"۔

O

"دوسرے دن ایک بیل گاڑی کرایہ پر لی گئی۔ صبح کے وقت گنگا کے ساحل پر پہنچ گیا۔ ہوا کی طرح پانی پر سے گزر رہا ہے شوق کے ساتھ بنارس کی طرف سرگرم سفر ہو گیا----"

○

''اگر بنارس کو اس کی دل کشی اور دل نشینی کی وجہ سے میں سویدائے عالم کہوں تو بجا ہے مرحبا.... اس تماشا گاہ میں فقیر کی کا یہ عالم ہے کہ پردیس میں ہونے کا غم دل سے دور ہو گیا ہے۔ اس صنم کدے سے جب جب ناقوس کی نشاط آفریں آواز بلند ہوتی ہے تو عجب سرور و کیف کا عالم ہوتا ہے۔ بادۂ شوق سے میرا ذوق اس قدر مخمور ہو گیا ہے کہ دہلی کی یاد بھی دل سے جاتی رہی''۔

○

''ابھی تک پریشان ہوں کہ آگے کا سفر خشکی سے کروں یا دریا کے راستے۔ یوں سمجھو کہ آگ اور پانی میں گھرا ہوا ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں عظیم آباد تک خشکی کے راستے جاؤں اور وہاں سے کشتی کرایے پر لوں اور کبھی خیال آتا ہے کہ یہیں سے دریا کے راستے جاؤں''۔

○

''رحمت الٰہی کے حیرت انگیز آثار میں سے (یہ) ہے کہ کلکتے کی آب و ہوا مجھے راس آ گئی ہے۔ اس جگہ میں اپنے وطن کے مقابلے میں زیادہ آرام سے ہوں:

ہر پردۂ زندگی نوائے دارد
ہر گوشہ از دہر فضائے دارد
ہر چند پیوست از دو عالم کمر
بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد''

○

''گھوڑا فروخت کرنے کے بعد میرے پاس سو روپے باقی تھے۔ جاڑے آ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر کچھ بھی نہ خریدوں گا تب بھی ایک گدڑی ایک توشک ایک کمبل تو خریدنا ہی ہوگا۔ اس رقم سے یہ سامان خریدوں گا اور آپ نے مولوی ولایت حسن کی معرفت جو دو سو روپے ارسال فرمائے ہیں ان سے جمادی الاول سے رمضان کی پہلی تک کا خرچ نکل آئے گا''۔

دلّی سے کلکتے تک کی مسافت، وسائل محدود، سامان سفر ناکافی، کبھی یکے پر چلے جا رہے ہیں کبھی بیل گاڑی یا ڈولیا پر سوار، کہیں کشتی کا سفر ہے اور کبھی گھوڑے پر، مزید برآں یہ سب کچھ قرض ادھار کے سہارے۔ اس کے باوجود ناز و نخوت کا عالم یہ ہے کہ لکھنؤ میں معتمد الدولہ سید محمد خاں آغا میر کی دعوت پر ان سے ملاقات پر راضی ہوئے تو یہ شرط بھی رکھی کہ:

''جب وہ معتمد الدولہ کے دربار میں حاضر ہوں تو معتمد الدولہ کھڑے ہو کر ان کا استقبال کریں، ان سے معانقہ کریں اور غالب کو نذر پیش کرنے سے معاف رکھیں۔

معانقے کے سلسلے میں ملاقات کے لیے ان (معتمد الدولہ) کی طرف سے کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ ذہنی معاملے نے عملی صورت اختیار نہیں کی--- میرا دل زخمی تھا، نیز طویل سفر اور شور و تصدد درپیش تھے۔ میں نے اپنا پاس ناموس خاکساری کی وجہ سے آہستگی سے کام لیا تھا اور ان نوجوانوں کے اختلاط سے اپنا دامن بچا لیا۔

خدا گواہ ہے وہ قصیدہ جو میں نے آغا میر کی مدح میں لکھا ہے میرے خاندان کے لیے باعث رسوائی ہے''۔

(۲)

یہ ایک شدید مجبوری کا سفر تھا۔ سفر تجربہ کیسے بنتا ہے اور زندگی کے مختلف مرحلوں میں قدم قدم پر رونما ہونے والے تجربے احساسات پر وارد کس طرح ہوتے ہیں اس کی تفصیل غالب کی طرح کسی اور نے بیان نہیں کی۔ مگر غالب نے سفرنامہ کہاں لکھا ہے۔ ان کی مختلف تحریروں سے یہ عبارتیں، جو اوپر نقل کی گئیں، ہمیں اپنی پنشن کی بحالی کے لیے کلکتے کے سفر کی مہم سر کرنے والے غالب ہی سے روشناس کراتی ہیں۔ ان میں کان پور، لکھنؤ، باندہ، الہ آباد، بنارس، کلکتہ --- بہت سی بستیوں کا بیان ہے مگر غالب کے مقاصد ان بستیوں کے بیان تک محدود نہیں ہیں۔ اسی لیے ہر جگہ غالب کی اپنی ذات ہی مرکز نگاہ ٹھہرتی ہے اور اس طولانی قصے کے توسط سے ایک ایسی زندگی کا حال ہم پر کھلتا ہے جس کی شخصیت اور شاعری کی طرح، جس کے تخلیقی تجربوں اور حسّی و جذباتی واردات، جس کے افکار اور مشاہدات کی طرح اس کا یہ سفر بھی اپنی ایک الگ اور نرالی شان رکھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ غالب کے لیے یہ صرف کلکتے کا سفر نہ تھا، ان کے رموز باطن اور ان کی پیچیدہ ہستی کے اسرار کی گرہ کشائی کا ایک وسیلہ بھی تھا۔ اس عجیب و غریب قصے کا شروع خلیق انجم نے اس جملے کے ساتھ کیا ہے کہ ''غالب کی پوری زندگی ان کی خاندانی پنشن کے گرد گھومتی رہی تھی'' اور اس انتہائی دل چسپ کتاب کے حرف آغاز میں غالب کو درپیش کلکتے کے ادبی معرکے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

''اس معرکے نے غالب کے ذہن میں ایک نفسیاتی خلفشار پیدا کیا کہ انھوں نے اپنے اور امیر خسرو کے علاوہ ہندوستان کے تمام فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کو غیر مستند قرار دے دیا اور ان کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ بعض فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کی شان میں فحش کلمات بھی استعمال کرنے لگے۔ غالب نے اپنی فارسی دانی کے بارے میں ایسے دعوے کرنے شروع کیے جو ان سے پہلے غالباً کسی اور ہندوستانی فارسی داں نے نہیں کیے تھے۔ انھوں نے سفیر ہرات سے منسوب کر کے اپنے بارے میں لکھا کہ 'زبان کے معاملے میں ہندوستان میں غالب کا مقابلہ کون کر سکتا ہے قطع نظر شعر و شاعری کے، غالب تو فارسی کے عالم ہیں'۔ یہی چھوٹا سا فقرہ ساری زندگی غالب کے لیے ایک مسئلہ بنا رہا''۔

واقعہ یہ ہے کہ غالب کی شاعری اور زندگی، ان کی شخصیت اور طرزِ فکر کے سلسلے کثیر ہیں۔ ان میں ایک ساتھ بہت سی پرتیں اور سطحیں دکھائی دیتی ہیں۔ جس شہر میں غالب پیدا ہوئے (آگرہ) اور جس شہر میں انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ بسر کیا (دلّی)، ان سے قطع نظر، جن جن شہروں سے ان کا گزر ہوا مثلاً رام پور، لکھنؤ، الہ آباد، بنارس، کلکتہ ـــــ ان سب کا مشاہدہ غالب نے مختلف کرداروں کے طور پر کیا ہے۔ ہر انسانی بستی، غالب کے لیے ایک الگ چہرہ ایک علاحدہ پہچان رکھتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کلکتے کے سفر سے پہلے کی ان کی شاعری اور اس سفر کے تجربے سے گزرنے کے بعد کی شاعری کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو غالب کی ذہنی زندگی اور اس کی ارتقا کی بابت کچھ دلچسپ نتیجے برآمد ہوں گے۔ ہر ٹھوس اور طبیعی تجربہ، ہر جسمانی واردات غالب کے لیے ایک ذہنی اور حسی تجربہ اور واردات بھی بن جاتی ہے۔ غالب کے زمانے میں دلّی اور کلکتہ ہماری اجتماعی زندگی اور اسالیبِ فکر کے دو مختلف منطقوں کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ غالب کی شخصیت جتنی منظم اور پختہ تھی، اس کے پیشِ نظر یہ سمجھ لینا کہ کلکتے کے سفر نے انھیں زندگی کا ایک یکسر نیا شعور بخشا ہوگا یا ان کی اپنی سوچ کے انداز بدل دیے ہوں گے، درست نہیں۔ غالب کی حسیت میں ایک غیر معمولی طاقت تضادات کو ایک مرکز پر مجتمع کرنے کی تھی۔ چناں چہ اپنے فکری ماحول اور اپنے مجموعی لینڈ اسکیپ کے فرق کے باوجود غالب کے لیے دلّی اور کلکتہ دونوں ان کی بصیرت کے ایک ہی سلسلے سے مربوط ہیں۔ اس سفر کے دوران، سردار جعفری مرحوم کے وضع کردہ محاورے سے مدد لی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ غالب اپنے سومنات خیال سے بھی دوچار ہوئے اور انھوں نے وہ عظیم الشان، گہرا گنجان تخلیقی تجربہ بھی حاصل کیا جو شہر بنارس کا عطا کردہ ہے اور جسے غالب نے چراغِ دیر کی صورت ایک بے مثال نظم کی شکل دی۔ الہ آباد، لکھنؤ، بنارس میں وہ جن کیفیتوں سے دوچار ہوئے اور اٹھتے رہے جن تجربوں سے گزرے کلکتے کے قیام کے دوران شاعری کے لغات اور زبان و بیان کے مسئلوں کی وساطت سے غالب کو جس معرکے کا سامنا کرنا پڑا وہ ان کی روداد ہمیں افسردہ بھی کرتی ہے اور ہم پر آگہی اور انکشافِ حق کے نئے دروازے بھی کھولتی ہے۔ غالب زندگی کی کسی بھی منزل میں نہ تو خود خاموش بیٹھتے ہیں، نہ اپنے پڑھنے والے کو خاموش بیٹھنے دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ غالب کے واسطے سے ہماری رسائی ایک ایسے زندہ تابندہ برقی تار تک سے ہوتی ہے جس سے ہر دم چنگاریاں پھوٹ رہی ہوتی ہیں۔ غالب کے لیے زندگی کا ہر واقعہ، ہر واردات، ہر تجربہ ذہنی افزائش اور بصیرت میں اضافے کا وسیلہ ہے۔

یہ ساری صورت حال غالب کے سوانح میں اور ان کی نظم و نثر میں جابجا بکھری ہوئی ہے۔ ان کی زندگی کے ایک مرکزی واقعے کو مرتب کرنا، جو اپنے مولف کے لفظوں میں "غالب کی پوری زندگی کا محور کہا جا سکتا ہے" ایک اہم اور قابلِ قدر علمی کوشش ہے۔ خلیق انجم نے اس سلسلے میں ان تمام ماخذوں اور مصادر سے استفادہ کیا ہے جو ان کے سامنے تھے اور ان کے بعض جلیل القدر پیش روؤں اور ہم عصروں کی تحقیقات، تراجم، تشریحات کی مدد سے وجود میں آئے تھے۔ تقریباً ساڑھے چار سو صفحوں پر مشتمل اس تالیف میں خلیق انجم نے تین ضمیموں، دو نقشوں، ایک تفصیلی اشاریے، کتابیات، چند دستاویزات اور تعلیقات کے علاوہ دو مفصل ابواب قائم کیے ہیں۔ پہلے باب میں بارہ ذیلی عنوانات کے تحت انھوں نے غالب کے سفرِ کلکتہ کے آغاز، ادبی معرکوں، راستے میں پڑنے والی انسانی بستیوں، ذہنی اور روحانی سفر کی صعوبتوں، مالی پریشانیوں اور کلکتے میں قیام کے دوران رونما ہونے والے واقعات اور معرکوں کا احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے "چراغِ دیر" کا اردو ترجمہ (حنیف نقوی) اور مثنوی "بادِ مخالف" کا اردو ترجمہ (ظ۔ انصاری) بھی نقل کر دیا ہے۔ کتاب کے متن میں ان ترجموں کی شمولیت سے غالب کی بصیرت اور تخلیقی سرگرمی کی چند اہم فصلوں کو سمجھنے کی سہولت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب کا دوسرا باب غالب اور ہندوستانی فارسی گویوں اور فرہنگ نویسوں کے معاملات کو محیط ہے اور اپنی دستاویزی اہمیت کے باعث غالب کے سوانح اور شخصیت کی تفہیم و تعبیر کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو معلومات اس کتاب کے ذریعے ہمیں حاصل ہوتی ہیں ان کے تحقیقی اعتبار و استناد کی بابت مجھے کچھ بھی نہیں کہنا کہ یہ میدان محققینِ غالب کا ہے۔ لیکن غالب کے ایک پرشوق قاری اور ان کی شخصیت و سوانح کے ایک پُرتجسس طالب علم کے طور پر میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ خلیق انجم کی یہ کتاب ہمارے لیے مطالعے اور دلچسپی کا ایک قیمتی مواد فراہم کرتی ہے۔ خلیق انجم کے بیان کی ایک خوبی اس کا غیر مبہم اور واضح لہجہ (Explicit) ہے۔ وہ کسی قسم کی فکری عجلت کے بغیر بڑی دلچسپی اور سہولت کے ساتھ اپنے مواد کو ترتیب دیتے ہیں اور اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ان کی کتاب سے پہلے موضوع سے متعلق جو باتیں سامنے آ چکی ہیں وہ اپنی تلاش و تحقیق کے اضافے کے ساتھ انھیں اس طرح جمع کر دیں کہ ایک نئی تصویر تیار ہو جائے۔ اس لحاظ سے ان کی یہ کتاب غالب گیلری کا ایک نیا البم (مصوّر) کہی جا سکتی ہے۔ بہت رنگا رنگ، پُرکشش اور کارآمد۔

(۳)

خلیق انجم کی اس کتاب کو بھی میں نے ان کے "مطالعاتِ دلّی" کی ایک شق کے طور پر دیکھا۔ دلّی اور وابستگانِ دلّی ان کی علمی جستجو کا سب سے نمایاں میدان کہے جا سکتے ہیں۔ ان کی ایک پرانی کتاب "دلّی کے آثارِ قدیمہ" (۱۹۸۸ء) پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ دلّی ایک عرصے سے ان کی تلاش و تحقیق اور تصنیف و تدوین کا مرکز رہی ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں سے مرزا محمد رفیع سودا، مرزا اسد اللہ خاں غالب اور پھر استاد رسا اور میر آصف علی تک پرانی اور نئی دلّی کے بہت سے کردار، تماشے اور قصے ان کے مطالعے کی

گرفت میں آئے ہیں۔ انھوں نے سودا، سرسید اور غالب کی زندگی اور زمانے پر بالخصوص تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ ان کی پہلی کتاب (۱۹۵۷ء) سے تا حال ان کی آخری کتاب زیرِ نظر "غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ" (۲۰۰۲ء) تک، دلی اسٹڈیز کی ایک متنوع اور [illegible] ہے۔

اس وقت خلیق انجم نے اس امانت کو سنبھال رکھا ہے جو میر امن، فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، اشرف صبوحی، خواجہ محمد شفیع، شاہد احمد دہلوی اور محمود ریاض کے ثقافتی ورثے کی شکل میں ہمارے عہد تک پہنچی تھی۔ غالب ہند اسلامی تہذیبی روایت کے علاوہ دلی کی ثقافت کے بھی روشن ترین نقطے سے تعبیر کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے حوالے سے اپنے ماضی میں جانا، دراصل ایک عظیم و جلیل تہذیبی سلسلے میں سفر کرنا ہے۔ لہٰذا غالب کا کلکتے کا سفر بھی صرف ایک شخص کی مسافرت کے تجربے سے آشنا ہونا نہیں ہے۔ یہ سفر نت نئے سوالوں سے بھرے ہوئے وقت کی اس گھڑی میں ہوا جب دو زمانے گلے مل رہے تھے یا ایک دوسرے سے رخصت لے رہے تھے۔ ہماری اجتماعی زندگی، ہماری تخلیقی اور فنی روایت، ہماری ثقافت اور ہماری مجموعی فکر سب کے سب ایک دوراہے پر آن کھڑے ہوئے تھے۔ وصل اور فصل کی اس ساعتِ پریشاں کا جائزہ غالب کے واسطے سے لیا جائے تو اجتماعی زندگی کے قیام اور سفر، دونوں کے کچھ نئے حقائق ہیں۔ حق کی اس دریافت میں خلیق انجم کی یہ کتاب بھی بے شک ہماری معاون ہوئی ہے۔ غالب کے سفرِ کلکتہ کا تعاقب اس کتاب میں یوں سیر و تماشا سے زیادہ اپنی ادبی تاریخ کے ایک خاص مرحلے اور اپنے سب سے بڑے شاعر کی زندگی کے ایک اہم واقعے کی تفہیم کے مقصد سے کیا گیا ہے۔

بقیہ: وراثت

کی دنیا میں ڈوبا ہوا تھا لیکن اس وقت بری طرح چونکا جب اس نے کالے کوٹ پہنے ہوئے دو شائستہ قسم کے سنجیدہ فرد کو وارڈ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں کچھ فائلیں تھیں۔ وہ کچھ دیر تک اس کے باپ سے سرگوشیوں کے انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر فائلیں کھول کر دو چار جگہوں سے کچھ پڑھ کر اس کے باپ کو سنایا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا باپ اس کے کہنے پر اپنے کپکپاتے ہاتھ سے ان فائلوں میں کئی جگہوں پر اپنے دستخط ثبت کرتا جا رہا ہے۔ اسی دوران عبداللہ کو بھی وہیں بلا لیا گیا۔ دونوں نے اپنا تعارف کرایا جس سے معلوم ہوا کہ وہ شہر کے معروف قانون دان ہیں۔

"عبداللہ صاحب" ان میں سے ایک نے ٹھہرے ہوئے شائستہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "آپ کے والد نے وصیت نامہ پر دستخط کر دیے ہیں جس کی رو سے آپ ان کی تمام جائیداد و کاروبار کے وارث ہوں گے۔"

"اب آپ بھی دستخط کر دیں کہ تمام فائلوں کو قانونی حیثیت حاصل ہو جائے" دوسرے وکیل کا لہجہ بھی بڑا وقار و متانت سے لبریز تھا۔

دونوں وکیل جہاں جہاں فائلوں میں اشارہ کرتے گئے، عبداللہ بلا تاخیر دستخط کرتا گیا۔ جب کاغذات دستاویزی شکل اختیار کر گئے تو پہلے نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"اب آپ اپنے والد کی جائیداد اور کاروبار کے وارث ہیں"۔

اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "اور ان بینکوں کے جو واجب الادا قرضے ہیں وہ ان کی سود کے ساتھ ادائیگی بھی قانوناً آپ کی ذمہ داری ہے۔"

عبداللہ نے اچانک رخصت ہوتے ہوئے ہوش و حواس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ پوچھنے، کچھ کہنے سے پہلے وہ دونوں وارڈ سے باہر نکل چکے تھے۔ اسی دوران وارڈ بوائے بھی احسان اللہ کو اسٹریچر پر لٹا کر آپریشن تھیٹر لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ اس کا باپ اسٹریچر پر لیٹا اسے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ رہا ہے۔ سر پر سرجری کی ٹوپی و ٹیکے کے باوجود اس کے چہرے پر ایک پرسکون ٹھہراؤ کے آثار نظر آ رہے تھے!!

عنایت حسین بھٹی کی کالم نگاری

پاکستان کے معروف فنکار ضلع گجرات کی عظمت کا نشان جناب عنایت حسین بھٹی اپنی صلاحیتوں کے باعث نامور گلوکار، اداکار، فلم ساز، ڈائرکٹر اور اعلیٰ پائے کے دانشور تھے۔ زیرِ نظر کتاب عنایت حسین بھٹی کے دلچسپ اور پُر مغز کالموں کا مجموعہ ہے جسے پروفیسر زبیر کنجاہی اور احسان فیصل کنجاہی نے بڑی محبت، اشتیاق اور لگن سے ترتیب دیا ہے۔ اگر آپ اپنے دور کے نابغوں کو قلمی آئینے میں دیکھنا چاہتے ہیں تو اولین فرصت میں فخر اکیڈمی ڈھیری حسن آباد راولپنڈی کینٹ

کامرانیاں پبلشرز، کنجاہ تحصیل و ضلع گجرات

پر رابطہ قائم کیجیے جہاں یہ دلچسپ کتاب آپ کی توجہ کی طالب ہے۔

☆

مزارِ ذوق

شاہد ماہلی

(دہلی بھارت)

شاعری کی قوم نے اپنے عظیم شاعر کی یادگار کے ساتھ یہ سلوک کیا جو ہم ہندوستانیوں نے ذوق کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ذوق کا انتقال اس زمانے میں ہوا جب مغل حکومت کے خزانے خالی ہو چکے تھے۔ مغل بادشاہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار تھا اور بادشاہ قلعے کے روزمرہ کے اخراجات کے لیے ایک ایک پیسے کا محتاج تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذوق اور ان کے متعلقین کی قبریں انتہائی سادہ انداز میں بنائی گئیں۔ ان قبروں کے چاروں طرف اینٹوں اور چونے کی دیوار کا احاطہ بنا دیا گیا۔ غرض یہ کہ آخری مغل تاجدار کے استاد کی قبر معمولی سے مقبرے سے بھی محروم رہی۔ استاد ذوق کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ لیکن کسی بھی شاگرد کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ ان کی قبر پر معمولی سا مقبرہ ہی بنا دیتا۔

ممکن ہے کہ کسی اور نے بھی مزار ذوق کا ذکر کیا ہو لیکن میرے علم کے مطابق پہلی بار اس کا ذکر واقعات دار الحکومت دہلی (جلد ۲) میں ملتا ہے۔

۱۹۱۹ء میں بشیر الدین احمد کی "واقعات دار الحکومت دہلی" شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی دوسری جلد میں مزار ذوق کی کچھ تفصیل ملتی ہے۔ بشیر الدین احمد صاحب لکھتے ہیں۔

"قدم شریف کے پاس کلو کا تکیہ دہلی کا مشہور قبرستان ہے جس میں ایک جگہ املی اور پیپل اور نیم کے تین درخت برابر برابر واقع ہیں۔ جن کے متصل چاردیواری کے اندر طوطیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ دہلوی کے استاد آرام فرماتے ہیں اور سرہانے سنگ باسی کی لوح لگی ہے اور اس پر یہ قطعہ کندہ ہے

اللہ اکبر

طوطیٔ ہند حضرت استاد ذوق نے کی
گلشن جہاں سے جو باغ جناں کی راہ

سال وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفر
کہہ ذوق جنتی زمر (کذا) بخشش الٰہ

۱۲۷۱ھ

افسوس ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں و ہم عصر (کذا) پر کہ ایسے بڑے شاعر اور فخر ہندوستان کا مزار یوں کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہے اور چاردیواری جا بجا سے گر پڑی ہے۔ اگر جلد توجہ نہیں کی گئی اور یہی غفلت رہی تو تھوڑے ہی دنوں میں ان کے مزار کا پتا چلنا بھی دشوار ہو جائے گا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک"[1]

۱۹۲۳ء کے آس پاس حکیم اجمل خاں اور دہلی کے کچھ لوگوں نے مزار ذوق کے احاطے اور احاطے کی تمام قبروں کی مرمت کرائی تھی۔ چوں کہ احاطے کی دیوار چونے اور اینٹوں سے بنائی گئی تھی۔ اس لیے بہت جلد اس کی حالت خراب ہو گئی۔

۱۹۳۳ء میں شاد عارفی مرحوم دہلی آئے تھے۔ یہاں انھوں نے غالب اور ذوق کے مزارات تلاش کر کے ان کی زیارت کی۔ ان دونوں شاعروں کے مزاروں کی خستہ حالی پر شاد عارفی نے ایک مختصر سا مقالہ لکھا جو لاہور کے "ہمایوں" (اکتوبر ۱۹۳۵ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالے پر حامد علی خاں نے حسب ذیل ادارتی نوٹ لکھا تھا۔

مقابر بے سراغ سے دور اور شکستہ پڑے

حضرت شاد عارفی نے ذیل کے مقالہ میں ایک اہم مسئلہ کی طرف قوم کی توجہ دلائی ہے۔ ذوق مرحوم کے مزار کی مرمت اگر وقت پر نہ ہوئی تو عجب نہیں کچھ عرصے بعد اس کا سراغ بھی نہ مل سکے۔ غالب کے مزار کی مرمت کے لیے ایک باقاعدہ انجمن بن چکی ہے۔ لازم ہے کہ یہی انجمن ذوق کے مزار کی تعمیر کا کام بھی اپنے ذمے لے لے۔ اگر یہ انجمن یا کوئی نئی انجمن گزشتہ ادبا و اکابر ملک کے مزارات کی تلاش اور ان کی حفاظت و تعمیر کا کام شروع کر دے تو ہمیں توقع ہے کہ اہل ملک اپنی گزشتہ تہذیب و ثقافت کی ان مٹتی ہوئی نشانیوں کے تحفظ کے لیے ہر امکانی مدد دے کر ایک زندہ قوم ہونے کا ثبوت دیں گے۔۔۔ شاد عارفی صاحب نے مزار ذوق کی تلاش کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

"میں جناب چلتے چلتے' گھومتے گھومتے' تلاش کرتے کرتے ظہر کے وقت مخلوق رسول کی مسجد میں نماز اور آرام کی خاطر ٹھہرا۔ وضو کرنے کے بعد کھانا نہ ملنے پر افسوس کر رہا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بزرگ آئے ہیں مسجد میں خضر کی صورت (بقول حضرت حالی مرحوم میں اپنی جیبوں سے ہوشیار ہو کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ اور وہی ذوق و غالب کا سوال پیش کر دیا۔ انھوں نے مجھے دشمن آثار قدیمہ سمجھ کر گڑے مردے اکھاڑنے والوں میں سمجھ کر جواب دیا (تجھ کو پرائی

کیا پڑی اپنی نظر تو مگر جب میں نے ان کو اطمینان دلا دیا کہ میں ایسا خطرناک آدمی نہیں ہوں بلکہ شاعر ہونے کے لحاظ سے ایصال ثواب کے لیے ان نامور شعراء کی قبریں تلاش کر رہا ہوں تو انھوں نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا۔ اچھا نماز کے بعد میں تمھیں اپنے ہمراہ وہاں لے چلوں گا۔ نماز سے کن کل ہو جو فراغت حاصل کر کے انھوں نے قدم شریف کی طرف قدم بڑھائے۔ میں بھی ان کے قدم بہ قدم چلتا رہا کوئی ۱۰۰ قدم چل کر وہ ایک جگہ ٹھہرے اور کہنے لگے۔ دیکھو اس ٹوٹی ہوئی قبر میں جس کا تعویذ اور لوح تک غائب ہیں،

ذوقؔ مرحوم آرام کر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بادشاہ کے ایماء سے یہاں ان کو دفن کیا گیا تھا، کیونکہ بادشاہ سلامت ہر سال قدم شریف آیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا لوح کیا ہوئی۔ انھوں نے افسردہ خاطری سے جواب دیا۔ آٹھ نو برس پیچھے کچھ ایسا زمانہ گزرا کہ یہ مزار اچھی حالت میں تھا۔ لوح جو ایک ڈال سنگ مرمر سے تراش کر بنائی گئی تھی۔ اس کو ایک متعصب[1] گروہ نے (انھوں نے ایک فرقہ کا نام لیا تھا مگر میں عرض نہ کروں گا) اچھا کر تباہ کر دیا۔ لوح کا اکھڑنا تھا کہ اشد زمانہ نے مزار کی حالت بد سے بدتر بنا دی۔ مزار کی بے کسی اور بربادی پر دل بھر آیا۔ آنسو جاری ہو گئے[2]۔

شاد عارفی صاحب نے مزار ذوقؔ کی مرمت کے سلسلہ میں درج ذیل تجویز پیش کی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں ذوقؔ مرحوم کے سلسلے سے تعلق رکھنے والے ہزاروں شاعر ہوں گے اور صاحب ثروت بھی۔ اگر کوئی ایک صاحب اس کام کے لیے تیار ہو جائیں تو کیا کہنا ورنہ پھر یہ صورت بہتر ہوگی ہر شخص ایک روپیہ یا حسب توفیق چندہ دینا منظور کرے تاکہ مزار از سر نو تعمیر ہو سکے۔ جو کار نیک ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ایک یادگار کی حفاظت بھی ہوگی۔ چندہ کہاں بھیجا جائے اور کس کے پاس جمع ہو۔ اس کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے معززین میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیا جائے اور عام اطلاع دی جائے کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں ذرہ بھی درد ہے حسب حیثیت ادا کر کے فرد منتخب سے رسید حاصل کرے اور چندہ جمع ہو جانے پر مزار کی بہ وجہ احسن مرمت کرا دی جائے۔

امید ہے کہ میری یہ التجا شرف قبولیت حاصل کرے گی۔

آخر میں مدیران جرائد سے عرض ہے کہ وہ اپنے اپنے اخباروں یا رسالوں میں اس مضمون کو جگہ دیں تاکہ یہ گزارش اعلان عام کی صورت اختیار کر لے۔"

۱۸ دسمبر کو مولانا اخلاق حسین تاباں کا ایک خط قومی آواز دہلی میں شائع ہوا تھا، جس میں مزار ذوقؔ کی موجودہ حالت پر اظہار افسوس کیا گیا تھا۔ کچھ دن بعد محترم حکیم عبدالحمید نے مولانا تاباں کو ایک خط لکھا۔ جس کی بنیاد پر مولانا صاحب نے قومی آواز میں ایک معلوماتی مراسلہ شائع فرمایا۔ حکیم عبدالحمید نے اطلاع دی تھی کہ حکیم صاحب کے بھائی حکیم عبدالوحید کا انتقال (۱۹۳۳ء) میں ہوا۔ اور انھیں قبرستان خواجہ باقی باللہ میں دفن کیا گیا۔ اس کے بعد اس قبرستان میں "ہمدرد احاطہ" کے نام سے ایک احاطہ قائم کیا گیا۔ اس موقع پر حکیم عبدالحمید صاحب کو معلوم ہوا کہ ذوقؔ کے مزار کی حالت بہت خستہ ہے۔ حکیم صاحب نے استاد ذوقؔ کے خاندان کی دس قبروں کی مرمت کرائی۔ ذوقؔ کی قبر پر کتبہ نہیں تھا۔ اس پر کتبہ لگوایا گیا اور قبر کی مرمت اس طرح کرائی گئی کہ وہ باقی دوسری قبروں کے مقابلہ میں نمایاں ہو گئی۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے احاطے کی دیوار کی بھی مرمت کروائی اور احاطے کے دائیں طرف بھی کتبہ لگوایا۔ اس طرح یہ احاطہ اور قبریں محفوظ ہو گئیں۔ (دستاویز نمبر ا)

شاد عارفی کا بیان پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم عبدالحمید صاحب نے ۱۹۳۵ء میں مزار ذوقؔ کی مرمت کرائی تھی۔ کیوں کہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شاد عارفی کا جو مضمون ہمایوں (لاہور) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مزار کی خستہ حالی کا ذکر کیا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ حکیم صاحب نے مزار کی مرمت کروائی ہو مگر مضمون شائع کرانے کے وقت شاد عارفی کو اس کا علم نہ ہو۔ ان دونوں بزرگوں میں سے کسی سے بھی غلط بیانی کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔

دہلی کے وقف بورڈ میں مزار ذوقؔ کی کچھ پرانی تصویریں محفوظ ہیں۔ ایک تصویر سے پتا چلتا ہے کہ مزار ذوقؔ ایک اونچے چبوترے پر بنا ہوا تھا۔ سرہانے کتبہ لگا ہوا تھا۔

۱۹۵۰ میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم وقف بورڈ دہلی کے ناظر تھے انھوں نے وقف بورڈ کے ایک انسپکٹر کے ساتھ قبرستان کا معائنہ کیا۔ اور انسپکٹر نے ۱۶ دسمبر ۱۹۵۰ء کو رپورٹ پیش کی کہ مزار ذوقؔ اور احاطے کی دیوار کو بہت نقصان پہنچایا گیا ہے۔ قبرستان میں پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھیوں نے رہائش کے لیے چھوٹے چھوٹے گھر بنا لیے تھے۔ انہوں نے انسپکٹر کی رپورٹ کے مطابق مزار ذوقؔ کے احاطے کو بیت الخلا بنا لیا تھا۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ وقف بورڈ کے ناظر مولانا حفظ الرحمٰن نے مزار ذوقؔ کا معائنہ کر کے فرمایا کہ "احاطے کی مرمت کرا دی جائے اور دروازہ بند ہو جایا جائے اور مقفل کرا دی جائے۔" انسپکٹر نے مولانا حفظ الرحمٰن کے اس حکم کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس احاطے پر روز روزہ محفوظ رہنا بہت مشکل ہے میرے خیال میں حفاظت کے لیے تیغہ لگوا کر احاطہ بند کرا دینا زیادہ مناسب ہوگا۔" انسپکٹر کی اس رپورٹ پر وقف کے کسی افسر کا نوٹ ہے "معاملہ پر پوری گنتی میں تخمینے کے ساتھ پیش کیا جائے۔" پھر کسی کا نوٹ ہے کہ "سب اوورسیئر صاحب سے تخمینہ تیار کرائیں جس پر انجینئر صاحب کی منظوری ہو۔ ان کے

بعد ایجنڈے کا مسودہ تیار کریں"

۲۶/فروری ۱۹۵۱ء کو وقف بورڈ کے اورسیئر عبدالحمید صاحب نے مزارِ ذوق کی مرمت کا تخمینہ تیار کیا۔ جس کے مطابق سترہ روپے خرچ ہونے تھے۔ (دستاویز نمبر ۳)

"مزار حضرت ذوق کی مرمت و تیپے کا کام کروا دیا گیا ہے۔ مبلغ ۱۲ روپے خرچ ہوئے تھے"۔ (دستاویز نمبر ۴)

وقف بورڈ کے ریکارڈ کے مطابق ۱۰ جولائی ۱۹۵۲ء کو وقف بورڈ کے عبدالحمید صاحب نے رپورٹ کی ہے کہ "گزارش ہے کہ قبرستان نبی کریم احاطہ استاد ذوق مرحوم کا کتبہ شرنارتھیوں نے اٹھا لیا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے" اس رپورٹ پر وقف کے چار ملازمین کے دستخط ہیں۔ ایک نوٹ ہے "مولانا خلیل صاحب برائے فائل"۔ ایک اور نوٹ ہے "پولیس کو لکھ دیا جائے"۔ اس رپورٹ پر قائم مقام ناظر اوقاف محمد جعفری صاحب کے بھی دستخط ہیں۔ (دستاویز نمبر ۵)

۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو جناب محمد جعفری قائم مقام ناظر اوقاف نے پہاڑ گنج تھانے کے انسپکٹر انچارج کو انگریزی میں تحریری شکایت کی کہ وقف بورڈ کا سائز کرنے والے ملازمین نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ پہاڑ گنج کے نبی کریم قبرستان میں واقع محمد ابراہیم ذوق کے مزار کا کتبہ غائب کر دیا گیا ہے اور مزار کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ آئی۔پی۔سی کے تحت یہ جرم ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں تحقیق کر کے اصل مجرم کا پتا چلائیں۔ (دستاویز نمبر ۶)

محمد جعفری صاحب کی اس رپورٹ پر پہاڑ گنج پولیس اسٹیشن کے انسپکٹر نے مزار ذوق کا سائز کر کے انگریزی میں رپورٹ لکھی۔ جس میں کہا گیا ہے کہ "میں قبرستان کے چوکیدار کے ساتھ جائے وقوع پر گیا۔ ذوق کا مزار بالکل درست حالت میں ہے۔ حال ہی میں قبر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ البتہ مزار پر کتبہ نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں کتبہ گرا دیا گیا ہے" پولیس انسپکٹر کی اس رپورٹ پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ (دستاویز نمبر ۷)
ظاہر ہے یہ رپورٹ وقف بورڈ کے قائم مقام ناظر محمد جعفری صاحب کی اس رپورٹ کے جواب میں ہی لکھی گئی تھی۔ جو انھوں نے ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو دہلی کے پہاڑ گنج تھانے میں درج کرائی تھی۔

وقف بورڈ کے فائلوں میں کسی ملازم کی ایک رپورٹ محفوظ ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "قبرستان احاطہ استاد ذوق قبرستان نبی کریم کے قریب دو سو گز اراضی سردار علی کو کسی ایک شرنارتھی کے ہاتھ چھ روپے گز کے حساب سے فروخت کر کے پاکستان چلا گیا۔ رپورٹ برائے اطلاع پیش ہے" رپورٹ کے نیچے وقف کے کسی افسر کی ہدایت درج ہے "جس نے بیعانہ کرایا ہے اس کا پتا معلوم کیا جا سکتا کہ تنسیخ بیعانگی کی کارروائی ہو سکے"۔ (دستاویز نمبر ۸) یہ ہدایت ۸ نومبر ۱۹۵۵ء کو لکھی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ہدایت پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر خلیق انجم کو دہلی کی تہذیب، تمدن، زبان، آثارِ قدیمہ غرض ہر چیز سے والہانہ عشق ہے۔ دہلی سے ان کی محبت کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے سرسید کی آثار قدیمہ تین جلدوں میں مرتب کی، دلی کے آثار قدیمہ اور "دلی کی درگاہ شاہ مرداں" جیسی اہم کتابیں لکھی ہیں اور آج دہلی کے آثار قدیمہ کے ماہرین میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا کہنا ہے کہ ایک دن وہ مہندیوں کے قبرستان کے پاس سے گزر رہے تھے کہ قبرستان کے احاطے سے باہر مغربی دیوار کے نیچے ایک قبر پر ان کی نظر پڑی۔ قبر پر جو شکستہ سا کتبہ لگا ہوا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ وہ قبر مومن خان مومن کی ہے۔ قبر کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی مرمت کروا کے لوحِ قبر نصب کروا دیں گے۔ ابھی وہ قبر کی مرمت کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ بعض دوستوں کے مشورے سے انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ دلی میں مدفون تمام شاعروں اور ادیبوں کی قبریں تلاش کریں گے اور جو مرمت طلب ہیں ان کی مرمت کرائیں گے۔ اس کام کے لیے ابوالکلام اکیڈمی آف لیٹرز کے نام سے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ دہلی کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج) کے پرنسپل مرزا محمود بیگ مرحوم اس کے صدر اور ڈاکٹر خلیق انجم سکریٹری منتخب ہوئے۔ اکیڈمی کے اراکین میں کروڑی مل کالج (دلی یونیورسٹی) کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور جناب انور کمال حسینی کے علاوہ اور کئی لوگ شامل تھے۔ تمام اراکین نے سو سو روپے جمع کیے اور اتنی رقم ہو گئی کہ مومن، محمد حسین آزاد اور کئی شاعروں کے مزاروں کی مرمت کر کے ان پر کتبے لگا دیے گئے۔

آگے چل کر جب کمیٹی کا کام بڑھنے لگا تو قبرستانوں کے چودھریوں کو اندیشہ ہوا کہ شاید یہ کمیٹی ان قبرستانوں کی زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے اس لیے کمیٹی کی شدت سے مخالفت شروع ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اکیڈمی کو اپنا کام بند کرنا پڑا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا کہنا ہے کہ یہ بات ۱۹۶۳ء کی ہے۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب نے مزار ذوق بھی تلاش کیا۔ یہ مزار نبی کریم قبرستان میں واقع تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر اسلم پرویز مزار پر گئے۔ انجم صاحب کا بیان ہے کہ مزار ایک احاطے میں تھا، جس میں آٹھ دس قبریں اور تھیں بالکل درمیان میں دوسری قبروں کے مقابلہ میں ایک اونچی سی قبر تھی۔ کسی قبر پر کوئی کتبہ نہیں تھا لیکن درمیان میں جو قبر دوسری قبروں کے مقابلے میں کچھ اونچی تھی اس کے سرہانے کی دیوار پر کسی نے سیاہی سے موٹا موٹا "استاد ذوق" لکھ دیا تھا۔

تمام قبروں اور احاطے کی دیوار کی حالت بہت خراب تھی احاطہ خاصا

ہوا تھا۔ اوقاف کے ریکارڈ سے معلوم ہوا کہ مزار ذوق احاطہ ۴۰۰ مربع فٹ تھا۔ چوں کہ قبرستان میں پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں نے رہائش کے لیے چھوٹے چھوٹے کمرے بنا لیے تھے۔ اس لیے کچھ لوگ اور خاص طور سے عورتیں اس احاطے کو بیت الخلا کے طور پر استعمال کرنے لگی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دہلی کے مشہور سیاسی رہنماؤں خصوصاً میر مشتاق احمد صاحب، امداد صابری اور دوسرے بزرگوں کو مزار ذوق کی حالت سے مطلع کیا۔ سب ہی حضرات نے لفٹنٹ گورنر اور دہلی کے میونسپل کمشنر سے ملاقات کر کے شکایت کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ بقول ڈاکٹر انجم کچھ عرصے بعد جب وہ مزار ذوق پر گئے تو مزار اور اس کے پاس کی تمام قبریں پیوند زمین ہو چکی تھیں۔

انجم صاحب کا کہنا ہے کہ وہ گھنٹوں قبرستان میں گھوم کر مزار ذوق کی تلاش کرتے رہے۔ ایک جگہ انھیں برابر برابر تین پیڑ نظر آئے۔ ایک جنگل کا، دوسرا املی کا، اور تیسرا نیم کا۔ انھیں یاد آ گیا کہ بشیر الدین احمد نے واقعات دارالحکومت میں لکھا ہے کہ مزار ذوق کے پاس برابر برابر جنگل، املی اور نیم کے تین درخت ہیں۔ ڈاکٹر انجم پورے قبرستان میں گھومے کہ کہیں اور تو اس طرح کے تین درخت ایک ساتھ نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ صرف یہی تین درخت ایک ساتھ ہیں۔ انجم صاحب نے یہ بھی دیکھا کہ ان درختوں کے مغرب میں پیلے رنگ کا ایک چھوٹا سا مکان تھا جو کچھ عرصے پہلے ہی بنا تھا، وہ اب بھی موجود تھا، ڈاکٹر انجم نے مزار ذوق کے اصل مقام کے تعین کے لیے ناصر خسرو صاحب، امداد صابری صاحب اور دوسرے لوگوں سے بھی مدد لی۔ عوامی بیت الخلا کے پاس ایک کتبہ زمین میں دبا ہوا تھا۔ اس کا کچھ حصہ زمین سے باہر تھا۔ ڈاکٹر انجم نے ہاتھ سے مٹی ہٹائی تو تھوڑا سا کتبہ باہر آ گیا۔ یہ وہی کتبہ تھا جو مزار ذوق پر لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر انجم یہ کتبہ زمین سے باہر نکال رہے تھے کہ کچھ لوگوں نے دیکھ لیا۔ غالباً وہ ڈاکٹر صاحب کا مقصد سمجھ گئے، اس لیے انھوں نے اعتراض کیا، جب ڈاکٹر صاحب نہیں مانے تو یہ لوگ لڑنے جھگڑنے پر اتر آئے۔ کچھ دن بعد ڈاکٹر صاحب ایک دوست کے ساتھ رات کے بارہ بجے اس مقام پر چھوٹی سی کدالی لے کر پہنچے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ لوگ گھروں سے باہر سو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ابھی کھودنا شروع کیا تھا کہ کسی نے دیکھ لیا اور اس طرح غل مچا کر لوگ اکٹھا ہو گئے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اور ان کے دوست وہاں سے بھاگ نہ جاتے تو ممکن تھا کہ لوگ مار پیٹ پر اتر آتے۔

غرض مختلف نشانیوں کی مدد سے ڈاکٹر انجم نے مزار ذوق کی جگہ کا تعین کر لیا۔ ان قبروں اور احاطے کو مسمار کر کے دہلی میونسپل کارپوریشن نے عوامی بیت الخلا بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر انجم کو کارپوریشن کی حرکت پر سخت تکلیف ہوئی۔ انھوں نے دہلی کے بیشتر بزرگ رہنماؤں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ مولانا امداد صابری، ڈاکٹر انجم کو لے کر حکومت کے مختلف ذمہ داران کے پاس گئے۔ میونسپل کارپوریشن کے ایک اعلیٰ افسر نے قطعیت کے ساتھ کہا کہ یہ جگہ وہ نہیں ہے جہاں ذوق کا مزار تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے جنگل، نیم اور املی کے درختوں کی نشانی بتائی اور ثبوت کے طور پر واقعات دارالحکومت دہلی کی دوسری جلد کی وہ عبارت پیش کی، جس میں مزار ذوق کے پاس برابر برابر ان تینوں درختوں کا ہونا بتایا گیا ہے۔ چوں کہ کارپوریشن کے افسروں کا رویہ متعصبانہ تھا۔ اس لیے کارپوریشن نے کچھ ہی دن میں ان تینوں درختوں کو جڑ سے اس طرح کٹوا دیا کہ کسی بھی درخت کا نشان باقی نہیں رہا۔ ڈاکٹر انجم کا کہنا ہے کہ جب بھی دہلی انتظامیہ یا مرکزی حکومت کے کسی وزیر یا اعلیٰ افسر سے شکایت کی جاتی، وہ کارپوریشن سے رجوع کرتا اور کارپوریشن کا رویہ مزار ذوق کے سلسلے میں انتہائی متعصبانہ تھا۔ لہذا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

مزار ذوق کی زمین خالی کرانے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ دہلی کی میونسپل کارپوریشن تھی۔ کچھ تو بیورو کریسی کے حاکمانہ رویے اور کچھ اردو کے خلاف تعصب کی وجہ سے کارپوریشن کے افسر یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ انھوں نے ذوق کا مزار منہدم کر کے وہاں عوامی بیت الخلا بنایا ہے۔ کئی دفعہ ڈاکٹر خلیق انجم کی میونسپل کارپوریشن کے افسران سے بحث ہوئی۔ تنگ آ کر افسران انتہائی بدتمیزی پر اتر آئے۔ ان کی تلخ اور بے ہودہ باتوں سے بھی انجم صاحب ہمت نہیں ہارے۔ انھوں نے ۲۱ فروری ۱۹۸۱ء کو منعقد ہونے والی انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں مزار ذوق کا معاملہ پیش کیا۔ اراکین نے طے کیا کہ خلیق انجم صاحب، کرنل بشیر حسین زیدی کے ساتھ وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کر کے ان سے اس معاملے میں تعاون کی درخواست کریں۔ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے محترمہ اندرا گاندھی کے نام خط لکھ کر ۱۹ مارچ ۱۹۸۱ء کو اندرا جی سے ملاقات کی۔ زیدی صاحب نے اندرا جی کے نام جو خط لکھا تھا وہ اندرا جی کی خدمت میں پیش کیا۔ کرنل بشیر الدین زیدی صاحب کے کہنے پر ڈاکٹر خلیق انجم نے اندرا جی کو بتایا کہ نبی کریم قبرستان میں انیسویں صدی کے عظیم شاعر ذوق دہلوی کا مزار تھا۔ ذوق نہ صرف آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے درباری شاعر تھے بلکہ بہادر شاہ ظفر اور بہت سے شعرا ذوق کے شاگرد تھے۔ ان حقائق کی روشنی میں مزار ذوق قومی اہمیت کا حامل تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ذوق کا مزار منہدم کر دیا گیا اور دہلی میونسپل کارپوریشن نے اس مقام پر عوامی بیت الخلا بنا دیا ہے۔ پچھلے بیس سال سے دہلی کی مختلف اردو تنظیمیں میونسپل کارپوریشن سے مطالبہ کرتی آ رہی ہیں کہ اس بیت الخلا کو ڈھا دیا جائے تاکہ وہاں ذوق کا مقبرہ تعمیر کیا جا سکے۔ مقبرے کے چاروں طرف جو بہت بڑی زمین تھی اس پر ناجائز قبضے ہو گئے ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ مزار کے چاروں طرف ایک ہزار میٹر زمین خالی کرا کے دے دی جائے تاکہ ہم

یادگار ذوق تعمیر کر سکیں۔ مذکورہ زمین پر ناجائز قبضے کرنل زیدی نے اندرا جی کے نام جو خط لکھا تھا سو دیا نہ درخواست کی تھی کہ وہ دہلی میونسپل کارپوریشن اور دہلی انتظامیہ کو ہدایت دیں کہ وہ اس بیت الخلاء کو کسی اور جگہ منتقل کر کے یہ زمین ہمارے حوالے کر دیں تاکہ ذوق کے شایانِ شان یادگار قائم کی جا سکے (دستاویز ۹)۔ اندرا جی کو میونسپل کارپوریشن پر غصہ آ گیا۔ انھوں نے کارپوریشن کے افسران کو برا بھلا کہا اور اپنے پرائیویٹ سکریٹری آر۔ کے۔ دھون کو بلا کر کہا کہ وہ دہلی کے لیفٹننٹ گورنر کو خط لکھیں کہ وہ مزار ذوق پر سے بیت الخلاء کی عمارت فوراً گرا کر بیت الخلاء کسی اور مقام پر بنائیں اور یہ جگہ ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے حوالے کر دیں۔

محترمہ اندرا گاندھی کے نام کرنل زیدی کے خط پر ۵ مارچ ۱۹۸۱ء کی تاریخ درج ہے۔ اندرا جی سے ملاقات کے فوراً بعد آر۔ کے۔ دھون صاحب نے ڈاکٹر خلیق انجم کو اس خط کی نقل دے دی۔ جو لفٹننٹ گورنر جگ موہن صاحب کو بھیجا گیا تھا۔

محترمہ اندرا گاندھی کے نام کرنل بشیر حسین زیدی کے خط کی نقلیں لفٹننٹ گورنر دہلی میونسپل کمشنر دہلی اور چیف سکریٹری دہلی ایڈمنسٹریشن کو بھیجی گئی تھیں۔

ڈاکٹر انجم کا کہنا ہے کہ آر۔ کے۔ دھون صاحب نے اسی وقت ہی دہلی کے لفٹنٹ گورنر جگ موہن صاحب کو خط لکھا۔ یہ خط چپڑاسی کے ہاتھ فوراً ہی گورنر ہاؤس بھیج دیا گیا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ میں کرنل بشیر حسین زیدی صدر ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا ایک خط منسلک کر رہا ہوں۔ اس خط میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو شاعر ذوق دہلوی کا مزار منہدم کر کے میونسپل کارپوریشن نے وہاں عوامی بیت الخلاء بنا دیا ہے۔ زیدی صاحب نے درخواست کی ہے کہ بیت الخلاء گرا کر کسی اور جگہ منتقل کر دیے جائیں اور یہ جگہ ان کے حوالے کر دی جائے تاکہ انسٹی ٹیوٹ وہاں ذوق کی قبر اور مقبرہ تعمیر کرا سکے۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ اس معاملے میں کارروائی کریں۔ اور وزیر اعظم کی اطلاع کے لیے ہمیں بتائیں کہ آپ نے کیا قدم اٹھایا ہے۔ (دستاویز نمبر ۱۰)

ڈاکٹر انجم کا کہنا ہے کہ آر۔ کے دھون صاحب نے ٹیلی فون پر بھی دہلی کے لفٹنٹ گورنر جگ موہن صاحب سے بات کی تھی۔ اور جب ڈاکٹر صاحب گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ جگ موہن صاحب کے دفتر سے دو دفعہ ٹیلی فون آ چکا ہے۔ گورنر صاحب نے دوسرے دن دس بجے اپنے دفتر بلایا تھا۔ انجم صاحب وقت مقررہ پر گورنر کے دفتر پہنچ گئے۔ جگ موہن صاحب نے مزار ذوق کے سلسلے میں تمام معلومات حاصل کیں اور اس مقام پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ مزار ذوق کے چاروں طرف بہت مکانات بن گئے تھے اور اب وہاں پہنچنا مشکل تھا لیکن یہ تو گورنر کا معاملہ تھا۔ خلیق صاحب نے اس مقام کا ایک نقشہ بنایا ہوا تھا، انھوں نے وہ نقشہ گورنر کے سکریٹری کو دے دیا۔ دوپہر کے دو بجے جب گورنر صاحب خلیق صاحب کے ساتھ اس مقام پر پہنچے تو پولیس اور سکیورٹی نے راستہ صاف کر رکھا تھا۔ گورنر کو وہاں تک پہنچنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ گورنر نے میونسپل کارپوریشن کے افسروں کو بھی بلا رکھا تھا۔ انھوں نے وہیں کارپوریشن کو حکم دیا کہ تین دن کے اندر اندر بیت الخلاء کی عمارت ڈھا دی جائے۔ خلیق صاحب کا کہنا ہے کہ وہ بہت خوش گھر واپس آئے۔ لیکن ابھی مصیبت کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس علاقے کے کچھ لوگ بیت الخلاء ڈھانے کے خلاف عدالت سے اسٹے آرڈر لائے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر ڈاکٹر انجم اس علاقے میں پہنچے وہاں لوگوں سے بات کی اور مقامی لوگوں کے دلوں میں ذوق کی عزت اور مقام بڑھانے کے لیے بتایا کہ وہ بہت بڑے بزرگ تھے اور ان کے کچھ تجربے بیان کیے۔ جب لوگوں کے دلوں میں ذوق کے لیے احترام پیدا ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب نے ایک خالی پلاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر بیت الخلاء گرا کر اس پلاٹ پر بنا دیا جائے تو کیا آپ کو اعتراض ہوگا۔ سب لوگ خوشی راضی ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے دوسری تجویز پیش کی کہ بیت الخلاء کے پاس جو لوگ رہتے ہیں ان میں دو چار لوگ راضی ہو جائیں انھیں دہلی کے کسی اور کالونی میں مکان دے دیے جائیں اور جو جگہ خالی ہو اس پر بیت الخلاء بنا دیا جائے۔ وہاں رہنے والوں نے یہ تجویز بھی پسند کی۔ ڈاکٹر انجم نے جگ موہن صاحب کو یہ دونوں تجویزیں بتائیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کارپوریشن کے افسروں کو بلا کر میٹنگ کی جس میں طے کیا گیا کہ بیت الخلاء گرا کر کسی دوسرے مقام پر بنایا جائے گا۔ جگ موہن صاحب نے ڈاکٹر انجم سے پوچھا کہ بیت الخلاء منہدم کر کے یہ زمین کس کو دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا انجمن ترقی اردو (ہند) کو۔ جگ موہن صاحب نے کہا کہ آپ ذوق کے نام سے ایک سوسائٹی رجسٹر کیوں نہیں کرا لیتے۔ انجم صاحب نے کہا کہ اس میں تو مہینوں لگیں گے۔ جگ موہن صاحب نے کہا کہ میں دو تین دن میں رجسٹر کرا دیتا ہوں۔ پھر میں یادگار بنانے کے لیے فنڈ کا انتظام کر دوں گا۔ جگ موہن صاحب نے دفتر کے ایک صاحب کو بلا کر ہدایت دی کہ ذوق سوسائٹی فوراً رجسٹر کرا دیجیے۔ جگ موہن صاحب نے اس سوسائٹی کا نام "ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ تجویز کیا" ۲۷ مئی ۱۹۸۱ کو یہ سوسائٹی رجسٹرار سوسائٹیز کے پاس رجسٹر ہو گئی۔ اس کا رجسٹریشن نمبر Nos/11769 ہے (دستاویز نمبر ۱۱)

سوسائٹی کے بنیادی اراکین میں درج ذیل نام شامل تھے۔ کرنل بشیر حسین زیدی، ڈاکٹر خلیق انجم، سی۔ ایس۔ چڈھا صاحب، شمیم بیگم صاحبہ، کوشل کمار شرما صاحب، یوگندر بکل، تشنہ صاحب، خان علی خاں صاحب، جناب تیجر الدین قریشی، محترمہ ملکا مسری، جناب ظفر ادیب۔

کچھ دن بعد جب انسٹی ٹیوٹ کا انتخاب ہوا تو درج ذیل حضرات منتخب ہوئے۔ جناب لیفٹیننٹ گورنر کے ایل بھگت سرپرست؛ صدر: کرنل بشیر حسن زیدی؛ نائب صدور: پریم سروپ ساحب؛ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی؛ جناب وشوا ناتھ طاؤس؛ اعزازی ڈائرکٹر: ڈاکٹر خلیق انجم؛ جوائنٹ ڈائرکٹرز: ڈاکٹر اسلم پرویز؛ جناب یوگندر دکل تشنہ؛ محمد حسن علی خاں صاحب؛ شمیم احمد صاحب خازن۔ جناب چندن سروپ چڈھا۔

مل اردو کی بدقسمتی کہ چند ہی روز بعد محترمہ اندرا گاندھی جگ موہن صاحب سے ناراض ہو گئیں۔ جگ موہن صاحب کا تبادلہ کر دیا گیا۔ کارپوریشن کے متعصب اذہان کو موقع مل گیا اور پورا پلان ختم ہو گیا۔

یہ واقعات مارچ ۱۹۸۱ء کے ہیں۔ جگ موہن صاحب کی جگہ ایس۔ ایل کھورانہ صاحب دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر انجم نے کھورانہ صاحب کو اس سلسلے میں خط لکھا اور آرے کے دھون صاحب کے اس خط کی نقل منسلک کی جو وزیر اعظم کی ہدایت پر جگ موہن صاحب کو لکھا گیا تھا (دستاویز ۱۲)۔ دو تین مہینے تک کھورانہ صاحب اپنے نئے عہدے کے کاموں میں اس طرح مصروف رہے کہ مزار ذوق کے معاملے پر توجہ نہ کر سکے۔ ڈاکٹر انجم کے بار بار یاد دلانے پر کھورانہ صاحب نے کرنل۔ بی۔ ایچ زیدی اور ڈاکٹر خلیق انجم کو اپنے دفتر بلایا۔ زیدی صاحب ہندوستان سے باہر گئے ہوئے تھے۔ انجم صاحب نے کھورانہ صاحب کو مزار ذوق کی پوری تفصیلات بتائیں۔

کھورانہ صاحب نے میونسپل کارپوریشن کے افسران کو بلایا تھا۔ انھوں نے افسروں کو حکم دیا کہ پندرہ دن کے اندر اندر مزار ذوق کی تفصیلات پیش کریں۔ اپنے سفر سے واپسی پر کرنل زیدی نے ۱۵ جولائی ۱۹۸۱ کو دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر ایس۔ ایل۔ کھورانہ کو خط لکھا (دستاویز ۱۳) خط میں کہا گیا تھا کہ آپ نے پچھلے مہینے کی ۱۶ تاریخ کو ملاقات کا وقت دیا تھا مجھے افسوس ہے کہ ہندوستان سے باہر ہونے کی وجہ سے میں حاضر نہیں ہو سکا۔ ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خلیق انجم آپ سے ملے تھے اور انھوں نے مزار ذوق کی تمام تفصیلات سے آپ کو آگاہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر انجم کا کہنا ہے کہ آپ نے میونسپل کارپوریشن کو ہدایت دی ہے کہ وہ پندرہ دن کے اندر اندر آپ کو مزار ذوق کی صحیح پوزیشن سے واقف کرائیں۔ اب تک کارپوریشن کا جواب آپ کو مل گیا ہوگا۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ مجھے یہ بتا دیں کہ اس سلسلے میں اب تک کیا پیش رفت ہوئی ہے۔ (دستاویز ۱۳)

۱۸ اگست ۱۹۸۱ کو لیفٹیننٹ گورنر ایس۔ ایل۔ کھورانہ نے ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے صدر کے نام ایک خط لکھا جس میں زیدی صاحب کے ۱۵ جولائی ۱۹۸۱ء کے خط کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا کہ مجھے "دہلی کارپوریشن کے افسران نے اطلاع دی ہے کہ ذوق کا مزار اقدم شریف کے خسرہ نمبر ۵۲ میں تھا۔ اور ہائی کورٹ نے یہ زمین اکبری دیوی (اصل نام اکبری بیگم) کی ملکیت قرار دیا ہے۔ اس لیے انتظامیہ کے لیے اس زمین پر ذوق کا مقبرہ تعمیر کرنا مشکل ہے۔ گورنر نے یہ بھی لکھا کہ میں نے کمشنر میونسپل کارپوریشن دہلی سے کہا ہے کہ وہ نبی کریم کے رہنے والوں کو راضی کر کے بیت الخلاء کہیں اور ہٹا دے۔ اس سے پہلے جب اس طرح کی کوئی کوشش کی گئی تھی تو اس علاقے کے رہنے والوں نے مخالفت کی تھی۔ (دستاویز ۱۴)

۷ اپریل جنوری ۱۹۸۲ء میں دہلی اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا۔ ڈاکٹر خلیق انجم تعلیمی کمیٹی کے چیئرمین تھے اور دلی کے لفٹنٹ گورنر ایس۔ ایل کھورانہ اکیڈمی کے صدر تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے مجلس عاملہ کی اس میٹنگ میں مزار ذوق کا معاملہ اٹھایا۔ گورنر نے جواب دیا کہ آپ اس معاملے میں میرے سکریٹری سے رابطہ قائم کریں۔ ۲۲/جنوری ۱۹۸۲ کو ڈاکٹر خلیق انجم نے لیفٹیننٹ گورنر کے سکریٹری کے۔ ایس۔ بیدون کو خط لکھا جس میں اردو اکادمی کے جلسے میں مزار ذوق پر ہونے والی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ ذوق کا مزار بالکل اسی جگہ تھا جہاں عوامی بیت الخلاء بنایا گیا ہے۔ میونسپل کارپوریشن دہلی نے لیفٹیننٹ گورنر کو اطلاع دی ہے کہ جس جگہ ذوق کا مزار تھا وہ جگہ اب ہائی کورٹ کے فیصلے کے مطابق ذاتی ملکیت ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا کہ کارپوریشن کا یہ بیان سراسر غلط ہے یہ معاملہ الجھانے کی کوشش ہیں۔ ڈاکٹر انجم نے اس جگہ کا ایک نقشہ خود تیار کیا تھا، جہاں کبھی مزار ذوق تھا۔ اس خط کے ساتھ وہ نقشہ بھی منسلک کیا گیا اور خط کے آخر میں یہ درخواست کی گئی کہ جو انجم صاحب اور دوسرے متعلقین تمام ذمہ دار حضرات سے کر چکے تھے۔ یعنی بیت الخلا منہدم کر کے وہ جگہ ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو دے دی جائے تاکہ ذوق کے شایان شان وہاں ایک یادگار قائم کی جا سکے۔ (دستاویز ۱۵)

افسوس ہے کہ بقول ڈاکٹر خلیق انجم گورنر آفس نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ دہلی میونسپل کارپوریشن کے افسر گورنر کو بہکانے میں کامیاب ہو گئے۔

اپریل ۱۹۸۲ء میں جگ موہن صاحب دوبارہ دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر ہو گئے۔ چوں کہ انھوں نے پہلے اس معاملے میں غیر معمولی دلچسپی لی تھی، اس لیے ڈاکٹر خلیق انجم نے جگ موہن صاحب کے نام ایک خط لکھ کر ان سے ملاقات کی۔ اس خط میں مزار ذوق کا پورا پس منظر بیان کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ اندرا جی کی ہدایت پر انھوں نے خود اس معاملے میں بہت دلچسپی لی تھی۔ (دستاویز ۱۶) جگ موہن صاحب نے کہا کہ ہم ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور میونسپل کارپوریشن کے عہدے داروں کی ایک میٹنگ کر لیتے ہیں جس میں یہ

سانحہ طے کرلیا جائے گا۔

جون ۱۹۸۳ء میں ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سرپرست ایچ۔کے۔ایل بھگت صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور اُن کی جگہ جناب بجنی کمار (ایم۔پی) کو سرپرست بنایا گیا۔ دہلی کے لیفٹننٹ گورنر نے جون کے دوسرے ہفتے میں مزارِ ذوق کے سلسلے میں ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے عہدے داروں کی ایک میٹنگ بلائی۔ ۱۶/جنوری ۱۹۸۳ء کو ڈاکٹر خلیق انجم نے لیفٹننٹ گورنر کے سکریٹری امر داحمد صاحب کو اس تمام خط و کتابت کا فائل بھیجا جو مزارِ ذوق کے سلسلے میں صوبائی اور مرکزی حکومت کے مختلف عہدے داروں سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس خط میں یہ بھی لکھا کہ بجنی کمار صاحب جو سوسائٹی کے سرپرست ہیں یہ میٹنگ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے انھیں بھی اس میٹنگ میں مدعو کیا جائے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ بھی درخواست کی کہ ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نائب صدر پریم وردیہ صاحب کو بھی اس میٹنگ میں مدعو کیا جائے۔ (دستاویز ۱۷) ڈاکٹر خلیق انجم کے قول کے مطابق لیفٹننٹ گورنر جگ موہن کے دفتر میں بہت اچھی میٹنگ ہوئی۔ چائے کے ساتھ بہت مزے کے لوازمات پیش کیے گئے وہ بات ختم ہوگئی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اس میٹنگ کے بعد جگ موہن صاحب نے مزارِ ذوق کے بارے میں قطعی دلچسپی نہیں لی۔ یہ بات ہمیں بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ جگ موہن صاحب اردو کے مخالفوں میں ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا وہ اعلانیہ طور پر بی۔جے۔پی میں شامل ہو گئے ہیں اور اس پارٹی کی طرف سے راجیہ سبھا کے رکن بھی ہیں۔ مزارِ ذوق میں ان کی دلچسپی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کی وجہ سے تھی۔ وہ دنیا میں نہیں رہیں تو جگ موہن صاحب کی بھی دلچسپی ختم ہوگئی۔

کچھ عرصے خاموش رہنے کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے مزارِ ذوق کی بازیافت کے لیے پھر جدوجہد شروع کی۔ اس دفعہ انھوں نے دہلی سے شائع ہونے والے ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار STATES MAN سے رجوع کرکے اخبار کے چیف رپورٹر کو مزارِ ذوق کی تفصیلات سے واقف کیا۔ اسٹیٹسمین نے ۲۳/مئی ۱۹۸۳ کی اشاعت میں مزارِ ذوق کے بارے میں لکھا کہ "مزارِ ذوق نبی کریم قبرستان میں پبلک لیٹرین کے نیچے دبا ہوا ہے۔ ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے بیان کے مطابق ۱۹۴۷ء سے قبل نبی کریم ایک باقاعدہ قبرستان تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مزار منہدم کرکے اس پر بیت الخلا بنا دیا گیا ہے۔" اس کے بعد کرنل بشیر حسین زیدی اور ڈاکٹر خلیق انجم کی محترمہ اندرا گاندھی، جگ موہن اور دوسرے لوگوں سے ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "ڈاکٹر خلیق انجم کا کہنا ہے کہ کتنی شرم کی بات ہے کہ ایسے عظیم شاعر کا مزار ہمیشہ بیت الخلا کے نیچے رہے گا۔" (دستاویز ۱۸)

اس کے پانچ دن بعد علی گڑھ کے الیاس احمد صاحب کا ایک خط "قومی آواز" (نئی دہلی) میں ۲۸/مئی ۱۹۸۳ء کو شائع ہوا۔ الیاس صاحب نے ۲۳/مئی ۱۹۸۳ء کے States man میں شائع ہونے والے نوٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ذوق کے قبر کی یہ درگت بنا بڑے شرم کی بات ہے۔ (دہلی انتظامیہ کم از کم عوامی بیت الخلا کو منہدم کرکے ذوق کے قبر کی تعمیر کر سکتی ہے۔ (دستاویز ۱۹)

انجمن کے اردو آرکائیوز کے فائل میں ضامن علی خاں صاحب کے ایک مضمون کا تراشا محفوظ ہے، جس کا عنوان ہے "مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے" تراشے کے اوپر بائیں طرف کے حاشیے میں ۱۰/جون ۱۹۸۳ کی تاریخ لکھی ہے اور نیچے حاشیے میں "قومی آواز" (لکھنؤ) ۱۵/جون ۱۹۸۳ء لکھا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ضامن علی خاں کا یہ مضمون ۱۰/جون کو دلی کے "قومی آواز" میں شائع ہوا تھا اور ۱۵/جون ۱۹۸۳ کو "قومی آواز" لکھنؤ میں نقل ہوا۔ یہ مضمون مزارِ ذوق کی تفصیلات پر بہت اچھی روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں مزارِ ذوق پر بیت الخلا کو منہدم کرنے کے سلسلے میں ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ڈاکٹر خلیق انجم، مولانا اندر صابری، کرنل بشیر حسین زیدی، شری ایچ۔کے۔ایل بھگت، جناب بجنی کمار (ایم۔پی)، محترمہ اندرا گاندھی اور دوسرے لوگوں کی خدمات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ پورا مضمون دستاویز ۲۰ کے تحت نقل کیا گیا ہے۔

۱۸/جون ۱۹۸۳ء کو اردو کے ایک اور اخبار میں کسی کا خط شائع ہوا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے اردو آرکائیوز کے ریکارڈ میں جو اردو اخبار کا تراشا محفوظ ہے اس میں اخبار کا نام نہیں پڑھا جا رہا ہے۔ اس تراشے میں مزارِ ذوق کی بازیافت کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم، کرنل بشیر حسین زیدی اور مولانا اندر صابری کی کوششوں کو سراہا گیا ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ جلد سے جلد بیت الخلا منہدم کرکے ذوق کا مزار بنایا جائے۔ (دستاویز: ۲۱)

۱۴/جون ۱۹۸۳ء کو "قومی آواز" (نئی دہلی) میں جیندر لوبرائے کا ایک مراسلہ شائع ہوا۔ انھوں نے ضامن علی خاں صاحب کے مضمون "مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے" کا حوالہ دیتے ہوئے مزارِ ذوق کی اس حالت اور دہلی میونسپل کارپوریشن کی شرمناک حرکت پر اظہارِ افسوس کیا ہے اور لکھا ہے کہ مجھ پر اردو شاعری کا جو قرض ہے اسے میں اس طرح چکانا چاہتا ہوں کہ جب میونسپل کارپوریشن بیت الخلا ڈھا دے تو میں اپنے خرچ سے ذوق کا مقبرہ بنوا دوں۔ (دستاویز ۲۲) لوبرائے صاحب نے محترمہ اندرا گاندھی، لیفٹننٹ گورنر جناب جگ موہن اور ڈاکٹر خلیق انجم کو ذاتی خط لکھ کر بھی پیش کش کی تھی۔ لیکن کارپوریشن بیت الخلا ڈھانے کے لیے تیار ہی نہ تھی اس لیے مقبرہ بنانے کا سوال ہی نہیں تھا۔

۱۵/جون ۱۹۸۳ء کو دہلی کی پانچ چھ انجمنوں نے "قومی آواز" میں

مراسلہ شائع کرایا، جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ لیفٹننٹ گورنر فوری طور پر پبلک لیٹرین گرا کر مزارِ ذوق کی تعمیر کریں۔ اس مراسلے پر دستخط کرنے والوں میں ساغر نظامی صاحب، فاروق جالی صاحب، ملک زادہ صاحب، یوگیندر پال تشنہ صاحب اور حکیم سیّد ظفر ادیب تھے۔ (دستاویز: ۳۳)

ہندوستان کے بیشتر اخبار مزارِ ذوق کے سلسلے میں دہلی میونسپل کارپوریشن پر لعن طعن کر رہے تھے۔ مرادآباد کے منصور چودھری کا ایک مراسلہ ۱۸/جون ۱۹۸۳ء کے "قومی آواز" (نئی دہلی) میں شائع ہوا جس میں مزارِ ذوق کی حالت پر اظہارِ افسوس کیا گیا اور کہا گیا کہ "ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سرپرست بخشی کار صاحب اور اعزازی ڈائرکٹر ڈاکٹر خلیق انجم سے ہماری درخواست ہے کہ دہلی میں مقیم تمام زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک وفد فوراً مسز اندرا گاندھی جی کے پاس لے جائیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اندرا گاندھی اس سلسلے میں ہماری مدد نہ کریں۔ اگر وفد میں شرکت کے لیے ہماری ضرورت ہے تو ہم چاہا پانچ سو کی تعداد میں اپنے خرچ پر دہلی آنے کو تیار ہیں۔" (دستاویز: ۳۳)

۲۰/جون ۱۹۸۳ء کو اردو کے مشہور ادیب وشوا ناتھ طاؤس صاحب کا خط "قومی آواز" (نئی دہلی) میں شائع ہوا۔ طاؤس صاحب نے خط میں لکھا تھا "حیرت ہے کہ ذوق میموریل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو وزیرِ اعظم اور لیفٹننٹ گورنر کی حمایت حاصل ہے اور مسٹر بخشی کار، ایم۔ پی اور ڈاکٹر خلیق انجم جیسا باوسیلہ، باصلاحیت اور فعال لوگ انسٹی ٹیوٹ کے سرپرست اور ڈائرکٹر ہیں، پھر بھی معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ہماری کوششوں میں کوئی کمی ہے۔ اگر انسٹی ٹیوٹ چندے کی غرض سے اردو دوستوں کی مدد چاہتا ہے تو ہم ہر طرح حاضر ہیں۔"

"قومی آواز" کے اوائل ۱۹۸۳ء کی کسی اشاعت میں ڈاکٹر خلیق انجم نے مزارِ ذوق کی پوری تفصیلات شائع کرائیں۔ اس کے علاوہ انجم صاحب نے انگریزی اخبار نیشنل ہیرالڈ سے رابطہ قائم کیا، جس نے ۵/اپریل ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں ڈاکٹر خلیق انجم کے حوالے سے مزارِ ذوق کی تفصیلات بیان کیں۔

مزارِ ذوق کے سلسلے میں اخباروں میں جو خبریں شائع ہوئیں، ان سے متاثر ہو کر راجیہ سبھا کے کسی ممبر نے پارلیمنٹ میں سوال کیا۔ پارلیمنٹ نے ڈائرکٹر آثارِ قدیمہ ایم۔ ڈی۔ کھرے صاحب سے مزارِ ذوق کے بارے میں دریافت کیا۔ کھرے صاحب نے سپرنٹنڈنٹ آثارِ قدیمہ وقار حسن صدیقی صاحب کو رپورٹ لکھنے کی ہدایت دی۔

۲۵/جون ۱۹۸۳ء کو صدیقی صاحب نے ایم۔ ڈی۔ کھرے صاحب کو اپنی رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ کے آخری پیراگراف میں لکھا کہ دہلی کے کچھ پرانے لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ قبرستان نبی کریم میں جو بیت الخلا ہے اس کے نیچے مزارِ ذوق کا کچھ حصہ دب گیا ہے۔ (دستاویز ۲۵)

۵/اگست ۱۹۸۳ء کو وقار حسن صدیقی صاحب نے ایم۔ ڈی۔ کھرے صاحب کو اپنی رپورٹ کا دوسرا حصہ پیش کیا۔ چوں کہ وقار صاحب اردو اور فارسی کے بھی اسکالر ہیں، اس لیے انھوں نے رپورٹ کے دوسرے حصے میں ذوق کے مختصر اور مستند حالات لکھے۔ (دستاویز ۲۶)

بہرحال معاملہ پا کا ہی ہوتی رہی، لیکن ڈاکٹر خلیق انجم صاحب ہمت نہیں ہارے۔ اب انھوں نے پارلیمنٹ کا سہارا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے لوک دل کی طرف سے لوک سبھا کے ممبر محفوظ علی خاں صاحب کو مزارِ ذوق کے حالات سے واقف کرایا۔ محفوظ صاحب نے اس سلسلے میں پارلیمنٹ میں سوال کیا۔ "کیا حکومت کو معلوم ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے استاد محمد ابراہیم ذوق کے مزار پر بیت الخلا بنا دیا گیا ہے۔ حکومت ایسی تاریخی عمارتوں کے تحفظ کے لیے کیا اقدامات کر رہی ہے۔"

۲۱/نومبر ۱۹۸۵ء کو محفوظ علی خاں صاحب کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے مرکزی وزیرِ مملکت برائے تہذیب و ثقافت محترمہ مرد جگی نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ "ذوق کی قبر ایک قبرستان میں بتائی جاتی ہے لیکن اس قبرستان میں یہ تعین نہیں کیا جا سکا کہ ذوق کی قبر کس جگہ ہے۔" محترمہ مرد جگی کے اس بیان پر ڈاکٹر خلیق انجم نے ۱۸/دسمبر ۱۹۸۵ء کے "ہماری زبان" کا اداریہ لکھا۔ انھوں نے محترمہ مرد جگی کے بیان پر بہت سخت الفاظ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"ہمیں نہیں معلوم کہ مسز جگی کو یہ اطلاعات کس نے فراہم کی ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس بیان میں جس دروغ گوئی سے کام لیا گیا ہے اس کی ذمے داری کس پر ہے۔ ممکن ہے بعض سرکاری افسروں نے مسز جگی کو اس طرح کی لغو اطلاعات فراہم کی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود مسز جگی نے اختراع فرمائی ہو۔ بہرحال حقیقت وہ ہے جو ہم کئی سال سے کہہ رہے ہیں۔ استاد ذوق کے مزار پر پبلک بیت الخلا بنا ہوا ہے۔ ہم نے پرانی دہلی والوں سے تحقیق کر کے اس جگہ کی نشان دہی کی تھی۔ آج سے لگ بھگ تین چار سال پہلے کرنل زیدی اور میں (خلیق انجم) مرحومہ اندرا گاندھی سے ملے تھے اور ہم نے مزارِ ذوق کے بارے میں ایک میمورنڈم پیش کیا تھا۔ اندرا جی نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ مہینے بھر کے اندر اندر یہ مسئلہ حل کر دیں گی۔ مرحومہ نے حسبِ عادت فوراً اقدام کیا اور اپنے پرسنل سکریٹری دھون صاحب کو بلا کر ہمارا میمورنڈم ان کو دیا اور ہماری موجودگی میں حکم دیا کہ دہلی کے لیفٹننٹ گورنر سے کہہ کر یہ کام فوراً کرا دیا جائے۔ چند دن میں دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جگ موہن صاحب نے ہمیں بلا کر پوچھا کہ مزارِ ذوق کی اصل جگہ کون سی ہے۔ ہم نے نقشہ بنا کر انھیں دے دیا۔ جگ موہن صاحب نے جب کارروائی شروع کی تو معلوم ہوا کہ اس جگہ سے بیت الخلا ہٹانے کے خلاف کچھ لوگ عدالت سے حکم امتناعی لائے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو اس پر اعتراض نہیں تھا کہ بیت الخلا ہٹایا جا رہا ہے۔ ان

کا کہنا تھا کہ آس پاس کسی دوسری جگہ پہلے بیت الخلا بنایا جائے پھر موجودہ بیت الخلا کو ڈھا دیا جائے۔ ابھی یہ کوششیں چل ہی رہی تھیں کہ جگ موہن صاحب کا دہلی سے تبادلہ ہوگیا اور یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ کچھ دن بعد ہم نے پھر سے لیفٹیننٹ گورنر سے بات چیت شروع کی انھوں نے فائل نکلوایا اور پھر کوشش شروع کردی۔ ان کو دفتر نے یہ اطلاع دی تھی کہ آس پاس کوئی ایسی خالی جگہ نہیں ہے جس پر بیت الخلا بنایا جاسکے۔ اس مرحلے پر ہم نے مشورہ دیا کہ آس پاس کے (قریب) رہنے والوں میں سے اگر کسی بھی خاندان کو کسی کولونیوں میں کہیں معاوضہ کے طور پر سو گز زمین دے دی جائے تو وہ خاندان خوشی راضی ہوجائے گا۔ گورنر صاحب کو ہماری یہ تجویز پسند آئی۔ انھوں نے اپنے متعلقہ افسر کو حکم دیا کہ وہ اس طرح کا خاندان تلاش کریں۔ ابھی یہ کوششیں جاری ہی تھیں کہ گورنر صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔

دلّی اردو اکادمی کے دو تین جلسوں میں میں نے جناب ایم۔ ایم۔ کے ولی لیفٹیننٹ گورنر دلّی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ اکادمی کے سارے اراکین گواہ ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ وعدہ کیا اور کہا کہ چند دنوں ہی میں یہ مسئلہ حل ہوجائے گا لیکن ہماری معلومات کے مطابق انھوں نے اس سلسلے میں کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ مسز زونگی اگر اصل جگہ کا ثبوت چاہتی ہیں تو ہم تمام ثبوت فراہم کرنے کو تیار ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ دروغ گوئی بہت ہوچکی۔ طرح طرح کے بہانوں سے ہم اردو والوں کو بہلا چکے اگر ۱۵ گز زمین اردو والوں کو دے دی جائے تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ ڈی۔ ڈی۔ اے نے اربوں روپوں کی مسلم اوقاف کی زمین پر قبضہ کیا ہے۔ اوقاف کی بیشتر زمین پانچ پانچ ہزار روپے گز بیچی جارہی ہے۔ اگر ایسی ۱۵ گز زمین واپس کردی جائے اور جس کی قیمت ڈیڑھ دو سو روپے گز سے زیادہ نہیں ہے تو حکومت کا ایسا کون سا نقصان ہوجائے گا"

("ہماری زبان" ۸/ نومبر ۱۹۸۵ء صفحہ ۱)

جب قومی پریس اور پارلیمنٹ میں مزار ذوق کے مسئلے پر سخت احتجاج شروع ہوا تو آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو بھی کچھ ہوش آیا۔ دہلی آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر ایم۔ ڈی۔ کھرے صاحب نے ۲۱/ جنوری ۱۹۸۶ء کو کرنل بشیر حسین زیدی کو خط لکھ کر ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین کا نام اور انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں دیگر تفصیلات دریافت کیں۔ (دستاویز نمبر ۲۷) کھرے صاحب کے اس خط کا جواب ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ڈاکٹر خلیق انجم نے ۲۳/ جنوری ۱۹۸۶ء کو ایک خط کے ذریعے دیا۔ اس خط میں مزار ذوق کے سلسلے میں ہونے والی پوری کارروائی بیان کی گئی تھی نیز محترمہ اندرا گاندھی اور مختلف گورنروں نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا تھا وہ سب بیان کیا۔ (دستاویز ۲۸)

دہلی اردو اکادمی کی جنرل باڈی کی میٹنگ ۲۲/ جولائی ۱۹۸۶ء کو لیفٹیننٹ گورنر کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں ڈاکٹر خلیق انجم نے بہت شدومد کے ساتھ مزار ذوق کا معاملہ اٹھایا۔ یہ وہی ہوا جو بقول ڈاکٹر خلیق انجم ہر ایسی میٹنگ میں ہوتا تھا۔ لیفٹیننٹ گورنر نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد معاملے کو طے کرلیں گے۔ لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھی۔

یہ تمام معاملات چلتے رہے۔ سنہ ۱۹۵۵ء کے بعد دہلی وقف بورڈ بالکل خاموش رہا اس نے اس معاملے میں قطعی دلچسپی نہیں لی۔ وقف بورڈ کے ریکارڈ میں پر ڈپٹی انسپکٹر وقف بورڈ کی لکھی ہوئی ایک مفصل رپورٹ ملتی ہے جو وقف بورڈ کے سکریٹری کو پیش کی گئی۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ "آپ نے ۹/ ستمبر ۱۹۸۶ء کو ہدایت دی تھی کہ میں مزار ذوق کے سلسلے میں رپورٹ تیار کروں۔ دوسرے ہی دن میں قبرستان نبی کریم، پہاڑ گنج گیا۔ میں نے دیکھا کہ قبرستان کے جس حصے پر چند مکانات بنائے گئے ہیں وہاں عام لوگوں کی سہولت کے لیے مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے پبلک لیٹرن بنائی گئی ہے آس پاس کے رہنے والے مسلمانوں سے معلوم ہوا کہ پبلک لیٹرن مزار ذوق پر تعمیر کیا گیا۔ لوگوں نے ڈپٹی انسپکٹر کو یہ بھی بتایا کہ استاد ذوق کے مزار پر "پختہ کمرہ" تھا۔ ڈپٹی انسپکٹر نے اپنی رپورٹ میں کئی باتیں ایسی کہی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُن کی بس یہ بات درست ہے کہ بیت الخلا مزار ذوق پر بنایا گیا تھا۔" (دستاویز ۲۶)

۱۹۹۱ء میں مارکنڈے سنگھ صاحب دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے مارکنڈے سنگھ صاحب کو ایک خط لکھا جس میں مزار ذوق کی پوری تفصیلات بیان کرکے درخواست کی کہ پبلک لیٹرن منہدم کرکے یہ جگہ دہلی اردو اکادمی یا ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو دے دی جائے۔ کچھ دنوں تک جب مارکنڈے سنگھ صاحب کا کوئی جواب نہیں آیا تو ڈاکٹر انجم صاحب گورنر سے ملنے خود چلے گئے۔ گورنر نے مزار ذوق کا فائل منگوایا، فائل میں سب سے اوپر ڈاکٹر خلیق انجم کا وہ خط لگا ہوا تھا، جو انھوں نے ۵/ جون ۱۹۹۱ء کو لیفٹیننٹ گورنر مارکنڈے سنگھ کو لکھا تھا۔ اس خط کے حاشیے پر مختلف سرکاری افسروں کے کچھ نوٹ لکھے ہوئے تھے۔ گورنر صاحب نے اس خط کی زیروکس کاپی خلیق انجم صاحب کو دلوادی۔ خط کے سب سے نیچے بارڈر بنا کر لکھا گیا تھا (Most Urgent)۔ خط کے بائیں حاشیے پر ایک نوٹ تھا جو بقول ڈاکٹر انجم لیفٹیننٹ گورنر کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ڈپٹی میونسپل کمشنر کے لیے لکھا گیا تھا۔

"Kindly recall my telephonic conversation in the behalf for removal of the obvious structures from the site of

Zauq's grave in Nabi Karim. Please do the needful early so that this sore point may not be agitate again and againi"

خط کے بائیں حاشیے پر یہ نوٹ ہے:

"Is necessary Shri Khaliq Anjum may be contacted. He has one plan for it "

اس سے نیچے ایک اور نوٹ ہے:

" Get this attended to and let me have a report early "

(دستاویز-۳)

ڈاکٹر خلیق انجم اس معاملے میں کبھی خاموش ہو کر نہیں بیٹھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر سید حامد صاحب کے زیرِ قیادت ایک وفد دہلی کے لیفٹنٹ گورنر سے ۱۹ اپریل ۱۹۹۱ کو ملا۔ اس وفد میں سید حامد صاحب کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی شامل تھے۔ اس وفد نے گورنر کو دو میمورنڈم پیش کیے۔ ایک میمورنڈم دہلی میں اردو کے مسائل کے بارے میں تھا اور دوسرا مزارِ ذوق کے سلسلے میں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کچھ دن انتظار کیا اور جب گورنر نے کچھ نہیں کیا تو ڈاکٹر خلیق انجم کی قیادت میں پھر ایک وفد لیفٹنٹ گورنر سے ملا۔ اس وفد میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر اسلم پرویز اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی شامل تھے۔ وفد نے پھر ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں بیت الخلا کو ڈھانے کا پُر زور مطالبہ کیا گیا۔ گورنر صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد کچھ کریں گے لیکن افسوس کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ (دستاویز-۳ت)

روزنامہ ''عظیم آباد ایکسپریس''، پٹنہ نے اس موضوع پر ۲۳ جون ۱۹۸۲ کو بہت طویل اداریہ لکھا۔ انھوں نے اداریے میں لکھا کہ مزارِ ذوق کے سلسلے میں تحریک چلانے والوں کو صدرِ جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ صاحب کی توجہ مبذول کرانی چاہیے چوں کہ خود وہ بھی ایک شاعر ہیں یقیناً وہ ایک شاعر کے مزار کی بے کسی کو برداشت نہیں کر سکتے اور فوری طور پر اقدام کریں گے۔ رضوان صاحب مدیر ''عظیم آباد ایکسپریس'' نے اداریے میں مزید لکھا کہ ''اس سلسلے میں ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قبل ہی سے کام کر رہا ہے، جس کے سرپرست پہلے لیگ کے ایل گجرال ہوا کرتے تھے جو اب مرکز میں وزیرِ اطلاعات و نشریات ہیں۔ اب اس کے سرپرست بخشی کا ر (ایم پی) ہیں۔ اس کے صدر کرنل بشیر حسین زیدی اور ڈاکٹر خلیق انجم ہیں۔ ڈاکٹر انجم ہندوستان بھر کے اردو کے مسائل کے لیے جدوجہد کرتے رہتے ہیں اور بہت حد تک حل کرتے رہتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے مزارِ ذوق پر عوامی بیت الخلا کی تعمیر کر دی گئی اور وہ خاموش ہو کر دیکھتے رہے''۔ (دستاویز-۳س) رضوان احمد صاحب بہت معقول اور سنجیدہ آدمی ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس تکلیف کی وجہ سے جو مزارِ ذوق کے انہدام سے انھیں ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر انجم مزار کے انہدام کے بعد انھیں اس ناریخی حادثے کا علم ہوا۔ جب ہندوستان کے وزیرِ اعظم، دہلی میونسپل کارپوریشن کی چالاکیوں اور تعصب کے سامنے بے بس ہو گئے تو ڈاکٹر خلیق انجم کس گنتی میں تھے۔

۱۹۹۶ء کے اوائل میں انگریزی کے مشہور صحافی فیروز بخت صاحب نے کسی انگریزی اخبار میں ایک مقالہ لکھا جس میں بہت مؤثر انداز میں غالب اور ذوق کے مزاروں کی خستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے، اس بیت الخلا کی تفصیل بیان کی جو مزارِ ذوق پر بنایا گیا تھا۔ سپریم کورٹ کے ایک مشہور ایڈووکیٹ ایم سی مہتہ نے یہ تحریر پڑھی۔ انھیں اردو کے ان عظیم شاعروں کے مزاروں کی اس حالت پر بہت افسوس ہوا۔ انھوں نے عوامی مفاد کے تحت آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا اور دہلی میونسپل کمشنر کے خلاف سپریم کورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کر دی۔ اتفاق سے معاملہ جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس صغیر احمد کی بنچ کی عدالت میں پیش ہوا۔

۲۳ اگست ۱۹۹۶ کو ذوق اور غالب کے مزاروں کے سلسلے میں سپریم کورٹ میں سماعت تھی۔ عدالت نے انجمن ترقی اردو (ہند) غالب انسٹی ٹیوٹ اور غالب اکیڈمی کے نمائندوں کو بھی عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔ انجمن کی طرف سے ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شاہد ماہلی صاحب اور غالب اکیڈمی کی طرف سے ڈاکٹر عقیل احمد عدالت کی وزیٹنگ گیلری میں بیٹھے تھے۔ جسٹس صغیر احمد اور جسٹس کلدیپ سنگھ جج تھے۔ مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ میونسپل کارپوریشن کے کمشنر نے بحث کا آغاز کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ نبی کریم میں مزارِ ذوق کی وہ جگہ نہیں ہے جہاں عوامی بیت الخلا بنے ہوئے ہیں۔ جسٹس صغیر احمد اور جسٹس کلدیپ سنگھ سوال پر سوال کر رہے تھے لیکن میونسپل کمشنر بہت تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ ایک وقت وہ آیا، جب محسوس ہونے لگا کہ عدالت کمشنر کے دلائل کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ اردو والوں کی خوش نصیبی تھی کہ اس وقت عدالت میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے مشہور وکیل طاہر صدیقی صاحب اور ڈاکٹر خلیق انجم بھی موجود تھے۔ طاہر صدیقی صاحب کی نظر ڈاکٹر خلیق انجم پر پڑی۔ انھوں نے عدالت سے کہا کہ اس وقت عدالت میں اردو کے ایک ممتاز اسکالر ڈاکٹر خلیق انجم موجود ہیں۔ مزارِ ذوق کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی جو معلومات ہیں وہ کسی اور کی نہیں ہیں کیوں کہ پچھلے تیس پینتیس سال سے مزارِ ذوق کی بازیافت کی کوشش کر رہے ہیں۔ عدالت

نے وزیٹنگ گیلری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر خلیق انجم سامنے آجائیں۔

ڈاکٹر انجم کا کہنا ہے کہ جب میں وزیٹنگ گیلری سے اس مقام کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں وکیل کھڑے ہو کر بحث کرتے ہیں تو غیر معمولی طور پر نروس تھا۔" ڈاکٹر صاحب نے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا:

Me Lord, I am appearing before the Supreme Corurt for the first time. I dont know the etiquettes of the court. I even dont know how to address the Honarable Court.

ڈاکٹر خلیق انجم کا شمار اردو کے چند ممتاز ترین مقررین میں ہوتا ہے لیکن اس وقت اُن کی آواز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہت نروس ہیں۔ اُن کی بات سن کر جسٹس کلدیپ سنگھ نے ہنس کر کہا کہ:

You are appearing like an experienced lawyer.

ڈاکٹر انجم کا کہنا ہے کہ جسٹس کلدیپ سنگھ کے ہنس کر یہ بات کہنے سے مجھ میں اعتماد پیدا ہو گیا۔ شروع میں تو ڈاکٹر صاحب آہستہ آہستہ بولتے رہے پھر کچھ دیر بعد اُن کی گفتگو میں وہی روانی پیدا ہو گئی جو اُردو میں تقریر کرتے ہوئے ہوتی ہے۔ میں نے انہیں اب تک اردو میں تقریریں کرتے ہوئے سنا تھا۔ لیکن روانی کے ساتھ انگریزی میں بحث کرتے ہوئے پہلی بار دیکھا تھا۔ بالکل یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بہت تجربہ کار ممتاز قانون داں بحث کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بے شمار دلائل پیش کر کے آدھے گھنٹے کی بحث میں عدالت کو متاثر کر لیا۔ عدالت نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میونسپل کمشنر صاحب کہتے ہیں کہ بیت الخلا والی جگہ پر مزار ذوق نہیں تھا، آپ کہتے ہیں کہ تھا۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا مشورہ ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ میری مؤدبانہ درخواست ہے کہ عدالت آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو حکم دے کہ تحقیق کر کے اس سلسلے میں رپورٹ پیش کرے۔ خود میونسپل کمشنر کی بھی یہی تجویز ہے۔ عدالت کو یہ تجویز پسند آئی۔ جسٹس صغیر احمد نے ڈاکٹر انجم صاحب سے کہا کہ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی مدد کرنے کے لیے آپ ایک کمیٹی تشکیل دے دیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نے خواجہ حسن ثانی نظامی، شاہد ماہلی، ایم۔ حبیب خاں صاحب، فیروز بخت صاحب اور ڈاکٹر عقیل احمد کے نام اس کمیٹی کے لیے پیش کیے، جسے عدالت نے منظور کر لیا۔ اس سلسلے کی پہلی میٹنگ ۹ ر ستمبر ۹۶ کو میونسپل کارپوریشن کے ڈپٹی کمشنر جگ موہن صاحب کے دفتر میں ہوئی۔ جس میں ڈاکٹر خلیق انجم اور مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ میٹنگ میں کارپوریشن کے بہت سے انجینئر، اوور سیئر اور دوسرے عہدے دار موجود تھے۔ میٹنگ شروع ہوئی۔ کارپوریشن کے انجینئروں اور دوسرے عہدے داروں نے لمبی لمبی تقریریں کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جہاں عوامی بیت الخلاء ہے وہاں مزار ذوق نہیں تھا۔ ایک گھنٹے بعد جگ موہن سنگھ صاحب نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈی۔ وی۔ شرما سے اظہار خیال کے لیے کہا۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ اپنی تحقیق مکمل کیے بغیر میرے لیے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم سے بولنے کے لیے کہا گیا۔ وہ غصے میں بھرے بیٹھے تھے۔ ایک دم پھٹ پڑے۔ کہنے لگے کہ سپریم کورٹ نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا سے رپورٹ تیار کرنے کو کہا ہے۔ آپ نے کس حیثیت میں یہ میٹنگ بلائی ہے۔ آپ کے تمام انجینئروں کو کھا پڑھا کر بھیجا گیا ہے کہ انہیں کیا کہنا ہے ورنہ ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جو معاملے کی نوعیت سے واقف ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ نے یہ میٹنگ اس لیے بلائی ہے تا کہ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈی۔ وی۔ شرما صاحب کو اور کمیٹی کے دوسرے اراکین کو غلط اور بے بنیاد حقائق سے متاثر کر سکیں۔ میونسپل کارپوریشن کے منفی رویے کی وجہ سے اتنی تاخیر ہوئی۔ اگر آپ لوگ مداخلت نہ کرتے تو یادگار ذوق کا مسئلہ کبھی کا حل ہو گیا ہوتا۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے سپرنٹنڈنٹ ڈی۔ وی۔ شرما کا رویہ بہت ہمدردانہ تھا۔ انھوں نے مزار ذوق کے سلسلے میں مثبت رپورٹ لکھنے میں کمیٹی کی بہت مدد کی۔ وقار حسن صدیقی صاحب جو آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈپٹی ڈائرکٹر رہ چکے تھے، وہ ریٹائر ہو کر رام پور جا چکے تھے، جہاں وہ رضا لائبریری رام پور میں او۔ ایس۔ ڈی کے عہدے پر فائز تھے۔ انہیں بھی اس کمیٹی میں شامل کر لیا گیا تھا۔ وہ ایم۔ ڈی۔ کھرے ڈائرکٹر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی ہدایت پر ۲۵ ر جون ۱۹۸۲ کو مزار ذوق پر ایک رپورٹ لکھ چکے تھے۔ جس میں انھوں نے کہا کہ دہلی میونسپل کارپوریشن نے جس جگہ بیت الخلا بنایا، یہیں مزار ذوق تھا۔ چوں کہ صدیقی صاحب نے مزار ذوق کے سلسلے میں بہت اچھی تحقیق کی تھی۔ اس لیے اس کمیٹی کی رپورٹ لکھنے میں وہ بہت معاون ثابت ہوئے۔

مقدمے کی اگلی سماعت ۱۶ ر دسمبر ۱۹۹۶ء کو ہوئی۔ بنچ میں جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس سید صغیر احمد شامل تھے۔ عدالت میں کمیٹی کی رپورٹ پیش کی گئی۔ یہ رپورٹ بہت طویل ہے۔ اس لیے یہاں نقل نہیں کی گئی۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو (ہند) کے اردو آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ جس کی تمام سفارشات کو عدالت نے منظور کر کے حکم دیا کہ بیت الخلا منہدم کر دیے جائیں اور اس پلاٹ پر بنائے جائیں جس کی کمیٹی نے سفارش کی ہے۔ کمیٹی نے رپورٹ میں سفارش کی تھی کہ یادگار ذوق کی تعمیر کے لیے ۲۵ میٹر x ۲۱٫۵ (۵۳۷ اسکوائر میٹر) کی ضرورت ہوگی۔ کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی تھی کہ یادگار ذوق کی تعمیر کے لیے بیت الخلا کے پاس کے کچھ مکان ڈھانے پڑیں گے۔ عدالت نے کمیٹی کی یہ تجویز منظور کر لی کہ جن لوگوں کے مکان اور دکانیں گرائی جائیں گی انہیں ڈی۔ ڈی۔ اے متبادل مکان اور دکانیں دے گی۔ عدالت نے یہ بھی حکم دیا کہ یادگار ذوق کی تعمیر کا کام تیز رفتاری کے ساتھ عمل میں آنا چاہیے۔

۱۸ رنومبر ۱۹۹۶ء کو مزار ذوق کے مقدمے کی سماعت ہوئی۔ بینچ میں جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس ایس۔ صغیر احمد شامل تھے۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے وکیل نے عدالت کو بتایا کہ یادگار ذوق کا نقشہ چار ہفتے میں تیار ہوجائے گا۔ عدالت نے حکم دیا کہ یہ نقشہ انجمن ترقی اردو (ہند) (ڈاکٹر خلیق انجم) دہلی اربن میں ایکشن اور ان تمام لوگوں کے مشوروں سے بنایا جائے جو اس معاملے سے متعلق رہے ہیں۔ (دستاویز ۳۳)

۱۹ رنومبر ۱۹۹۶ء کو مزار ذوق کے سلسلے میں سپریم کورٹ میں مقدمے کی سماعت ہوئی۔ جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس ایس۔ صغیر احمد بینچ میں شامل تھے۔

۱۸ رنومبر ۱۹۹۶ء کو عدالت نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو ہدایت دی تھی کہ وہ مقدمے کی اگلی سماعت پر یادگار ذوق کا نقشہ عدالت میں داخل کرے۔ عدالت نے ڈاکٹر خلیق انجم سے پوچھا کہ کیا نقشہ بناتے ہوئے آپ سے مشورہ لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے جواب دیا کہ یہ نقشہ انھوں نے اور کچھ اسکالروں نے ساتھ بیٹھ کر بنوایا ہے۔ (دستاویز ۳۴) ڈاکٹر خلیق انجم نے مزید کہا کہ اس سلسلے میں میری کچھ اور تجاویز تھیں جو میں نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو تحریری طور پر دے دی ہیں۔ (دستاویز ۳۵)

عدالت نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو ہدایت دی کہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ یادگار ذوق کے شایانِ شان ہو۔ عدالت کی کارروائی کی رپورٹ اردو کے بہت سے اخباروں میں شائع ہوئی۔ ''قومی آواز'' دہلی نے لکھا کہ ''آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے یادگار ذوق کا نقشہ عدالت میں پیش کردیا، جو نئی کریم میں اسی جگہ بنائی جائے گی۔ جہاں پہلے میونسپل کارپوریشن دہلی نے بیت الخلا تعمیر کردیا تھا۔ یہ یادگار انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کی سربراہی میں قائم کمیٹی کی نگرانی میں تعمیر ہوگی، جس میں فیروز بخت صاحب، ایم۔ حبیب خاں صاحب، شاہد ماہلی صاحب اور ڈاکٹر عقیل احمد شامل ہیں۔ جسٹس کلدیپ سنگھ کے استفسار پر ڈاکٹر خلیق انجم نے عدالت کو بتایا کہ وہ اس نقشے سے مطمئن ہیں اور یہ کہ انھوں نے نقشہ ساتھ بیٹھ کر بنوایا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے کچھ تجویزیں بھی لکھ کر دی ہیں۔ (دستاویز ۳۶)

روزنامہ ''عوام'' نئی دہلی نے سپریم کورٹ کا متعلقہ حکم بہت نمایاں طور پر شائع کیا۔ اخبار نے لکھا کہ ''عدالت کے حکم کے مطابق ڈاکٹر خلیق انجم تعمیر کی نگرانی کریں گے اور اُن کے ساتھ ایم۔ حبیب خاں، فیروز بخت احمد، جناب شاہد ماہلی اور ڈاکٹر عقیل احمد بھی رہیں گے۔ (دستاویز ۳۷)

ڈاکٹر خلیق انجم، شاہد ماہلی صاحب، ڈاکٹر عقیل احمد وغیرہ یادگار ذوق کی تعمیر کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ جب کامیابی نظر آنے لگی تو ایک دو حضرات نے ڈاکٹر خلیق انجم کے خلاف اخباروں میں خطوط شائع کرائے جن میں الزام لگایا گیا کہ وہ یادگار ذوق کی تعمیر کا کام اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ جب کہ سپریم کورٹ کی روداد یں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر خلیق انجم نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ یادگار ذوق کی تعمیر دہلی میونسپل کارپوریشن یا آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کرے۔ اس سلسلے میں جب کسی غلط فہمی کی وجہ سے فیروز بخت صاحب کا بھی خط ''قومی آواز'' میں شائع ہوا تو سپریم کورٹ کے ممتاز وکیل طاہر صدیقی صاحب کا ''قومی آواز'' میں مراسلہ شائع ہوا، جو خاصا طویل تھا۔ طاہر صاحب نے مزار غالب اور مزار ذوق کے سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم کی خدمات بیان کرتے ہوئے لکھا:

''مزار غالب پر چٹکیاں بڑی ہوئی تھیں۔ الخ.........''

مزار ذوق کے سلسلے میں طاہر صدیقی نے بتایا کہ کس طرح آدھے گھنٹے تک ڈاکٹر خلیق انجم نے سپریم کورٹ میں بحث کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مزار ذوق کو منہدم کر کے دہلی میونسپل کارپوریشن نے عوامی بیت الخلا بنا دیا ہے۔ طاہر صاحب نے مزید لکھا ہے کہ ''اردو والے طبقے کو اس بات کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے دہلی میونسپل کارپوریشن کے جھوٹ کی پول کھولی اور جناب جسٹس کلدیپ سنگھ اور جناب سید صغیر احمد کو اس سچائی سے مطمئن کیا کہ ذوق ساری عمر جو ہمارا ادبی لٹریچر کا حصہ ہیں کی جگہ پر ہے۔'' (دستاویز ۳۸)

۲۱ ستمبر ۱۹۹۸ء کو سپریم کورٹ میں مزار ذوق کے سلسلے میں سماعت ہوئی۔ بینچ میں جناب ایس۔ صغیر احمد اور جسٹس پی۔ این کرپال شامل تھے۔ ۱۸ مئی کو عدالت نے حکم دیا تھا کہ ڈاکٹر خلیق انجم کی چیئرمین شپ میں جو کمیٹی تشکیل کی گئی تھی۔ اس کو ہدایت دی جاتی ہے کہ اگلی پیشی پر تعمیر کے کام کے بارے میں رپورٹ پیش کرے۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے عدالت کو بتایا کہ وہ شاہد ماہلی صاحب اور ڈاکٹر عقیل احمد کے ساتھ یادگار ذوق کی تعمیر کا معائنہ کرنے گئے تھے۔ وہاں کام بہت سست رفتاری سے ہو رہا ہے۔ صرف ایک مزدور اور راج کام کر رہے ہیں۔ ۱۶ رنومبر کو شیخ محمد ابراہیم ذوق کی ۲۳۲ ویں برسی ہے۔ اس موقع پر انجمن ترقی اردو (ہند)، غالب انسٹی ٹیوٹ، ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، غالب اکیڈمی اور دوسرے ادارے مل کر ذوق کی برسی منائیں گے۔ اس موقع پر ایک سیمینار بھی منعقد ہوگا، جس میں شرکت کے لیے تمام ہندوستان سے اسکالرز کو مدعو کیا جا رہا ہے۔ (ا) ڈاکٹر خلیق انجم کے اس بیان کے بعد عدالت نے کہا کہ مزار ذوق کی تعمیر کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر خلیق انجم کے بیان کے مطابق ۱۶ رنومبر ۱۹۹۸ء کو مزار ذوق پر سیمینار منعقد ہوگا۔ اس لیے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ ۱۶ رنومبر تک تعمیر کا کام مکمل کردے تاکہ مزار ذوق پر سیمینار منعقد ہو سکے۔ (دستاویز ۳۹)

نامکمل۔

☆

اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

کنایت دہلوی (دہلی بھارت)

مجازؔ لکھنوی مرحوم کی حاضر جوابیاں اور لطیفے بہت مشہور ہیں۔ اس معاملے میں مجاز کی حیثیت ہی کچھ کریز لٹش کی تھی۔ کار شادونے ان کے لطیفے اکٹھا کر کے کتابی صورت میں شائع کیے تھے۔ مجاز کے بعد لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں ڈاکٹر خلیق انجم کا نام آتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کسی ایک شخص سے گفتگو کر رہے ہوں، چند افراد کی صحبت میں ہوں یا پبلک جلسے میں ہوں اپنی حاضر جوابی اور لطیف حسِ مزاح سے محفل کو زعفران زار بنائے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اتنے لطیفے اور حاضر جوابیاں مشہور ہیں کہ انھیں مرتب کیا جائے تو پوری کتاب بن جائے اگر ایسا ہو تو یہ کتاب اردو طنز و مزاح میں اہم اضافہ ہوگی۔

رفعت سروش صاحب جس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو کی اردو مجلس کے پروڈیوسر تھے تو انھوں نے انجم صاحب میں چھپے ہوئے مزاح نگار کو دریافت کر لیا تھا۔ انھوں نے ریڈیو کے لیے انجم صاحب سے بڑی تعداد میں مزاحیہ مضامین اور خاکے لکھوائے، جنھیں بہت پسند کیا گیا۔ افسوس کہ انجم صاحب نے ان مزاحیہ مضامین اور خاکوں کی نقلیں محفوظ نہیں رکھیں۔ انجم صاحب نے ساقی (کراچی) کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی کی فرمائش پر استاد رسا دہلوی اور علامہ انور صابری کے خاکے لکھے تھے جو ساقی میں شائع ہوئے تھے۔ یہ دونوں حضرات بزرگ اور قابلِ احترام تھے۔ ان کے مزاحیہ خاکے تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا۔ انجم صاحب اس امتحان سے بہت کامیابی سے گزر گئے۔ اب کچھ لطائف ملاحظہ ہوں:

☆

ایک دفعہ انجم صاحب "آثار الصنادید" کے لیے تصاویر لینے کے لیے دلّی کے جامع مسجد کالی کے مقبرے میں داخل ہو رہے تھے۔ بیگم انجم ساتھ تھیں۔ مقبرے میں داخل ہوئے تو دہلی کے ایک صاحب جو بہت معزز تھے اور پرائیویٹ کمپنی میں اعلا عہدے پر فائز تھے، ایک خاتون کے ساتھ مقبرے سے نکل رہے تھے۔ انجم صاحب اور بیگم انجم کو دیکھ کر نروس ہو گئے۔ دعا سلام ہوئی۔ اُن صاحب نے اپنے ہمراہ خاتون سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ meet my wife انجم صاحب اُن کی بیوی سے واقف تھے۔ دو تین دفعہ اُن سے مل چکے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ یہ خاتون اُن کی بیوی نہیں ہیں۔ انھوں نے بیگم انجم کا تعارف کراتے ہوئے برجستہ کہا and meet my girl friend۔ اس فقرے پر وہ صاحب اور بھی نروس ہو گئے۔ ہاتھ ملا کر تیز تیز قدموں سے اپنی کار کی طرف چلے گئے۔

☆

کنور مہندر سنگھ بیدی کی قیادت میں ہندوستانی ادیبوں کا ایک وفد پاکستان گیا ہوا تھا جس میں ڈاکٹر خلیق انجم اور ایک مشہور ادیب خاتون بھی تھیں۔ وفد کو مجو داڑو بھی لے جایا گیا۔ وہاں کے ڈائرکٹر مجو داڑو کی عمارتوں کا تعارف کرا رہے تھے۔ ایک چار دیواری میں بہت بڑا گول پتھر رکھا ہوا تھا۔ اس پتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈائرکٹر نے بتایا کہ اس پتھر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کی عبادت گاہ تھی۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی حسِ مزاح جاگ اٹھی۔ خاتون ادیب ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے آہستہ سے اُن کے کان میں کہا۔ آپ نے دیکھا مندر تو اتنا بڑا بنا دیا۔ ایک چھوٹی سی مسجد نہیں بنائی گئی۔ خاتون ادیب کو اس عہد کے لوگوں کے متعصبانہ رویے پر غصہ آ گیا۔ انھوں نے کنور مہندر سنگھ بیدی مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے زور سے کہا۔ کنور صاحب مندر تو بنا دیا اگر ایک مسجد بھی بنا دیتے تو کیا حرج تھا۔ کنور صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ بیگم صاحبہ جب یہ مندر بنا تھا تو اسلام کو وجود میں آنے میں چار ہزار سال تھے۔ زور کا قہقہہ لگا۔ خاتون ادیب نے خلیق صاحب کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ وہاں سے کھسک چکے تھے۔

☆

ایک دفعہ ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی صاحب کو کسی میٹنگ میں جانا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کو لینے ان کے دفتر گئے تو وہ دفتر کے کسی کام میں بہت مصروف تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ دیر انتظار کے بعد چلنے کے لیے کہا تو شاہد صاحب نے جواب دیا بس ابھی چلتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ دیر کے بعد پھر کہا۔ شاہد صاحب نے پھر وہی جواب دیا۔ تین چار دفعہ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کے ایک شعر میں تبدیلی کر کے یوں پڑھا

> اے شاہد ماہلی اس رزق سے تو موت اچھی
> جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

☆

ایک دفعہ ایک خاتون کے ہاتھ سے شیشے کا گلاس چھوٹ کر ٹوٹ گیا۔ انجم صاحب نے برجستہ مصرع کہا

> توڑ ڈالا گلاس شیشے کا

اس وقت انجم صاحب کے بہت عزیز دوست ہندی کے مشہور نقاد ڈاکٹر وشوا ناتھ ترپاٹھی بھی بیٹھے تھے۔ انھیں یہ مصرع پسند آیا۔ کہنے لگے اس پر مصرع لگاؤ اور مثالی کھاؤ۔ انجم صاحب نے فی البدیہہ ایک اور مصرع کہہ کر شعر پورا کر دیا۔

> کیسے ٹوٹا ہے دل دکھانے کو
> توڑ ڈالا گلاس شیشے کا

☆

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ڈاکٹر خلیق انجم پر "خلیق انجم ایک عملی

انسان" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا، جو ایم۔ حبیب خاں کی مرتبہ کتاب "ڈاکٹر ظلیق انجم: شخصیت اور ادبی خدمات" میں شامل ہے۔ پروفیسر آزاد نے انجم صاحب کے کچھ لطیفے بیان کیے ہیں جو بہت پر لطف ہیں۔ آپ بھی سن لیجیے:

☆

دلی کی جامع مسجد پر ایک چائے خانہ تھا۔ جہاں شام کو اردو ادیب اور شاعر اکٹھا ہوتے تھے۔ اس چائے خانے کا نام چنڈو خانہ پڑ گیا تھا۔ مدت کی بات ہے ظلیق انجم اپنے چند دوستوں کے ساتھ چنڈو خانے میں بیٹھے تھے۔ وہاں ایک ایسے دوست کا ذکر آ گیا جو مدت سے غائب تھا اور چنڈو خانے کے آس پاس کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ بات یہ تھی کہ ادھار چائے پینے کا بہت روپیہ اس کے ذمے نکلتا تھا۔ چنڈو خانے کے مالک نے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ شخص ایک مدت سے نظر نہیں آ رہا ہے۔ کسی نے کہا لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے اور مارا مارا پھر رہا ہے۔ بے ساختہ ظلیق انجم کی زبان سے نکلا۔

لیا تو کم ہوا ہے محبت میں ہار کے

مشتاق نے چکائے ہوں پیسے ادھار کے

☆

جامع مسجد پر مولانا سمیع اللہ کی دکان پر کچھ ادیب اور شاعر بیٹھے تھے۔ فراق کا ذکر ہو رہا تھا کسی نے کہا کہ فراق کا پورا نام رگھو پتی سہائے ہے۔ ظلیق انجم نے فوراً چار مصرع کہے۔

کب وہ دل کو جلائے تھا یارو

کب وہ آنسو بہائے تھا یارو

اس کو اردو نے کر دیا ہے فراق

ورنہ وہ تو سہائے تھا یارو

☆

ظلیق ایک دن کنور مہندر سنگھ بیدی سے کہنے لگے کہ آپ نے شعرا اور شاعرات کو اُس پر ایسے بٹھلایا ہے کہ شاعرات آپ کے قریب ہیں اور شعرا دور اور جب آپ کسی شاعر کو داد دیتے ہیں تو کسی خاتون شاعر کی پیٹھ پر تھپکی دے کر۔ ول تو یہی بات دادطلب ہے۔ اس سے بھی زیادہ دادطلب عمل آپ کی تھپکی دینے کا انداز ہے۔ آپ کا ہاتھ مرد شاعر کی پیٹھ پر کم دیر اور خاتون کی کمر پر زیادہ دیر تک رہتا ہے۔

☆

ایک سازش کرنے والے ادیب نے دعویٰ کیا کہ میں پٹھان ہوں۔ ظلیق انجم نے کہا کہ یہ بات غلط ہے۔ تم پٹھان نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ پٹھان سازش نہیں کرتا۔ وہ سامنے سے وار کرتا ہے۔ اس نے کہا ہمارا محلہ تو پٹھانوں کا ہے اس میں سب پٹھان رہتے ہیں۔ ظلیق انجم نے جواب میں کہا تمہارے محلے میں کوئی غیر پٹھان بھی رہتا ہوگا۔

☆

ایک دفعہ ظلیق انجم نے ایک شاعرہ کے مکان پر دستک دی۔ اندر سے شاعرہ کی گرج دار آواز آئی کون ہے اس وقت دستک دے رہا ہے۔ ظلیق نے فوراً اپنے حواس جمع کرتے ہوئے آواز بدل کر کہا لالہ جی نے بھیجا ہے۔ شاعرہ نے اسی غصے بھری آواز میں کہا کون لالہ جی۔ انھوں نے بہت اطمینان سے جواب دیا ہار کی قیمت لانے کے لیے۔ آپ کے شوہر نے ہار کی قیمت ابھی تک نہیں بھجوائی۔ دو ماہ قبل جھمکوں کی قیمت تو بھجوا دی تھی لیکن ہار کے دام ابھی تک نہیں بھجوائے۔ اب شاعرہ حیران کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ گھر میں نہ تو جھمکے آئے ہیں اور نہ ہار۔ ظلیق انجم تو لالہ جی کا پیغام دے کر وہاں سے چل دیے لیکن جب شوہر صاحب گھر واپس آئے ہوں گے تو......

☆

ظلیق انجم کے ایک دوست شیر کے شکار کے بہت شوقین تھے۔ لیکن شیر ہاتھ نہیں آتا تھا۔ یہ دوسرے جانور مار لاتے تھے۔ لیکن شیر کا شکار ان کے مقدر میں نہیں تھا۔ ایک دفعہ ان کے مقدر نے یاوری کی اور شیر کا شکار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے خوشی میں گھر والوں کو تار دیا۔ Lion killed اتفاق کی بات ہے کہ جب تار والا تار لے کر ان کے گھر پہنچا تو ظلیق انجم دروازے پر موجود تھے۔ انھوں نے تار والے سے تار لے کر پڑھا اسے جیب میں رکھا۔ دوسرے دن ایک شخص کو ان دوست کے گھر بھیجا کہ آپ کے صاحب خانہ نے دو ہزار روپے میں ہم سے پنجرے میں بند شیر خریدا تھا۔ ایک ہزار روپے دے دیا تھا اور ایک ہزار روپیہ باقی ہے وہ ادا کر دیجیے۔ وہ شخص تو یہ جواب سنا کر کہ ابھی صاحب خانہ واپس نہیں آئے لوٹ گیا۔ لیکن دو چار روز بعد جب صاحب خانہ شیر کی لاش لیے ہوئے اس توقع پر گھر پہنچے کہ مبارک باد ملے گی تو گھر والوں نے خوب مذاق اڑایا کہ پنجرے میں بند شیر کو گولی مار دی۔ جا کر فلاں شخص کو باقی ایک ہزار ادا کرو۔ وہ دوست پتا کرنے گئے۔ لگے اس شخص کو گالیاں دینے جس نے ان پر یہ بہتان لگایا تھا اور گالیوں کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ ظلیق انجم بھی ہمدردی کے طور پر ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور جس شخص نے یہ مذاق کیا تھا اسے برا بھلا کہتے رہے۔

☆

ایک دوست کے گھر میں محفل جمی تھی۔ تصدق حسین خالد کا ذکر آیا کسی نے کہا فلاں سن میں انتقال ہو گیا تھا۔ مالک رام صاحب بھی محفل میں موجود تھے۔ انھوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ اس سن سے پہلے میں نے وفیات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ میری تحریر کی وفیات میں تو ان کا ذکر نہیں ہے۔ ظلیق نے چھوٹتے ہی کہا وہ آپ کی زد سے نکل گئے تھے۔ وہ وفیات کے شروع ہونے سے ایک سال قبل ہی دنیا سے فرار ہو گئے۔

☆

کروڑی مل کالج میں ہندی کے ایک لیکچرر تھے وشوا ناتھ ترپاٹھی۔ انھوں نے اپنی ہندی کی کلاس میں طلبہ کو اردو پڑھانے کا انتظام اس خیال سے کر رکھا تھا کہ اچھی ہندی جاننے کے لیے اردو کا جاننا ضروری ہے۔ ایک دن خلیق انجم مصروف تھے۔ انھوں نے ترپاٹھی جی سے کہا کہ آج میری اردو کی کلاس آپ لے لیں۔ ترپاٹھی جی بولے۔ میں تو اردو بہت کم جانتا ہوں، اس لیے بہتر ہے کہ میں اردو پڑھاؤں۔ خلیق نے فوراً کہا کہ لیکن آپ ہندی بھی تو پڑھاتے ہیں

☆

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ایک مضمون میں لکھا ہے۔ پاکستان کے ایک سفر میں خلیق انجم اور میں اکٹھے تھے۔ دراصل ہم دونوں اردو مصنفین کے ایک ڈیلی گیشن کے رکن تھے جو پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی دعوت پر پاکستان گیا تھا۔ جس ہوٹل میں ہمارا قیام تھا۔ ڈاکٹر وحید عشرت مجھ سے ملنے آئے۔ خلیق انجم نیچے لابی میں تھے۔ ان سے انھوں نے پوچھا کہ آزاد کس کمرے میں ہیں۔ خلیق نے کمرے کا نمبر بتایا تو وہ میرے کمرے پر تشریف لائے۔ وہ میرے ان مضامین کا آفرپرنٹ بھی لائے تھے جو ''اقبال ریویو'' اور ''اقبالیات'' میں شائع ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہماری ڈیلی گیشن کو پروگرام کے مطابق ایک جگہ جانا تھا۔ میں، خلیق انجم اور ہندوستان کی ایک خاتون ادیب ہم تینوں ایک ہی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ خلیق نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر وحید عشرت آپ کے کمرے کا نمبر پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتا دیا تھا۔ میں نے کہا رحم نے بہت اچھی بات کی وہ میرے لیے میرے مضامین کی رائلٹی لائے تھے۔ اب یہاں شاپنگ میرے لیے آسان ہو گئی۔

خاتون ادیب کہنے لگیں۔ میری کتاب کا بھی ایک پبلشر یہاں ہے اس سے ملاقات ہو جاتی تو مجھے بھی رائلٹی مل جاتی۔ خلیق انجم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ آپا آپ اپنے پبلشر کی بات مت کیجیے۔ وہ یہاں آیا تھا۔ بہت غصے میں تھا اور آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ خاتون ادیب نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا کیا مطلب؟ غصے میں تھا اور مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ خلیق نے کہا کہ جی ہاں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے ان کی کتاب چھاپی اور نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب چھپنے کے چند دن کے بعد طلبہ نے مجھے گھیر لیا اور بھرے بازار میں میری پٹائی کر دی۔ خاتون ادیب نے خلیق انجم کی بات کا یقین کرتے ہوئے کہا۔ میں نے تھوڑا ہی اسے کتاب چھاپنے کے لیے کہا تھا اس نے خود چھاپی تھی۔

☆

خلیق انجم کی بذلہ سنجی اور شگفتہ بیانی کا ذکر چل نکلا تو کچھ اور دلچسپ واقعات سن لیجیے۔ کچھ سال ہوئے ایک ادیب کو ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ ملا جس پر بعض لوگوں کو اختلاف تھا۔ خود خلیق انجم بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ادیب انعام کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ انعام اسے دے کر ساہتیہ اکیڈمی کے وقار میں کمی آئی ہے۔ اب لطیفہ سنیے:

خلیق انجم کی ایک ایسے ادیب سے بحث ہو گئی جس نے ان کی ایک کتاب پر بے جا تنقید کی تھی اور اس بحث میں نوبت چیخ و پکار کو پہنچ گئی۔ خلیق انجم نے بہت اونچی آواز میں غصے ہو کر کہا کہ آپ نے میرے خلاف جو کچھ لکھا ہے میں اس کا بدلہ لیا چاہتا ہوں کہ آپ کا پورا خاندان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ آنے والی نسلیں آپ کے نام سے شرمائیں۔ ان صاحب نے انتہائی غصے میں کہا کہ آپ میرا کیا کر لیجیے۔ خلیق انجم نے اسی غصے کے لہجے میں جواب دیا کہ میں آپ کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ دلوا دوں گا۔ اس فقرے پر بڑے زور کا قہقہہ لگا اور محفل زعفران زار ہو گئی۔

☆

حال ہی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام قاضی عبدالغفار پر سیمینار منعقد ہوا۔ خلیق صاحب نے مقالے پڑھنے کے لیے جن لوگوں کو دعوت دی تھی ان میں دلی کی ایک خاتون بھی تھیں۔ ان خاتون کو قاضی صاحب کی ''لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری'' کے موضوع پر مقالہ لکھنا تھا۔ ایک دن ہم لوگ ''اردو گھر'' میں خلیق انجم کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ خاتون آ گئیں، انھوں نے بیٹھتے ہی کہا کہ آپ نے مجھے ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''مجنوں کی ڈائری'' پر مقالہ لکھنے کے لیے کہا ہے۔ یہ دونوں کتابیں کسی لائبریری میں نہیں ملتیں۔ آپ نے مجھے لیلیٰ مجنوں کے چکر میں کیوں ڈال دیا۔ خلیق انجم نے برجستہ جواب دیا کہ ''دل کی بات کہنے کا اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا۔''

☆

تین چار سال کی بات ہے کہ ایک سفارت خانے میں بوفے ڈنر تھا۔ لوگ ہاتھوں میں پلیٹیں لیے چار چار پانچ پانچ کے گروہ بنائے کھانا کھا رہے تھے۔ خلیق انجم ایک گروہ میں کھڑے حسب عادت اپنی شگفتہ بیانی سے لوگوں کو ہنسا رہے تھے۔ اچانک ایک اجنبی صاحب ہاتھ میں پلیٹ لیے اس گروہ میں شریک ہو گئے۔ ایک دو منٹ تو خاموش رہے اور پھر جو انھوں نے بولنا شروع کیا ہے تو خاموش ہونے کا نام نہیں لیا۔ ایک دفعہ سانس لینے کے لیے رکے تو خلیق انجم نے ان صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ معاف کیجیے گا میں آپ سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ آپ ممبر آف پارلیمنٹ ہیں۔ ان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ کا خیال صحیح ہے لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ خلیق انجم نے جواب دیا کہ آپ اتنی دیر سے ایسی باتیں کر رہے ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں ''پھر آپ اپنی کہے جا رہے ہیں اور کسی کی نہیں سن رہے ہیں۔'' اس پر بڑے زور کا قہقہہ لگا اور وہ صاحب شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

☆

ڈیڑھ دو سال پہلے ڈاکٹر خلیق انجم کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ جس کی

وجہ سے پاؤں کی ہڈی میں فریکچر ہو گیا جب پلاسٹر بندھ گیا تو ڈاکٹر نے ہدایت دی کہ آپ پاؤں زمین پر نہ رکھیں۔ پلاسٹر بندھنے کی وجہ سے خلیق کو بہت تکلیف ہو رہی تھی اور وہ تھوڑی دیر میں کراہ رہے تھے۔ لیکن حسِ مزاح اب بھی برقرار تھی کہنے لگے ڈاکٹر صاحب دشمنوں اور دوستوں کو ہمیشہ مجھ سے یہی شکایت رہی ہے کہ میں پاؤں زمین پر نہیں رکھتا۔ اتنی تکلیف میں بھی دوسروں کو ہنسانے کے لیے بہت بڑا دل گردہ چاہیے۔

☆

ایک ادبی جلسے میں ایک ادیب نے کسی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے بے وجہ انجمن ترقی اردو (ہند) پر الزام کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ صاحب تقریر کر کے بیٹھے تو خلیق انجم جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے کہنے لگے حضرات آپ کے علم میں ہوگا کہ جامع مسجد سے حوض قاضی تک سواری کی رکشائیں چلتی ہیں۔ کسی زمانے میں رکشا والے چار آنے فی سواری لیتے تھے۔ ایک دن میرے ایک دوست کو جلدی تھی وہ رکشا میں بیٹھ گئے اور دوسری سواری کا انتظار کیے بغیر انھوں نے رکشا والے سے چلنے کے لیے کہا۔ جب رکشا حوض قاضی پہنچی اور میرے دوست رکشا سے اترے تو رکشا والے نے انھیں اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ کالی شیروانی، سفید براق چوڑی دار پاجامہ، پالش کیے ہوئے چمکتے ہوئے جوتے۔ چوں کہ وہ رکشا میں اکیلے آئے تھے اس لیے انھیں دو سواریوں کے آٹھ آنے دینے تھے۔ رکشا والے نے ان صاحب کو دیکھ کر دو روپے مانگے۔ انھوں نے آٹھ آنے دینا چاہے۔ رکشا والا نہیں مانا دونوں میں تکرار ہو گئی۔ میرے دوست کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے شیروانی اتار کر رکشا پر ڈالی اور غصے میں کہا کہ "اب اگر ہم نے شیروانی پہن لی ہے تو تو سمجھتا ہے کہ ہم شریف آدمی ہیں۔" رکشا والا ڈر گیا اور آٹھ آنے لے کر خاموشی سے چلا گیا۔ یہ واقعہ سنا کر خلیق انجم نے کہا کہ حضرات میں اب اپنی شیروانی رکشا پر ڈالتا ہوں۔ ہال قہقہوں سے گونج اٹھا لیکن خلیق انجم تو غصے میں تھے۔ انھوں نے بیس منٹ تک اپنے شعلہ نوائی کے جوہر دکھائے۔

☆

اردو کے ایک مشہور مصنف نے اردو تحقیق کے موضوع پر ایک کتاب لکھی اور تبصرے کے لیے "ہماری زبان" کے دفتر میں کتاب بھجوائی۔ کتاب میں فارسی کے ادق الفاظ استعمال کرنے سے زبان اتنی مشکل ہو گئی تھی کہ عام طالب علم کے لیے اس کا سمجھنا مشکل تھا۔ کچھ عرصہ تک جب تبصرہ شائع نہیں ہوا تو مصنف نے تقاضا کیا اس پر خلیق انجم نے جواب دیا۔

"بھئی کیا کروں، موجودہ صورت میں یہ کتاب میری سمجھ میں نہیں آتی۔ لہٰذا اس کا اردو میں ترجمہ کر دیں تو بصد شوق تبصرہ کروں گا۔"

☆

جشن کرنے کے سلسلے میں چندی گڑھ کے پنجاب راج بھون میں تقریب ہو رہی تھی۔ ملنگ ساقی نے جب خلیق انجم سے ذکر کیا کہ گورنر صاحب ڈاکٹر صاحب کے قریبی رشتہ دار ہیں تو خلیق صاحب نے جواب دیا:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ گورنر صاحب تو بہت پڑھے لکھے شریف اور مہذب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

☆

خواجہ حسن ثانی نظامی ڈاکٹر خلیق انجم کو اخبار دکھاتے ہوئے کہنے لگے:

"آپ نے پڑھا کہ فلاں وزیر نے کل پارلیمنٹ میں میر کا شعر پڑھا تھا۔ غالباً پچھلے پچاس سال کے دوران پارلیمنٹ میں پہلی دفعہ کوئی معقول شعر پڑھا گیا ہے۔"

انجم صاحب نے برجستہ کہا:

"آپ بجا فرماتے ہیں۔ اس سے پہلے تو غالب اور اقبال ہی کے شعر پڑھے جاتے تھے۔"

☆

ایک بوفے ڈنر میں اردو کے ایک مشہور ادیب ایک گروپ میں کھڑے تھے۔ اس گروپ میں ان کی بیوی بھی تھیں۔ برابر میں ایک اور گروپ کھڑا تھا، جس میں ایک انتہائی خوب صورت خاتون تھیں۔ مشہور ادیب اپنی بیوی کی نگاہیں بچا کر دوسرے گروپ کی خوب صورت خاتون کو بار بار دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ادیب کے پاس گئے۔ چپکے سے اُن کے کان میں مجروح کا مصرع پڑھا

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

ڈاکٹر صاحب کی بات سن کر وہ صاحب گھبرا گئے۔

☆

بھوپال کے پروفیسر آفاق احمد کسی کام سے دہلی آئے ہوئے تھے۔ انجم صاحب سے بھی ملے۔ چند روز بعد بھوپال میں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم بھوپال گئے ہوئے تھے۔ چائے کے وقفے میں پروفیسر آفاق احمد اپنی بیگم کے ساتھ ڈاکٹر خلیق انجم سے ملے اور بیگم سے تعارف کرایا۔ انجم صاحب بڑی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بیگم صاحبہ کو تکنے لگے۔ آفاق صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا کیا بات ہے آپ میری بیگم کو اس طرح کیوں گھور رہے ہیں۔ انجم صاحب نے بڑی معصومیت سے کہا 'پچھلے دنوں آپ جن خاتون کے ساتھ دلی میں میرے دفتر آئے تھے وہ تو بہت کم عمر تھیں اور آپ نے انھیں اپنی بیوی بتایا تھا۔' یہ کہہ کر انجم صاحب تو وہاں سے چلے گئے اور کسی اور سے بات کرنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ دوسرے دن انجم صاحب کو بیگم آفاق کے سامنے حلفیہ بیان دینا پڑا کہ یہ محض مذاق تھا۔

مورخین کا خیال ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں ٹیپو سلطان کی شکست نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اس فتح کے بعد کمپنی پہلے سے کہیں زیادہ طاقت ور ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں پر آہستہ آہستہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہونے لگا۔ ۱۸۰۳ء میں دہلی میں مغل حکومت کے سرپرست مرہٹوں کو لارڈ لیک کے ہاتھوں شکست نے پورے ہندوستان پر کمپنی کا تسلط تقریباً طے کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر مغل حکومت کی عظیم الشان تاریخ کا آخری باب بن گئے۔ ناکام انقلاب کے بعد مسلسل ناکامیوں، سیاسی اور اقتصادی تباہی نے مسلمانوں کی قوتِ عمل سلب کر لی تھی۔ تقلیدی رویوں، مایوسی اور احساسِ ناکامی کی وجہ سے ہندوستانی ذہن و فکر میں ایسا جمود آیا جس کی ہندوستان کی مسلم تاریخ میں کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی۔ ایک طرف مسلمانوں کی یہ حالت تھی اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان پر مکمل اقتدار حاصل کر کے تقریباً نصف صدی پہلے ہندوستان کی علمی، تہذیبی اور سماجی زندگی پر اپنی برتری قائم کرنا شروع کر دی تھی۔ اس سلسلے کی پہلی کوشش فورٹ ولیم کالج کی شکل میں نظر آتی ہے۔ مغربی تعلیم کے ادارے قائم کیے گئے اور مشرقی علوم کے بعض مدرسوں میں انگریزی بطور ایک مضمون کے پڑھائی جانے لگی۔ انگریزی حکومت مسلمانوں کو اپنے سے کمتر ہی نہیں انتہائی قابلِ رحم، پسماندہ سمجھتی تھی اور ان کے مذہب اسلام کو بے وقعت کی راگنی ثابت کرنے پر لگے ہوئے تھے۔

برطانوی سامراج کے خلاف شاہ ولی اللہ اور سید احمد بریلوی جیسے بزرگوں نے جو تحریکیں شروع کیں وہ مادی اعتبار سے ترقی یافتہ قوم کی فوجی اور انتظامی طاقت کے مقابلے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہو سکیں۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان تحریکوں کے چلانے والی ایسی مذہبی شخصیتیں تھیں جو مادیت سے زیادہ روحانیت پر زور دے رہی تھیں اور برطانوی حکومت جیسی زبردست طاقت سے لڑنے کے لیے روحانیت کی نہیں مادی طاقت کی ضرورت تھی۔ انگریزوں نے جس طرح ہندوستانی تعلیم، تہذیبی اور سماجی زندگی پر اپنی برتری قائم کی۔ تعلیمی اور تہذیبی بنیاد ہندوستانیوں اور خاص طور سے مسلمانوں کو ذلیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے، اس کا قدرتی ردِ عمل یہ تھا کہ ایسے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو برطانوی حکومت اور اپنے ساتھ صنعتی انقلاب کے پیدا کردہ نظام اقدار، نئی تعلیم، تہذیب و تمدن اور طرزِ زندگی سے نفرت کرنے لگے۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ مشرقی اقدار، تہذیب اور ہندوستانی سماجی زندگی کو مغربی تہذیب سے برتر سمجھتا تھا۔

ہندوستان کے ہندو، مسلمانوں سے بہت پہلے بیدار ہو چکے تھے۔ ہندوؤں میں سوامی وویکانند، راجہ رام موہن رائے، کیشو چندر، ودیا ساگر، رانا ڈے، سوامی دیانند سرسوتی جیسے مفکر پیدا ہو چکے تھے۔ ان میں سے بیشتر کو مغربی تعلیم نے روشن دماغ بنا دیا تھا۔ انھوں نے ہندوستانی سماج میں اونچ نیچ، بے ہودہ رسم و رواج اور ستی جیسی رسم کے خلاف آواز بلند کی اور ہندوؤں کو مغربی تعلیم حاصل کرنے کی ایسی ترغیب دی کہ بہت جلد ہندوؤں کا ایک بہت بڑا طبقہ مغربی تعلیم سے بہرہ ور ہو گیا اور ہندوستان کی انتظامی مشینری میں بڑے پیمانے پر داخل ہو گیا۔ تاریخ نے مسلمانوں کو بتایا تھا کہ عرب فاتحین نے جب اسپین میں قدم رکھا تو یورپ جہالت کے اندھیروں میں گم تھا۔ ان فاتحین نے علم و دانش اور تہذیب و تمدن میں اتنی ترقی کی کہ اپنے محسنوں کو بھی فراموش کر بیٹھے۔ دراصل ہندوستانی مسلم علما کا یہ احساس غلط نہیں تھا کہ یورپ میں علم و سائنس کی مشعل مسلمانوں کی روشن کی ہوئی تھی مگر اب حالات بدل چکے تھے۔ صنعتی انقلاب نے یورپ کے علوم، سائنس اور ٹکنالوجی کو اتنی بڑی طاقت بخش دی تھی کہ وہ دنیا کے پسماندہ ملکوں پر حکمران کی حیثیت سے چھا گیا۔ اس طاقت کے بل پر اسے یہ حق مل گیا تھا کہ وہ مشرق اور پسماندہ ممالک کی ہر شے کو اپنی تہذیب، تمدن، اقتصادی اور فوجی طاقت کے مقابلے میں کمتر سمجھے۔

کچھ مسلمان مفکر، مدبر اور ریفارمر جو پیدا ہوئے تھے، ان میں شاہ ولی اللہ اور سید احمد بریلوی جیسی اہم شخصیتوں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ہندوستانی، برطانوی سامراج کے ظلم و ستم سے بخوبی واقف تھے۔ یہ لوگ اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ ہندوستان کی اقتصادی بدحالی اسی برطانوی سامراج کی لائی ہوئی ہے۔

دانشوروں کے ایک طبقے نے مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ سے واقف کرانے کے لیے اسلام کی عظیم شخصیتوں کی سوانح عمریاں لکھیں۔ شبلی نے 'المامون'، 'الفاروق' اور 'الغزالی' کے سوانح لکھے۔ اس کے برعکس روشن خیال مولانا الطاف حسین حالی نے سرسید تحریک سے متاثر ہو کر شیخ سعدی، غالب اور سرسید جیسی سیکولر شخصیتوں سے قوم کو روشناس کرانے کی کوشش کی لیکن جس مقصد سے یہ سوانح عمریاں لکھی گئی تھیں، ان میں کچھ حد تک تو کامیابی ہوئی لیکن یہ سوئی ہوئی قوم کو جگانے میں کوئی اہم رول ادا نہیں کر سکیں۔ ایسے وقت میں مسلمانوں میں ایک عظیم رہنما سرسید پیدا ہوئے۔ وہ اپنے پیش رو مسلم ریفارمروں کے مقابلے میں حالات کو بہتر طریقے سے سمجھتے تھے۔

سرسید کا چونکہ انگریزوں سے قریبی تعلق رہا تھا، اس لیے ممکن نہیں ہے کہ تجسس ذہن اور دور رس نظر رکھنے والے سرسید نے اس موضوع پر ان سے تبادلۂ خیال نہ کیا ہو۔ تعلیمی، تہذیبی اور سماجی پسماندگی کا انگریزوں کی نظر میں واحد علاج وہی تھا جو انھوں نے اپنے ملک میں کیا تھا۔ وہاں انھوں نے اقتصادی ترقی کے لیے تمام مذہبی اور اخلاقی اقدار سے روگردانی کر کے ایک نیا نظام بنا لیا تھا جس میں مذہبی اقدار کی اہمیت تو تھی لیکن بہت کم۔ روحانیت کے مقابلے میں سارا زور مادیت پر تھا، اس لیے سرسید کو یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کے تعلیمی

اقتصادی، تہذیبی اور اخلاقی حالات کو بہتر بنانے کا واحد راستہ مغربی تعلیم ہے۔

سرسید اپریل ۱۸۵۸ء میں بجنور سے صدرالصدور کے عہدے پر ترقی پا کر مرادآباد پہنچے۔ چوں کہ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ قوم کی ترقی کا علاج صرف تعلیم ہے اس لیے اُنھوں نے ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا لیکن بہت جلد اُنھیں یہ احساس ہوگیا کہ مسلمانوں کا علاج مشرقی تعلیم نہیں مغربی تعلیم ہے۔ جب سرجان اسٹریچی کلکٹر مقرر ہوکر مرادآباد آئے تو اُنھوں نے اس شہر میں ایک تحصیلی مدرسہ قائم کیا، جس میں مشرقی تعلیم کے ساتھ مغربی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ یہ ممکن نہیں کہ سرسید کی اسٹریچی سے تعلیم کے مسئلہ پر گفتگو نہ ہوئی ہو۔ سرسید اسٹریچی کے خیالات سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے اپنا فارسی مدرسہ اسٹریچی کے قائم کیے ہوئے تحصیلی مدرسے میں ضم کردیا۔ ۱۸۶۲ء میں سرسید کا مرادآباد سے غازی پور میں تبادلہ ہوگیا۔ اسی سال اُنھوں نے غازی پور میں بھی ایک مدرسہ قائم کیا مگر اس مدرسے میں صرف فارسی اور عربی کی تعلیم ہی کا انتظام نہیں تھا بلکہ انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت پانچ زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ مدرسہ قائم تو ہوگیا تھا اور اس کا نصاب بھی تیار ہوگیا لیکن سرسید اس نصاب سے مطمئن نہیں تھے۔ اُنھیں شدت سے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ مسلمانوں کا علاج محض مشرقی زبانوں کا مطالعہ ہی نہیں بلکہ اُن کا علاج وہ مغربی تعلیم ہے جس سے علمی صلاحیتوں کے ساتھ مسلمانوں میں اقتصادی حالات کو بھی بہتر بنایا جاسکے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کا واحد ذریعہ مغربی تعلیم ہے۔ سرسید مسلمانوں کی تباہی اور بربادی پر غور کررہے تھے اور بہتر راستہ بنانے کے لیے راستے کی دشواریوں کا اندازہ لگا رہے تھے کہ اُنھیں دنوں میں ایک واقعہ یہ ہوا کہ اسلام کے خلاف چار جلدوں میں ولیم میور کی کتاب "Life Of Prophet Mohammed" شائع ہوئی جسے پڑھ کر سرسید کو سخت ذہنی تکلیف ہوئی۔ اس کتاب کا جواب لکھنے کے لیے ہندوستان میں اب وہ کتابیں نہیں تھیں جن کی ضرورت تھی۔ اس لیے ۱۸۵۷ء میں مشرقی تعلیم کے بیش بہا کتب خانوں کو نذرِ آتش کردیا گیا تھا۔ ولیم میور کا جواب لکھنے کے لیے سرسید لندن پہنچے۔ وہاں اُنھوں نے مغربی تہذیب کی لائی ہوئی مادی ترقیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اُنھیں ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے لیے روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔ لندن میں سرسید نے مغربی انداز سے ایک اسکول قائم کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا اور مسلمانوں کے اخلاق، معاشرت، عادات و اطوار اور رسم و رواج، تعلیمی اور تہذیبی زندگی کے رویّوں میں اِصلاح کے لیے لندن ہی میں سرسید نے تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا بلکہ اس کی تھوڑی بہت تیاری بھی کرلی تھی۔

ہندوستان آتے ہی اُنھوں نے تہذیب الاخلاق نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے سے سرسید کو زبردست فائدہ اور زبردست نقصان ہوا۔ فائدہ یہ ہوا کہ چوں کہ تہذیب الاخلاق پورے ہندوستان میں پڑھا جاتا تھا، اس لیے اس رسالے میں سرسید کی تحریروں سے متاثر ہوکر پورے ہندوستان میں مغربی انداز کے اسکولوں کا جال بچھ گیا۔ نقصان یہ ہوا کہ اس کے دو تین شمارے ہی شائع ہوئے تھے کہ کچھ مسلمانوں اور خاص طور سے مولویوں کی طرف سے سرسید کے خلاف مخالفت کا طوفان کھڑا ہوگیا۔ کیا کیا الزام تھے جو سرسید پر نہیں لگائے گئے۔ اُنھیں وطن دشمن کہا گیا۔ کہا گیا کہ وہ کرسٹان ہوگئے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ انگریزوں کے عشق میں آکر وہ اسلام کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہوگئے ہیں۔

سرسید نے تہذیب الاخلاق کے مضامین میں دین اور دنیا دونوں کے معاملات میں سائنس اور منطقی فکر کو کسی حد تک اہمیت دی تھی جو علما اور مولویوں کے بہت بڑے طبقے کو ناگوار گزرا۔ بقول حالی جو باتیں مسلمانوں کی دنیوی ترقی میں مانع تھیں، سرسید کی نظر میں اُن کا تعلق مذہب سے تھا۔ سرسید نے اصلاحِ مذہب کے بارے میں تو مغربی تعلیم، تہذیب و تمدن کی مبالغہ آمیز مدح سرائی کی، اس سے مخالفت کی آگ بہت زیادہ بھڑک گئی۔ تہذیب الاخلاق کے جواب میں کان پور سے نورالآفاق اور نورالانوار نام سے دو رسالے جاری ہوئے، جن کا مقصد محض سرسید اور اُن کی تحریک کی مخالفت اور اُس کا مضحکہ اُڑانا تھا۔ اس زمانے میں اہلِ حدیث کا ایک رسالہ نکلتا تھا جس کا نام تھا 'رسالۂ اشاعتِ السنہ' (Risala-e-Ashaat-e-Al-Sitta) اس میں دوسرے مضامین کے ساتھ سرسید کی مخالفت میں بھی بہت سے مضامین ہوتے۔

سرسید پر کفر کے فتوے جاری کیے گئے جس کا کم پڑھے لوگوں اور جاہل مسلمانوں پر بہت برا اثر پڑا۔ سرسید جو مدرسہ قائم کرنا چاہتے تھے اور جس کی منصوبہ بندی اُنھوں نے لندن میں کی تھی جب وہ ہندوستان میں اسے عملی روپ دینے لگے تو بے انتہا مخالفت ہوئی۔ سرسید آہنی عزم کے مالک تھے وہ تہذیب الاخلاق میں مغربی انداز میں مغربی تعلیم کی حمایت میں مضامین مسلسل لکھتے رہے اور اُس کے ساتھ ہی وہ مغربی انداز کا ایک مدرسہ قائم کرنے کی بھی تیاری کرتے رہے۔ بالآخر وہ علی گڑھ میں ۱۸۷۵ء میں مغربی انداز کا اسکول قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے جس نے پہلے کالج اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کرلی۔

یوں تو اُس دور کی بہت سی اہم شخصیتوں نے سرسید کی تعلیمی تحریک کی مخالفت کی لیکن اُس دور کی دو اہم شخصیتیں ایسی تھیں جنھوں نے سرسید تحریک کی خاص مخالفت کی۔ اُن میں دو نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ نظم میں اکبر الہ آبادی اپنے طنز و مزاح کے تیر و نشتر لے کر میدان میں آئے، جن کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے نثر کے ذریعے یہ مورچہ سنبھالا۔اُن کا ناول 'ابن الوقت' اردو کا پہلا ناول ہے جس نے مشرقی اور مغربی تہذیب کی آویزش کی تصویر کھینچی ہے۔ابن الوقت میں نذیر احمد نے لکھا ہے کہ:

''اے عقل کے دشمنو! انگریزوں کی وہ صفتیں دوسری ہیں جو اُن کی ترقی کا سبب ہوئی ہیں۔محنت، جفاکشی، تجسّس و تلاش، استقلال، ضبط اوقات، علوم جدیدہ میں توغّل اور قومی اتفاق۔''

انگریزی علم و ادب اور مغربی تہذیب نے ایک نئی نسل پیدا کر دی تھی۔ڈپٹی نذیر احمد نے اس نسل کی عقلیت پسندی، نئی روایتوں کو اپنانے، مذہب سے بے بہرہ ہونے پر تنقیدی خیالات کا اظہار کیا۔نذیر احمد نے اپنے ناول ابن الوقت میں ابن الوقت اور حجۃ الاسلام کے درمیان جو بحث کرائی ہے اُس کا نچوڑ یہ ہے کہ حجۃ الاسلام کا کردار خود نذیر احمد کا کردار ہے۔ابن الوقت عقلیت پرست اور نئی مغربی تہذیب کے حامی ہیں۔حجۃ الاسلام کو یہ زبردست احساس ہے کہ مغربی تعلیم نے مسلمانوں سے اُن کا مذہب چھین کر اُن کو لادین بنا دیا ہے اور یہ بات لکی ہے جو نذیر احمد کو کسی طرح گوارا نہیں تھی۔نذیر احمد جدید تعلیم کے نہیں بلکہ جدید تعلیم کے ذریعے داخل ہونے والی لامذہبیت، بے دینی اور مشرقی روایتوں سے انحراف کے خلاف تھے۔'ابن الوقت' اردو کا نہیں ہندوستان کا واحد ناول ہے جس میں مغربی تہذیب کی لائی ہوئی لعنتوں کی کھل کر نشان دہی کی گئی ہے۔

یہاں بتانا ضروری ہے کہ یہ رویہ نذیر احمد کا ہی نہیں تھا بلکہ علامہ شبلی، مولانا حالی، علامہ اقبال اور بعد کے لوگوں میں مولانا حسرت موہانی، سید سلیمان ندوی اور مولانا ظفر علی خاں بھی یہی سوچتے تھے کہ جدید تعلیم ہمارے لیے لازمی ہے لیکن ان علوم کی وجہ سے ہم اپنی مشرقی روایتوں سے منحرف نہیں ہو سکتے۔

شبلی نے 'سفرنامۂ روم و مصر و شام' میں ایک جگہ اپنا یہ عقیدہ بیان کیا ہے وہ مشرقی تعلیم سے مطمئن نہیں ہیں بقول اُن کے:

''میرا خیال ہے کہ میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی تعلیم میں کو ترقی کر کے کسی رتبہ پر پہنچ جائیں لیکن جب تک اُن پر مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو، اُن کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جا سکتی۔بے شبہ مشرقی تعلیم کی موجودہ اسکیم نہایت ابتر اور غیر ضروری ہے لیکن اس تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں۔جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت اور تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔''

اکبر الہ آبادی کی فکر اور سوچنے کا انداز بھی عام مسلم دانشوروں سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔وہ جدید تعلیم کے مخالف نہیں تھے، اس لیے اُنھوں نے خود اپنے بیٹے کو تعلیم پانے کے لیے لندن بھیجا تھا۔ہاں وہ اس کے خلاف تھے کہ مغرب کی اندھا دھند تقلید میں عام ہندوستانی مسلمان اپنے تشخص اور انفرادیت کو کھو رہے ہیں۔وہ سرسید تحریک کے خلاف تیر و نشتر کا ہتھیار لے کر میدان میں اتر پڑے۔اُن کا طنز و مزاح محض مذاق یا وقت گزاری کے لیے نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک بنیادی مقصد تھا۔یہ مقصد اکبر نے خود ایک جگہ بیان کیا ہے۔

اکبر اپنے طنز و مزاح کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہماری قوم اس قدر غافل اور مجہول ہو گئی ہے کہ اگر میں مسلمانوں کو دو روپے کی تنخواہ یا مذہبی کتاب پڑھنے کو دوں اور اس کتاب کے مفید ہونے کا یقین دلا دوں تب بھی مسلمان اسے پڑھنے کو تیار نہیں ہوں گے اور یہ ہے کہ میں اپنے کلام کو ظرافت کی چاشنی سے مرغوب تر بنا دیتا ہوں تا کہ لوگ ہنس کر اس طرف متوجہ ہوں اور پھر غور کریں۔''

اکبر نے سرسید تحریک کا دل کھول کر مضحکہ اڑایا ہے لیکن اُنھوں نے سرسید کی ذات کے خلاف کبھی ایک لفظ نہیں کہا۔جب سرسید پر کفر کے فتوے عائد کیے جا رہے تھے تو اکبر کو یہ فتوے بازی پسند نہیں آئی۔اکبر نے کہیں علی گڑھ کا نام لے کر براہِ راست اور کہیں محض کالج کہہ کر علی گڑھ کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔یہ شعر ملاحظہ ہو:

کالج و اسکول و یونی ورسٹی
قوم بے چاری اسی میں مر گئی
نظر ان کی رہی کالج کے بس علمی فوائد پر
گرائیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر
سید اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا
ہے یہی بہتر علی گڑھ جا کے سید سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجیے مجھ کو مسلماں کیجیے

ان اشعار میں اکبر نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ علی گڑھ جو جدید تعلیم کا مرکز ہے ہمیں مذہب سے دور کر رہا ہے لیکن کبھی کبھی اُنھوں نے علی گڑھ پر جو طنز کیا ہے وہ صرف لفظوں کا کھیل ہے اس کے پیچھے کوئی بنیادی فکر نہیں ہے۔یہ قطعہ ملاحظہ ہو:

ابتدا کی جناب سید نے
جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونی ورسٹی پہ ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا

علی گڑھ پر ایک اور قطعہ ملاحظہ ہو:

بزرگانِ ملت نے کی ہے توجہ

کی پہ رہیں گے نہ عالم نہ عابد
ترقی دیں ہوگی اب روز افزوں
علی گڑھ کا کالج ہے لندن کی مسجد

مغربی تعلیم کے سلسلے میں عام خیال تھا کہ اس تعلیم کو پانے والوں کو بہت جلد ملازمت مل جاتی ہے۔ بالکل ابتدا میں ایسا ہوا بھی تھا جب انگریزوں کو حکومت چلانے کے لیے اسکولوں اور کالجوں میں ایسے کلرکوں کی بڑی کھیپ درکار تھی جو مغربی تعلیم سے واقف ہوں۔ مگر بعد میں صرف انگریزی جاننے کی بنیاد پر ملازمت ملنا مشکل ہوگیا۔ اکبر اس صورتِ حال کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ٹوٹا دیا ہر اِک کو مغرب نے پاس کرکے
سید بھی کورے کھسکے برسوں مساس کرکے
وضعِ مغرب سے مجھے کچھ بھی تسلی نہ ہوئی
ناز تو بڑھ گئے دولت کی ترقی نہ ہوئی

سرسید کے عہد کے دانشور علی گڑھ تحریک کے بارے میں جو سوچتے تھے، اُس کا تفصیل سے ذکر کیا جاچکا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک طرف تو مغرب نے ہندوستان کی ترقی اور فروغ کے امکانات پیدا کیے اور دوسری طرف مغربی تعلیم اور تہذیب نے نئی نسل کی آنکھوں کو اس طرح خیرہ کردیا کہ اسلام کی ہزار سالہ عظیم الشان تاریخ اور اسلامی اقدار اُن کی نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ اکبر مذہب کو نئی سماجی اور فکری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے برعکس سرسید نے کچھ اس طرح کی تعلیم کا انتظام کیا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

اکبر نے نہ صرف مغربی تہذیب اور اُس کے لائے نظامِ اقدار کا مذاق اُڑایا بلکہ اگر اسلام درمیان میں آگیا تو سرکاری ملازم ہونے کے باوجود انھوں نے انگریزوں کو بھی اپنے طنز کے نشتروں کا شکار بنایا۔ عیسائی کہتے تھے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ اس کا جواب اکبر نے اس قطعہ میں دیا ہے:

اپنے عیبوں کی نہ کچھ فکر نہ ہے کچھ پروا
غلط الزام بس اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

اکبر نے ریل، اخبار، گزٹ، پائپ، مشنری، ووٹ، بوٹ وغیرہ کو اپنے طنز کا شکار بنایا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اکبر نے ایسے اشعار صرف مغرب دشمنی میں کہے ہیں حالاں کہ یہ حقیقت نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اکبر اس حقیقت سے واقف تھے کہ برطانوی سامراج نے صنعتی پیداوار کے لیے ہندوستان کو اپنی منڈی بنا رکھا ہے۔ ہندوستان سے خام مواد برطانیہ جاتا ہے اور وہاں سے صنعتی مصنوعات تیار ہوکر ہندوستان بھیجی جاتی ہیں۔ برطانیہ نے اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان کی سیکڑوں سال کی قابلِ فخر صنعت و حرفت کو شکست و نابود کرکے اسے مغرب کے صنعتی مال کی منڈی بنا کر رکھ دیا تھا اور اکبر اسی بنیاد پر ان چیزوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ اکبر نے مغربی تہذیب، مغربی تعلیم اور سرسید ہی کی نہیں اُن مولویوں کا بھی مذاق اُڑایا ہے جو سرسید کی مخالفت اپنی رجعت پسندانہ فکر کی وجہ سے کر رہے تھے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

مر کے جو چلے سوئے جنت سید
لٹھ لے کر امام ابوحنیفہؒ دوڑے

امام ابوحنیفہؒ سنّی یہاں مولویوں کے استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ مولویوں کے واعظ کی مخالفت میں اکبر کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا اگر بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو
رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں
حضرتِ واعظ سے اب یہ قوم زندہ ہوگی کیا
اتنے مردوں کو مسیحا بھی جلا سکتے ہیں کہیں

آخر عمر میں اکبر سرسید کے معترف ہوگئے تھے۔ انھوں نے سرسید کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

سید صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور
کہتا نہیں میں، تم رہو اُس سے نفور
سوتوں کو جگایا انھوں نے لیکن
اللہ کا نام لے کے اُٹھنا ہے ضرور

ایک اور رباعی میں سرسید کی تعلیمی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے اکبر نے کہا ہے:

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اُڑو چرخ پہ جھولو
لیکن یہ سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

یہ محض شاعری یا طنز و مزاح نہیں ہے بلکہ اکبر کی بنیادی فکر کا نچوڑ ہے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ مسلمان چاہے جتنی مغربی تعلیم حاصل کریں اپنے مذہب اور اس کی روایات سے منحرف نہ ہوں۔ کیوں کہ انھی چیزوں پر انسانی اقدار کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ سرسید کی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں اکبر کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔ پہلا قطعہ ہے جس میں اکبر نے تمام مخالفتوں کے باوجود سرسید کی قومی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ کہتے ہیں:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اکبر اس حقیقت سے واقف ہو گئے تھے کہ زندگی بھر وہ جس مقصد کے لیے جدوجہد کرتے رہے اس میں ناکام ہو گئے۔ اکبر کا یہ شعر اس تحریک میں اُن کی شکست کا اعتراف ہے:

غریب اکبر نے بحث پردے کی بہت کچھ تو کی مگر ہوا کیا
نقاب اُلٹ ہی دی اس نے کہہ کر کہ کر ہی لے گا سوامرا کیا

اُن کا ایک شعر ہے جس میں بڑے واضح لفظوں میں اکبر نے اپنی ناکامی کا اعتراف کیا ہے:

شعر اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب
یہ اُسے معلوم ہے قسمت نہیں آئی ہوئی

سرسید کی اپنے مقصد میں فتح اور کامرانی کو دیکھ کر اُن کے اکثر مخالفین کے رویئہ میں بھی کوئی فرق نہیں آیا لیکن ایسے بھی بہت حق گو اور ایمان دار مخالف تھے جنھوں نے کھلے دل سے سرسید کی عظمت اور اُن کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اُن میں ایک اکبر الٰہ آبادی اور دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ اکبر نے سرسید کے خلوص، جذبۂ ایثار و عمل اور علمی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

واہ رے سید پاکیزہ گُہر کیا کہنا
یہ دماغ اور حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں یہ سوزِ جگر کیا کہنا
ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

اکبر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سرسید کی مخالفت کی بنیادی مختلف تھی۔ اکبر کا جو رویئہ تھا، اس پر تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ہے وہ ہندوستان کے لوگوں اور خاص طور سے مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کا واحد علاج جنگِ آزادی میں اُن کی شرکت کو سمجھتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ابتدائی عمر میں سرسید کے زبردست مداح تھے لیکن جوں جوں سیاست میں وہ آگے بڑھتے گئے سرسید سے اُن کی مخالفتوں کی بنیاد مضبوط ہوتی گئی لیکن عمر کی آخری منزل میں وہ بھی سرسید کی عظمت کے قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں سرسید کے مزار کی طرف اشارہ کر کے مولانا آزاد نے سرسید کی عظمت اور سرسید کے بارے میں اپنی فکری شکست کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس فیصلہ کن جنگ کا مردِ میدان وہ شخص تھا جو اس یونیورسٹی کے گوشے میں مدفون ہے۔ یہ جنگ اس علی گڑھ میں لڑی گئی تھی اور یہی علی گڑھ فتح مندی کا یادگاری جانا ہے"

آخر میں ایک دو باتیں مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کسی فرد یا ادارے کا مستقل طور پر مضحکہ اڑانے سے کوئی بھی ادب بڑا نہیں بن سکتا۔ اگر کچھ مخصوص چیزوں کو آپ طنز و مزاح کا نشانہ بنائیں تو کچھ عرصہ تک تو آپ کو مقبولیت حاصل رہے گی اور لوگ آپ کی بات غور سے سنیں گے لیکن جوں جوں ان مسائل کی اہمیت کم ہوگی آہستہ آہستہ فنکار کی مقبولیت بھی کم ہوتی جائے گی۔

اکبر تنہا جہاد کر رہے تھے اور وہ ایک ایسی جنگ لڑ رہے تھے جس کا لازمی نتیجہ شکست تھا۔ اس لیے زبردست فنی صلاحیتوں کے باوجود اردو ادب میں انھیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ ایک ہی بات کی تکرار کرنے اور ایک ہی چیز کا مختلف طریقوں پر مذاق اُڑانے سے کبھی وہ ایک معمولی مزاح نگار نظر آتے ہیں۔

فراق گورکھپوری نے اکبر کو ایشیا کے بڑے شاعروں میں شمار کیا ہے حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ کچھ نا رنجی اور ادبی جوھر اگر ہم میر تقی میر سے لے کر فیض احمد فیض تک اردو کے بڑے شاعروں کی فہرست مرتب کریں تو اس میں اکبر کا نام نہیں آتا۔ ہاں ہندوستان کی بیسویں صدی کی تہذیبی تاریخ میں اکبر کی شاعری کا اہم ترین مقام ہے جب کبھی ہندوستان میں مغرب و مشرق کی آویزش پر کوئی کتاب لکھی جائے گی تو یہ کتاب اکبر الٰہ آبادی کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔

آخر میں، میں اکبر الٰہ آبادی کو قریب سے دیکھنے والوں میں اس عہد کے ایک دانشور عبدالماجد دریابادی کا ایک اقتباس پیش کر کے اپنا مضمون ختم کروں گا:

"غرض ان کی (اکبر الٰہ آبادی) مستقل افسردگی، ستم رسیدگی، متعدد اور گہرا کوں ذاتی اور ملی حالات کے مجموعہ کا نتیجہ تھی کوئی دوسرا ہوتا تو مزاج میں جھلاہٹ اور طبیعت میں چڑچڑاپن ضرور پیدا ہو جاتا۔ اکبر کے یہاں یہ بات نہیں ہوئی۔ البتہ ایک مستقل اُداسی سے رہنے اور غم غلط کرنے کا ایک نسخہ انھوں نے اپنی ظریفانہ شاعری کو بنا لیا

سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برف بار
شاہدِ مستی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف"

☆

ہم سے عُشّاق کہاں

فاری شا

(لندن)

ڈاکٹر خلیق انجم نے اب سے کئی سال پہلے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اور یہ خاکہ بنایا تھا کہ غالب کے سب اردو خطوں کو چار جلدوں میں مرتب کیا جائے۔ ان کے مجوزہ سلسلے کی پہلی جلد اب چھپ کر سامنے آئی ہے جس کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے اور آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات لکھ رہا ہوں کہ خلیق انجم صاحب نے بہت دل لگا کر اور نظر جما کر اس کام کو انجام دیا ہے۔ انھوں نے بہت صبر و تحمل کے ساتھ کئی سال صرف کیے متن کی تصحیح پر اور بہت سا وقت خرچ کیا متن سے متعلق حواشی لکھنے پر۔ انھوں نے ضروری مصادر اور مآخذ کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ قیاس نہیں، میں یہ بات ذاتی معلومات کی بنا پر لکھ رہا ہوں مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے تلاش و جستجو کا حق ادا کرنے کی ایماندارانہ کوشش کی ہے اور جدید اصول تدوین کی روشنی میں متن کو مرتب کیا ہے۔ خلیق انجم صاحب ہم سب کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس داغ رسوائی کو دھویا ہے کہ اردو میں خطوط غالب کا کوئی مکمل مجموعہ مرتب نہیں ہو سکا تھا۔ میں توقع کرتا ہوں کہ اس سلسلے کی باقی جلدیں بھی اس پہلی جلد کی طرح ترتیب متن کے تقاضوں کو پورا کریں گی اور اس طرح غالبیات کے ذخیرے میں ایک قابل ذکر اضافہ ہوگا۔

(رشید حسن خان)

یہ کام صبر طلب بھی تھا اور دقت نظر کا متقاضی بھی۔ خوشی کا مقام ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس مہم کے سر کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ انھوں نے برسوں کی محنت کے بعد تمام موجودہ خطوط کو چار جلدوں میں یکجا کر دیا ہے ان کی تاریخ متعین کرنے کی کوشش کی ہے خطوط غالب مالہٗ و ماعلیہ کے بارے میں تفصیلی حواشی قلمبند کیے ہیں۔ جہاں اصلی خط مہیا ہو گیا ہے اس کا عکس شائع کر دیا ہے۔ غرض ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اب ہمیں خطوط غالب کا ممکنہ حد تک، ایک مکمل مجموعہ دستیاب ہو جائے گا۔ اس کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم پوری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔

(مالک رام)

''غالب کے خطوط'' پر تو کام ڈاکٹر خلیق انجم نے خیر بہت بعد میں آ کے کیا۔ تصنیف و تالیف کا کام انھوں نے ۱۹۵۷ء میں شروع کر دیا تھا جب کہ وہ ابھی ایم اے کے طالب علم تھے۔ گوپال گوکل کے ناول 'تاراس چلا' کا انھوں نے ۱۹۵۷ء میں ہی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی کی جانب سے شائع ہوا تھا۔ کچھ مدت بعد انھوں نے مرزا مظہر جان جاناں کے فارسی خطوط مرتب کیے اور اردو میں ان کا ترجمہ کیا۔ یہ کتاب ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ ''غالب کی نادر تحریریں'' غالبیات کے سلسلے میں خلیق انجم کی ایک کتاب ہے جو ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آئی۔ ۱۹۶۵ء میں ''مرزا محمد رفیع سودا'' انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کی۔ اس کتاب کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے لکھا تھا کہ اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ اردو میں تحقیق کس اعلا معیار پر پہنچ گئی ہے تو اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔

(پروفیسر جگن ناتھ آزاد)

مرزا غالب اردو کے عظیم شاعر ہی نہیں بڑے صاحب طرز نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بہت قابل قدر کام ہوئے ہیں لیکن نثر کا حق ابھی تک ادا نہیں ہوا تھا اس سلسلے میں سب سے اہم اور بنیادی کام یہ ہے کہ ''خطوط غالب'' کے قیمتی سرمایے کو پورے آداب تحقیق کے ساتھ مرتب کیا جائے۔ اس سلسلے میں مولوی مہیش پرشاد، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور غلام رسول مہر نے جو ابتدا کی تھی اس کی تکمیل ڈاکٹر خلیق انجم کے ہاتھوں سے ہوئی ہے۔ انھوں نے برسوں کی محنت اور دیدہ ریزی کے بعد ''خطوط غالب'' کو چار جلدوں میں فراہم کیا ہے۔ غالبیات میں انھوں نے اب تک جو کام کیے تھے وہ بھی ان کی سرخروئی کے لیے کافی تھے لیکن اس کارنامے نے انھیں غالب شناسوں کی صف اول تک پہنچا دیا ہے۔

(پروفیسر نثار احمد فاروقی)

خلیق انجم کی غالبیات کے تقریباً تمام گوشوں پر ان کی نظر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اور برصغیر سے باہر برطانیہ میں بھی انھوں نے اردو کے علمی ذخیروں کو اچھی طرح دیکھا بھالا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان کی جملہ مطبوعات اور تحقیقی و تنقیدی مباحث ان کی نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ وہ برسوں سے غالب کے اردو خطوط کی نئی تدوین میں مصروف تھے۔ مولوی مہیش پرشاد، امتیاز علی خاں عرشی، غلام رسول مہر، مالک رام اور آفاق حسین آفاق نے اس سلسلے میں جو کام کیا تھا، اس کے بعد بھی نئے خطوط دریافت ہوتے رہے ہیں اور نئی بحثیں اٹھتی رہی ہیں اس سارے علمی سرمائے کا از سر نو تحقیقی جائزہ لینے اور خطوط غالب کو کسی سائنٹیفک تدوین کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ایک عرصے سے محسوس کی جارہی تھی۔ بارے اس اہم ذمے داری کا بیڑا ڈاکٹر خلیق انجم نے اٹھایا ہے۔ پہلی جلد میں تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے جس میں ''اردوئے معلی'' اور ''عود ہندی'' کے اولین ایڈیشنوں سے لے کر اب تک شائع ہونے والے اردو خطوط کے تمام مجموعوں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور خطوط غالب کے لسانی اور ادبی

پہلوؤں سے بحث بھی کی گئی ہے۔ منصوبے کے مطابق چار جلدوں میں خطوط کا متن پیش کیا گیا ہے اور ماخذ کی تفصیل اور اختلافِ نسخ حواشی میں دیے گئے ہیں۔ ان جلدوں کی اشاعت غالبیات کی تاریخ میں بنیادی نوعیت کا کارنامہ ہے۔ بلاشبہ اس علمی اقدام کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم پوری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔

(پروفیسر گوپی چند نارنگ)

جب غالب شناسی کا ذکر آتا ہے تو ہمارے سامنے مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم اور قاضی عبدالودود مرحوم کا نام سامنے آتا ہے اور اسی کے ساتھ مالک رام صاحب، خدا ان کو سلامت رکھے کا نام بھی فہرست ہے۔ ان اساتذہ کے نام کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم کا نام غالب شناسی میں سب سے نمایاں ہے اور یہ غالب کا فیضان ہے کہ اپنے ماہرین کا سلسلہ ختم نہیں ہونے دیتا۔ گزشتہ بارہ برس سے انجم صاحب غالب کے اردو خطوط مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ چار جلدوں میں یہ عظیم الشان تاریخی کام شائع کیا جا رہا ہے۔ غالب کے اردو خطوط ۱۸۶۹ء سے لے کر اب تک مختلف صورتوں میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن غیر معمولی سائنٹیفک انداز میں غالب کا تنقیدی اور تحقیقی ایڈیشن پہلی بار مرتب کیا گیا ہے۔

(پروفیسر ظہیر احمد صدیقی)

بہت دنوں سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ غالب کے خطوط کا ایک ایسا مکمل مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا جائے جس میں اُن کے اردو کے اب تک کے دریافت ہوئے سارے خطوط مناسب ترتیب و تہذیب اور تصحیح کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیے جائیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ جناب خلیق انجم نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد اس اہم کام کو انجام تک پہنچایا۔ وہ اردو کے مشہور مصنف اور ممتاز محقق ہیں۔ ان کی غالب کے خطوط سے دلچسپی بہت قدیم ہے اور غالب کی کمیاب تحریروں کا ایک مجموعہ ''غالب کی نادر تحریریں'' (دہلی ۱۹۶۱ء) مرتب کر کے شائع بھی کر چکے ہیں۔ جناب خلیق انجم کا یہ معرکتہ الآرا کام چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد جو تقریباً پانچ سو صفحات پر ختم ہوتی ہے اب چھپ کر شائقین کے سامنے ہے۔ اس میں ان کا لکھا ہوا تفصیلی مقدمہ ہے۔ پھر غالب کے منشی ہرگوپال تفتہ اور نواب علاءالدین خاں علائی کے نام کے خطوط درج ہیں۔

(پروفیسر مختار الدین احمد)

ڈاکٹر خلیق انجم نے کتنا بڑا کام کیا ہے۔ اب تک خطوطِ غالب پر اتنا بڑا کام میرے علم کی حد تک کسی اور نے نہیں کیا۔ کیا محنت ہے آپ کی۔ شاید پہلی بار یہ ہوا ہے کہ کسی اردو متن کی تدوین جدید جرمن طریقے پر کی گئی ہے۔ جرمن اس معاملے میں پورے یورپ کے لیے مثال اور امریکہ سے بہت آگے ہیں۔ آپ کی تدوین جرمن انداز پر بالکل سائنٹفک ہے۔

(ڈاکٹر جمیل الدین عالی)

غالب انسٹی ٹیوٹ نے اپنے اشاعتی پروگرام میں اس بات کو برابر ملحوظ رکھا ہے کہ غالب پر کام کرنے والے سنجیدہ محققین کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب 'غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس سے پہلے غالب انسٹی ٹیوٹ پانچ جلدوں پر مشتمل ڈاکٹر خلیق انجم کی مرتبہ 'خطوطِ غالب' شائع کر چکا ہے۔ کلاسیکی ادب کے ساتھ واسطہ رکھنے والے تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کلاسیکی ادب کے سنجیدہ قاری، کلاسیکی ادب کے محقق اور کلاسیکی ادب کے نقاد۔ خلیق انجم نے نصف صدی کی ادبی کاوشوں میں ادب کی ان تینوں جہتوں میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

(پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی)

''ڈاکٹر خلیق انجم نے متن کی تحقیق کے سلسلے میں فراہمی مواد سے لے کر موازنے و مقابلے کے طریق، اختلافِ نسخ کے مسائل، اغلاط عام کی نوعیت و کیفیت سے لے کر جعلی متنوں کی تحقیق، مرتبہ فرضی نام یا گم نام مصنفین یا فرضی ناموں سے لکھنے والوں کی تصانیف، سنِ تصانیف کا تعین غرض بہت سے ایسے مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے جو متن کی تحقیق کے سلسلے میں پیش آتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی دلچسپ تفصیلات بیان ہوئی ہیں جن کی بدولت یہ کتاب چند خشک مباحث کا مجموعہ نہیں رہی بلکہ بڑی قابلِ مطالعہ ہو گئی ہے اور صرف محققین ہی کے لیے مفید نہیں، عام قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا سامان رکھتی ہے۔ ہمارے یہاں متن کی حرمت کو قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا عام طور سے مطالعہ کیا جائے۔''

(ڈاکٹر شان الحق حقی)

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب بحیثیت محقق، مولف، مترجم اور نقاد اعلیٰ ترین صلاحیتوں DISTINGUISHED PROFILES کے حامل شخص ہیں۔ آپ نے نہ صرف نئی ذہنی و علمی مضمرات سے غیر ملوث انتقادی توانائی کا استعمال صحت مند طریق پر کرتے ہوئے اردو ادب میں بہت سی نئی جہات، نئے زاویے اور معلومات کا اضافہ کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ پڑھنے والا حیرت کے سوا کچھ اور کرنے کے لائق رہتا نہیں ہے۔

(تاراچرن رستوگی)

ماہرِ غالب ڈاکٹر خلیق انجم کی تصنیف 'غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ' اسی کے ذیل میں آتی ہے۔ اس سے غالب کی شاعری اور سوانح دونوں کے بارے میں بعض بالکل نئے انکشافات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جن حضرات نے کتاب کا مطالعہ کیا ہے وہ اس امر کی شہادت دیں گے کہ اس کا دائرہ صرف کلکتے کے سفر اور کلکتے کے ادبی معرکے تک محدود نہیں ہے بلکہ حق یہ

ہے کہ اس میں غالب کی زندگی کا پورا سفر اور غالب کی جملہ علمی و ادبی معرکہ آرائیاں سمٹ آئی ہیں۔

(پروفیسر فرمان فتح پوری)

خلیق انجم نے اپنی کتاب "غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ" لکھ کر تمام پہلوؤں کو دستاویزات اور مدلل تاریخی بیانات کی مدد سے اس قدر واضح کر دیا ہے کہ اب کسی معاملے کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس باب میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ خلیق انجم کی اس کتاب سے غالب کے کردار اور مزاج پر بھی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اگر وہ ایک طرف معتمد الدولہ سے ملاقات کے لیے نذر کی معافی اور معتمد الدولہ کی طرف سے تعظیمی قیام کی شرط لگاتے ہیں تو دوسری طرف وہ اپنے دوستوں یا امیدگاہوں میں بہت ہی معمولی شعرا کو خسرو اور سعدی و جامی یا صائب و کلیم و قدسی سے بلند تر بتانے میں کچھ بھی تکلف نہیں کرتے۔ خلیق انجم نے یہ کتاب لکھ کر ہماری ادبی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا ہے۔

(شمس الرحمن فاروقی)

ڈاکٹر خلیق انجم اپنی تحقیقی معلومات کو جس خوش سلیقگی سے پیش کرتے اور حوالہ جات سے انکی صداقت آراستہ کرتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ کلکتے کے ادبی معرکے کو تو اس کتاب میں بنیادی موضوع کی حیثیت حاصل ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع کے علاوہ غالب کے گرد و پیش میں بھی نظر دوڑائی ہے اور اس کتاب کو "قاموس غالب" بنا دیا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ محترم محقق نے اپنی خود نمائی کے کسی موقع سے استفادہ نہیں کیا اور خود پس منظر میں رہ کر غالب کو پیش منظر میں ابھارنے کی سعی کی ہے۔

(ڈاکٹر انور سدید)

ڈاکٹر خلیق انجم خشک مزاج محقق نہیں ہیں بلکہ ان کے مزاج کی شگفتگی ان کی تحریروں میں بھی جھلکتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے وقت مجھے یا محسوس ہوا کہ میں غالب کے حوالے سے ایک سوانحی ناول پڑھ رہا ہوں۔ اس قدر رواں دواں تحریر اور خود غالب کی تحریروں کے زندہ جاوید حوالے اس سفر میں پیش آنے والے اچھے برے واقعات، دوستوں اور دشمنوں اور مخالفوں کی کردار نگاری اگر ایسی شگفتہ نثر ہمارے محقق لکھتے ہیں تو عوام الناس میں تحقیقی ذوق پیدا ہو سکتا ہے۔ خلیق صاحب نے جزئیات نگاری سے بڑا کام لیا ہے۔ ان کی تحریر میں بین السطور کے معانی لطف دے جاتے ہیں۔

(رفعت سروش)

غالب کے خطوط کو یکجا طور پر مرتب کرنے کے بعد ان کا دوسرا بڑا کارنامہ "غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ" ہے۔ اس سفر اور ادبی معرکہ پر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اگرچہ کافی کچھ لکھا گیا ہے لیکن جس تفصیل و بسیط کا وہ متقاضی تھا، اس طرح کا کوئی کام ابھی تک انجام نہیں دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے بہت محنت و جانفشانی سے اس تمام مواد کو کھنگالا اور ایک اچھے ادیب اور صاف ذہن مصنف کی حیثیت سے اس موضوع کی اہم کتابوں کے مطالعہ کے بعد ایک منظم مرتب کتاب کی شکل میں پیش کیا۔ اس کی ایک خصوصیت ان کے وہ نتائج ہیں جو کثرت کتابوں کو پڑھنے کے بعد انھوں نے اخذ کیے ہیں۔

(پروفیسر سید ظل الرحمن)

خلیق انجم کا طرز تحقیق اور طرز تحریر دونوں غیر معمولی طور پر معروضی ہیں۔ انھوں نے کہیں غالب کی طرفداری نہیں کی بلکہ بعض جگہوں پر تو غالب کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کو بھی اجاگر کر دیا ہے۔ مثلاً غالب نے حبیب اللہ ذکا کے موسومہ ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ کلکتہ گئے گورنر سے ملنے کی درخواست کی جہاں انھیں سات پارچے اور جیغہ سرپیچ اور مالائے مروارید یعنی رقم خلعت ملا۔ خلیق انجم لکھتے ہیں کہ ''حقیقت یہ ہے کہ غالب کو خلعت نہیں ملی تھی۔ یہ صرف ان کی آرزو تھی'' (ص 82) ونیز غالب نے جس طرح عبدالصمد کے کردار کو گھڑ کر اپنی فارسی دانی کا رعب جمانے کی کوشش کی اسی طرح سفیر ہرات سے منسوب کر کے انھوں نے لکھا کہ ''زبان کے معاملے میں ہندوستان میں غالب کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ قطع نظر شعر و شاعری کے غالب تو فارسی کے عالم ہیں''۔ غالب نے کہیں لکھا کہ سفیر ہرات کلکتہ کے پہلے مشاعرہ میں شریک تھے، کہیں لکھا کہ تیسرے مشاعرے میں شریک تھے اور کہیں لکھا کہ اس ادبی معرکہ کی تفصیلات سفیر ہرات کو بعد ازاں کسی نے سنائیں۔ غالب کی اس تضاد بیانی کے مختلف زاویوں سے جائزہ لیتے ہوئے خلیق انجم لکھتے ہیں کہ جہاں تک سفیر ہرات کا تعلق ہے ''ان ادبی معرکوں کے کسی بھی مشاعرے میں وہ شریک نہیں تھے اس لیے غالب کی تعریف و توصیف میں جو کلمات ان سے منسوب کیے گئے ہیں وہ خود غالب کے ذہن کی اختراع ہیں''۔

(پروفیسر سلیمان اطہر جاوید)

ماہر غالبیات ماہر آثار قدیمہ خلیق انجم نے زیر نظر کتاب میں پہلے یعنی معرکہ کلکتہ کو اور غالب کے سفر کلکتہ کو ہی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کرنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے نیز اس معرکہ اور سفر کے تقریباً تمام گوشوں کو زیر نظر کتاب میں پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں مصنف نے غالب کے سفر اور معرکہ کلکتہ سے متعلق مزید معلومات حواشی میں بھی فراہم کی ہے جس سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ کتاب کے ضمیموں میں بھی ڈاکٹر خلیق انجم نے دستاویزی ثبوت اور شواہد کی بنیاد پر غالب اور ان کے معاصرین سے متعلق اہم انکشافات کیے ہیں جن کی وجہ سے کتاب کی ادبی و تاریخی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ اسی طرح ایک دلچسپ اور انکشاف انگیز مضمون غالب و مدح خود بھی کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔

(اسد رضا)

غالب کی داستان حیات میں سفر کلکتہ کی اہمیت پر بھی ڈاکٹر خلیق

انجم نے مفصل، مدلل اور مفید بحث کی ہے۔ اس سفر میں غالب کی مصروفیتوں اور مشغولیتوں کا مفید اور دلچسپ بیان ملتا ہے۔ کلکتے میں غالب کی ادبی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھی گئی ہے۔ سفرِ کلکتہ کے دوران غالب کے ان ادبی آثار کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جو اس سفر کی پیداوار قرار دیے جا سکتے ہیں۔

(ڈاکٹر کاظم علی خاں)

میری نظر میں اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ باوجود یکہ موضوع اور اس کے متعلقات تحقیقی طریقۂ کار اور تحقیقی اسلوب ہی کے متقاضی تھے لیکن ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی ذہنی فراست اور قلم کی توانائی سے کام لیتے ہوئے اسے ایک عام قاری کے لیے بھی بے حد دلچسپ بنا دیا ہے اور وہ اس کو ایک سفر نامے اور ناول کی طرح دلچسپی کے ساتھ پڑھے گا۔

(پروفیسر شمس بدایونی)

غالب کے مکتوبات کی جمع آوری اور ان پر تحقیقی اور تنقیدی کاموں کا سلسلہ جو غالب کی اپنی زندگی میں شروع ہو چکا تھا اب اس پر ایک صدی سے بھی کچھ زیادہ مدت بیت رہی ہے اور اس پر اور خاص میں مولانا حالی، مولانا غلام رسول مہر، مولوی مہیش پرشاد جیسے غالب شناسوں اور محققوں کے نام بھی شامل ہیں۔ خلیق انجم صاحب نے اپنی تحقیقی کاوشوں کے ذریعے اس کام کو اور آگے بڑھایا ہے۔ پورا کام کئی جلدوں پر مشتمل ہے جس کی پہلی جلد چھپ کر سامنے آئی ہے اس میں "اردوئے معلی" اور "عودِ ہندی" سے لے کر موجودہ زمانے تک غالب کے جتنے خطوط سامنے آئے ہیں ان کو جمع کر دیا گیا ہے اور ان کی لسانی، تحقیقی اور ادبی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باقی تین جلدوں میں جو زیرِ طبع ہیں اختلافاتِ نسخ، حواشی اور مآخذ سے متعلق امور کے علاوہ ان تمام حقائق کو بھی یکجا کیا گیا ہے جو غالب اور عہدِ غالب پر ان کے تحقیقی کام کے اہم نتائج قرار دیے جا سکتے ہیں۔ خلیق انجم صاحب کا یہ علمی کام اردو ادب اور غالبیات میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

(ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

ڈاکٹر خلیق انجم نے "متنی تنقید" لکھ کر اسی کشادہ راستے پر ایک سنگِ میل نصب کیا، جس کا نشان جدید تر یا جدید تنقید کی بے اعتدالیوں کے سبب گم ہوتا نظر آتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس کتاب کی تازہ اشاعت ہو اور اس کا مطالعہ ایک نئے تناظر میں کیا جائے تاکہ اسلوبیات و لفظیات کے علم برداروں کو ادبی و تنقیدی مسائل کی سنجیدگی و پیچیدگی کا احساس و عرفان ہو اور نئے لکھنے والوں کی استقامت کا سامان، اس طرح انفرادی تجربات کے شائقین [illegible] روایات کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔

(عبدالمغنی)

پچھلے پچیس تیس برسوں میں جن حضرات نے اردو تحقیق و تنقید میں ممتاز مقام حاصل کیا ہے ان میں ڈاکٹر خلیق انجم کا نام بھی شامل ہے۔ انجم صاحب کی پہلی کتاب "غالب کی نادر تحریریں" تیس سال پہلے شائع ہوئی تھی اور اب تک ان کی چھبیس پچیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انجم صاحب نے حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ جس پر انھیں دلّی یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی (یہ مقالہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے) انجم صاحب کی ایک اہم کتاب "مرزا محمد رفیع سودا" ہے جو سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب تحقیق و تنقید کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا تھا کہ "جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تحقیقی و تنقیدی معیار گر رہا ہے انھیں ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ معرکتہ الآرا کتاب دیکھنی چاہیے" یہ کتاب بیشتر یونیورسٹیوں کے ایم اے کے نصاب میں شامل ہے۔ "غالب اور شاہانِ تیموریہ" میں انجم صاحب نے غالب اور ذوق کے ادبی معرکوں کے نئے نئے گوشے تلاش کیے ہیں اور قلعۂ معلی سے غالب کے تعلقات کی تفصیل بیان کی ہے۔ انجم صاحب کی ایک اہم کتاب "متنی تنقید" ہے کلاسیکی متون کی ترتیب کے اصول و ضوابط پر اردو میں پہلی کتاب ہے اگرچہ بعد میں اس موضوع پر دو تین کتابیں اور بھی چھپی ہیں۔ لیکن انجم صاحب نے ایک انتہائی خشک موضوع کو ایسا شگفتہ اندازِ تحریر دیا ہے کہ آج بھی ہندوستان اور پاکستان کی بیشتر یونیورسٹیوں کے ایم فل کے نصاب میں یہ کتاب شامل ہے۔

(سید شریف الحسن نقوی)

مرزا محمد رفیع سودا کے سوانح اور انتقاد پر ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ تالیف تلاش و تحقیق اور صحیح سمت میں محنت و کاوش کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ مستند تحقیق اور معتبر تنقید کی عمدہ اور قابلِ تقلید مثال ہے۔ انھوں نے سودا کی قادر الکلامی اور فنی مہارت کا جس حسین انداز سے جائزہ لیا ہے اور ان کے کلام پر جس غیر جانبداری، بلند معیاری اور سائنٹیفک انداز میں بحث کی ہے اس سے سودا کی قدر و قیمت اور عظمت کا احساس بڑھ جاتا ہے اور یہی مؤلف کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

(محمد ضیاء الدین انصاری)

خلیق صاحب کی مرتب کردہ تمام کتابوں کا میں مطالعہ کر چکا ہوں، اس لیے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے جن مشاہیر کے افکار کو لباسِ بقا عطا کیا ہے اس سے آپ کی تخلیقی و تنقیدی بصیرت اور سلجھے ہوئے ذوق کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کی معلومات ان اہلِ قلم پر نہ ہوتیں تو اتنی اچھی اور ضخیم کتابوں کا منظرِ عام پر لانا دشوار نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ کتابوں کی طباعت و نفاست، ترتیب و تہذیب کا جہاں تک تعلق ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کام میں آپ ماہر ہیں۔ انجم صاحب کا یہ کام بھی قابلِ ستائش ہے کہ آپ نے نہ صرف اپنی مرتب کردہ تصانیف کے حسن کا خیال رکھا بلکہ انجمن کی شائع کردہ تمام مطبوعات کے حسن کو بھی دوبالا کیا۔

(سید منظور احمد)

خلیق صاحب کا شمار ان لوگوں میں تو نہیں ہوتا جو خلقی طور پر ذکی الحس

(نابغہ) ہوتے ہیں جیسے ابوالکلام آزاد یا گاندھی تھے لیکن جو لوگ اپنی محنت اور ذہانت دونوں کے امتزاج سے نابغہ کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں ان میں خلیق صاحب بھی ہیں۔ موقع شناسی، تحمل اور محنت خلیق صاحب کی سرشت کے اجزائے ترکیبی میں خصوصی اہمیت کے حامل اوصاف ہیں۔ جن کی آج کے سلطانوں میں نادرست کمی ہے۔

(بشیر احمد)

خلیق بھائی بہت ہی عجیب و غریب صفات کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت کثیر الجہات ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ اردو زبان کے ممتاز عالم، بہترین مقرر، سیاستداں، پرانی گاڑیوں کے شیدا، این سی سی کے افسر، ماہر کھلاڑی، ہومیوپیتھی کے ہونہار ڈاکٹر، آل انڈیا ریڈیو کی قاری، ہر دوسری زبان کے مشہور براڈکاسٹر، ایڈمنسٹریٹر، مصنف، بہترین فوٹوگرافر وغیرہ جانے کیا کیا ہیں۔ وہ ہر نئے کام میں بآسانی ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ اور مزے کی بات یہ کہ کامیاب ہوتے ہیں۔

(محمد آصف جاہ)

خلیق صاحب تحریر اور تقریر کے بادشاہ ہیں۔ اُن کا وسیع مطالعہ اور انداز بیان دامن دل کو کھینچ لیتا ہے۔ وہ جس کام کو ہاتھ میں لیتے ہیں اس کی پوری جزئیات کے ساتھ اس کے پہلو کو نظر میں رکھتے ہیں۔ انھیں حسنِ ترتیب کا وہ سلیقہ آتا ہے جو بیک وقت قاری اور سامع کو گرفت میں رکھنے کے لیے کافی وشافی ہوا کرتا ہے۔

(پروفیسر آفاق احمد)

ڈاکٹر خلیق انجم کو تحقیق سے ذہنی مناسبت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیدائشی تحقیق، تنقید اور تدقیق کے لیے ہوئے ہیں۔ خاص کر تحقیق جو ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ انھوں نے مرزا غالب، مرزا ذوق اور بے شمار علمی، ادبی اور تاریخی شخصیات کو نہ صرف نئے زاویوں سے متعارف کرایا ہے بلکہ اپنی شخصیات وفن کے انوکھے اور نرالے وصف سے بھی بڑی ایمانداری برتی ہے۔

(عتیق جیلانی سالک)

ڈاکٹر خلیق انجم کی تالیف میں تحقیق وتنقید کے امتزاج سے ایک صحت مند اور توانا بصیرت کا انداز ہوتا ہے۔ موضوع کا انتخاب، مقصد انتخاب، موضوع سے متعلق اپنی اور مشاہیر کی نمائندہ تحریروں کا انتخاب، موضوع پر ذاتی نظریہ، تحقیقی مواد، فکر رسی، نکتہ شناسی، تجزیہ، موضوع پر یکسوئی کے ساتھ دیدہ وری ان کی تالیف کی بنیادی خصوصیات ہیں۔

(قطب سرشار)

مولانا امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود کے انتقال سے اردو تحقیق و تنقید خاص طور پر غالبیات کے حوالے سے جو خلا محسوس کیا جا رہا تھا ڈاکٹر خلیق انجم نے اسے احسن طریقے سے پر کردیا ہے۔ اُن میں کام کرنے کی بے پناہ لگن ہے اور کام بھی پتہ مار کر کرتے ہیں۔

(رضوان احمد)

ڈاکٹر خلیق انجم اردو دنیا میں آج کل ماہِ کہکشاں جگمگا رہے ہیں۔ یہ مقام اعتبار اور منصب جلیل انھیں ان کی اعلیٰ خدمات، اَن تھک اخلاص اور انتھک محنت ولگن کے باعث ملا ہے۔ وہ جس پائے کے دانشور، محقق، نقاد اور تاریخ داں ہیں اسی پائے کے اعلیٰ انسان اور مخلص دوست ہیں۔

(عاشور کاظمی)

ایک بات کا اندازہ مجھے پہلی ہی ملاقات میں ہوگیا کہ خلیق انجم صاحب اپنی بات مکمل کرکے اور لاگ لپیٹ سے کام نہیں لیتے ہیں۔ وہ یاروں کے یار ہیں جن کے لیے کچھ بھی کرنے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

(کشمیری لال ذاکر)

ڈاکٹر خلیق انجم اسم با مسمّیٰ خلیق، مہربان اور ہر دلعزیز شخصیت کے مالک، انسان دوست اور انسان نواز محقق، نقاد اور تاریخ داں ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اُن کی جستجو، ہمت، محنت، لگن اور ثمر دیکھ کر بے ساختہ دل سے دعائیں نکلنے لگتی ہیں۔

(ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ)

ڈاکٹر خلیق انجم اردو ادب بالخصوص دلی والوں کے لیے ایسے شجر نوبہار ہیں جن کے سائے میں بیٹھ کر ہر عمر، قبیل اور مزاج کے اہل قلم سستاتے بھی ہیں اور تازگی و توانائی کی قوت بھی حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا مسلک بے لوث، بے ریا محبت اور بے پناہ محنت ولگن کے سوا کچھ بھی نہیں۔

(نند کشور وکرم)

ڈاکٹر خلیق انجم نے غیر معمولی تحقیق، محنت اور جستجو سے وہ حقائق تلاش کیے ہیں جن سے سفر کلکتہ کے تمام واقعات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ انھوں نے اس سفر کے زمانے کی ایک دل چسپ تصویر پیش کی ہے۔ اس کتاب میں اس سفر کے بارے میں غالب کے فارسی خطوط کے جگہ جگہ حوالے دیے گئے ہیں۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بہت آسان، رواں دواں اور ایسی شگفتہ زبان میں لکھی گئی ہے کہ پڑھنے میں لطف آجاتا ہے۔ ایک تو ۱۸۲۷ء سے لے کر ۱۸۲۹ء تک کے اس سفر کے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو غالب نے پیدل، گھوڑے پر، کشتی میں اور بیل گاڑی میں طے کیا تھا۔ ایک تو دلچسپ واقعات اور دوسرے ڈاکٹر خلیق انجم کی شگفتہ بیانی۔ یہ کتاب کسی بھی فکشن سے کم نہیں ہے۔

(آر۔ وی۔ اسمتھ)

آب وگُل کے درمیاں

کندیدہ!

عبدالعزیز خالد (لاہور)

(داد پائی جو بجھ اس میں
بنام حضورؐ پاک کا: کندیدہ!
درود ے لغات جس کے معنی: کامل!)

کروں نعتِ رسولِ پاک رقم
بالِ جبریل کا اگر ہو قلم

وہ کہ جو تھا بکارِ صُنعِ خدا
وہ کہ میرِ عرب کبیرِ عجم

تھا جو اس وقت بھی نبیؐ جس وقت
آب وگل کے تھا درمیاں آدمؑ

خیرِ مقدم کو جس کے پھوٹا تھا
ریگِ صحرا سے چشمۂ زمزم

حق سے مانگا جسے خلیلؑ نے جب
رکھی اس نے بنائے بیتِ حرم

مژدہ دے جس کی آمد آمد کا
قومِ موسیٰ کو عیسیٰ مریم

جس کی گفتار بلیغ و فصیح
جس کا کردار مُبرم و محکم

جس کے افعال باب تجمِ ہدیٰ
جس کے اقوال نغز نغز حکم

اہلِ انصاف سب جسے مانیں
بنی آدم کا محسنِ اعظم

گو نجے گا سخیز ہونے تک
جس کے مُصحف سے عرصۂ عالم

وہ یمِ بے کنار و بے پایاں
اور میں ایک قطرۂ شبنم

اس کی محفل میں پا سکوں اے کاش
بار بارے زراہِ لطف وکرم!

صدیق شاہد (شیخوپورہ)

آگ کو پھول کہے جائیں خردمند اپنے
اور آنکھوں پہ رکھیں دید کے در بند اپنے

لاکھ چاہا کہ غم و فکرِ جہاں سے چھوٹیں
جامۂ دل پہ یہ جتے رہے پیوند اپنے

جن کو بخشا گیا اعجاز مسیحائی کا
صدف لب کی قسم رکھتے ہیں لب بند اپنے

شہر میں دھوم مچاتی رہی کیا تازہ ہوا
ہم نے دروانہ کیا ہم ہیں گلہ مند اپنے

سطحِ قرطاس پہ اترے نہ تری گلبدنی
کتنے عاجز ہوئے جاتے ہیں ہنرمند اپنے

مرحلہ طے نہ ہوا اہلِ تذبذب سے کوئی
جرمِ تشکیک سے بیٹھے رہے پابند اپنے

ایسا کچھ گردشِ دوراں نے رکھا ہے مصروف
ماجرے ہو نہ سکے ہم سے قلم بند اپنے

ہم تو مرجاتے غمِ دہر کے ہاتھوں شاہدؔ
دشتِ آفاق میں ہوتے نہ اگر چند اپنے

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

سجاد مرزا (گوجرانوالہ)

لیا جب نام ان کا باوضو تو فکر کا گھر چمکا
بحمد اللہ کہ مجھ نا چیز کا رنگِ ہنر چمکا!

وہ آئے تو زمانے کا بھی اندازِ نظر چمکا
یہی محسوس ہوتا ہے کہ صدیوں کا سفر چمکا

محافل انؐ کی آمد پر سجائیں اہلِ عالم نے
ہر اک اہلِ نظر کا پھر سے اندازِ نظر چمکا

سرِ افلاک جب ماہِؐ منور کے قدم پہنچے
ملائک کی زباں پر تھا' ستاروں کا نگر چمکا

تلطف کی نظر ان پر پڑی تو یوں لگا مجھ کو
"ستارہ بن کے ہر ذرہ زمیں کا عرش پر چمکا"

میں انؐ کے روضۂ اطہر کو ان آنکھوں سے پھر دیکھوں
مقدر اے مرے مولا! مرا بار دگر چمکا!

درودِ پاک پڑھتا ہوں میں راتوں کے اندھیرے میں
اسی باعث مرا سجّاد ہر خوابِ سحر چمکا!

نعتِ پاک

عشرت ظفر (کانپور بھارت)

تقدیر جواں ہے مرے خار و حسن جاں کی
آغوش ملی ہے جسے گرداب رواں کی

دیکھو تو نقوش قدم پاک کا اعجاز
قسمت ہوئی روشن مرے مٹی کے مکاں کی

کیا آگ مرے سینے میں بھڑکائی گئی ہے
پگھلی ہی چلی جاتی ہے زنجیر زیاں کی

وہ علم و ہنر صید میں جس کے فلک وارض
اک جنبش لب ہے مرے آقائے زماں کی

ہر بوند میں تنویر طرب گاہ عدم ہے
ہر ذرہ ہے تصویر خد و خال جہاں کی

لمحوں میں سمٹتے ہوئے صدیوں کے یہ پیاک
باب چمن خاک پہ دستک ہیں خزاں کی

منزل مری عشرتؔ ہے گزرگاہ شہ دیں
کیوں فکر کسی کو ہو مرے نام و نشاں کی

"دیس پردیس"

جتیندر بلّو (لندن)

میں خوش تھا اور اپنے مقدر کو سراہ رہا تھا کہ کمپنی کی جو شاخ لندن میں قائم تھی، اُس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے شعبہ اکاؤنٹس میرے ذمہ کر دیا تھا۔ میں باسٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایئر انڈیا کے جہاز کی کھڑکی سے باہر کے چھوٹے بڑے بادل دیکھ رہا تھا۔ دھرتی کا سینہ غائب تھا۔ اچانک ایئر ہوسٹس کی مدھر آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "ہم کچھ ہی منٹ میں ہیتھرو ایئر پورٹ پر اُترنے والے ہیں۔ یاتریوں سے نویدن ہے کہ وہ اپنی سیٹ کے رکھشک بندھ باندھ لیں۔ دھنیہ واد۔" یہ سنا تھا کہ میرا دل دھڑک اُٹھا۔ اِس خیال کے ساتھ مجھے تین برس تک ایک نئے ملک میں رہنا ہوگا۔ جہاں کی سوسائٹی، قدریں، روایات، ماحول سب ہی نیا ہوگا۔ جہاں گام زندگی کے ساتھ سفید فام لوگ بھی ہوں گے۔ جن کے آباؤ اجداد ہمارے حکمران بھی رہ چکے ہیں۔ اس نئے پن کے احساس نے میرے اندر عجیب سا خوف پیدا کر دیا تھا۔ دور دور تک کے چند رشتہ دار لندن میں ضرور قیام پذیر تھے۔ دو ایک دوست بھی وہاں موجود تھے۔ جن میں اپنا جانی بھی تھا۔ مگر دل تھا کہ وہ اوپر نیچے ہونے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ لیکن جب جانی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے اُبھر کر اپنی صورت اختیار کر بیٹھا تو دل آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگا۔ سانولا رنگ، گھنے گھنگھریالے بال، چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں اور چوڑا ماتھا۔ اُس کا پیدائشی نام ہردرکا دامن تھا۔ مگر اُسے اپنے دقیانوسی نام سے اِس قدر چڑ تھی کہ وہ خود کو نام جانی کہلوانا پسند کرتا تھا۔ ہر کوئی کالج اور دوستوں کے حلقے میں اُس کی دلی خواہش کا احترام کرتا تھا۔ لیکن صحیح معنوں میں میرا جانی تھا۔ میرا دن کا ہی نہیں، شب کا ساتھی بھی تھا۔ اُس نے بمبئی کی ہر سڑک پر اپنے پیروں کی چھاپ میرے ساتھ چھوڑی تھی۔ ہر گلی کی بدبو اور خوشبو بھی میرے ساتھ سونگھی تھی۔ پتی کے اخیر جونی میں پیدا ہونے والوں کی تفریح بھی میرے ساتھ کی تھی۔ مگر وہ تھا بڑا زمانہ ساز۔ مجھ سے کم پڑھا لکھا ہونے کے باوجود دنیاوی معاملات میں مجھ سے کئی قدم آگے تھا۔ آنے والے وقت پر یوں آنکھ رکھتا کہ موقع ملتے ہی اُسے ہڑپ کر لیتا۔ وہ کوئی بھی موقع ہاتھ سے گنوانے کے حق میں نہ تھا۔ ذاتی مفاد کو خود سے الگ کرنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ اس کے بدلے سیدھے سادے دوستوں کا نقصان بھی کر ڈالتے۔ اُن میں میں بھی شامل تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے اُس سے اُنس تھا، محبت تھی۔ اس لیے کہ ہر شخص میں چند خامیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ جن کی بنیاد پر اُس کی دیگر خوبیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُن ہی دنوں اُس نے یونیورسٹی کی ایک لیکچرار سے، جو عمر میں اُس سے چار پانچ سال بڑی تھی اور جسے برطانیہ سرکار کی طرف سے انگلینڈ آنے کا پروانہ بھی مل چکا تھا، اپنا جال اتنی چابکدستی سے پھینکا کہ وہ اس میں اُلجھ کر رہ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ جانی پر تن من دھن سے فدا ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ جانی انگلینڈ جانے کے خواب دیکھنے لگا۔ چند ہی ہفتوں میں اُس کے خواب حقیقت میں بدل گئے، جب وہ معمولی ناک نقشہ، متناسب قد کاٹھ اور فربہ بدن رکھنے والی لیکچرار سے شادی کر کے لندن روانہ ہو گیا اور وہیں اُس نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ابتدا میں وہ اپنے حال واحوال سے ضرور آگاہ کرتا رہا۔ پھر ہمارے درمیان "وقت" آنکھ سے دور، دل سے دور کی صورت اختیار کر بیٹھا۔ یوں بھی وقت جدید اور مادہ پرست دنیا میں خدا سے اونچا رتبہ رکھتا ہے۔ اِس کارن فاصلے ہمارے درمیان اتنے بڑھ گئے تھے کہ صرف نئے سال کے موقع پر ہی مبارکباد کا کارڈ آنے لگا۔ لیکن اُسے موصول کرنے پر بھی مجھے خوشی ہوا کرتی تھی کہ میرا یار زندہ ہے اور وہاں کے مزے لوٹ رہا ہے۔ پھر یہ سلسلہ بھی جلد ختم ہو کر رہ گیا۔

کمپنی کا ایک انگریز ملازم مجھے ایئر پورٹ سے مرکزی لندن کے ایک سستے سے ہوٹل میں چھوڑ کر چل دیا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ مجھے فلیٹ کی چابی چند دنوں میں مل جائے گی۔ تب تک میں لندن شہر کا نظارہ کروں اور موسم کے تیور دیکھوں۔ نہا دھو کر تازہ دم ہو کر میں نے جانی سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ شام کے آٹھ بج رہے تھے۔ ہر طرف اُجالا تھا۔ یورپ میں موسم گرما کی شام خاصی لمبی ہوا کرتی ہے۔ کہیں نو بجے کے بعد اندھیرا اپنے پاؤں وا ہوتا ہے۔ اُمید نہیں تھی کہ جانی گھر پر ہوگا۔ مگر خلاف توقع وہ گھر پر ہی تھا۔ اُسی نے ریسیور اٹھایا۔ بات چیت کے دوران بار بار مجھے احساس ہوا کہ شاید غلط نمبر لگ گیا ہے اور میں کسی ہندوستانی کے بجائے انگلش آدمی سے ہم کلام ہوں جس کا لہجہ، تلفظ، جملوں کی ساخت، الفاظ کی بندش سراسر میرے لئے اجنبی تھے اور باوجود کوشش کے کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ لیکن ایک میں تھا کہ اپنی زبان بولنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ مگر وہ میری ہر بات کا جواب انگریزی میں دیئے جا رہا تھا۔ میں جھنجھلا اُٹھا اور غصے میں بولا: "ارے او شیکسپیئر کی اولاد تم سالے انگریز کب سے بن گئے؟ اپنی اوقات پر آؤ اور مجھ سے اپنی زبان میں بات کرو۔" خاموشی چھا جانے پر مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ میرے تیز جملے اس پر اثر کر گئے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ مگر اُس نے مجھے اپنے گھر پہونچنے کی تفصیلی ہدایات دیں اور میں نے اُس سے بروز سنیچر ملنے کا وعدہ کر لیا۔

جانی لندن کے ایک امیر علاقے ایلنگ براڈوے میں مقیم تھا۔ جو میرے علاقے سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں صبح سے ہی اپنے یار سے ملنے کو مشتاق تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے مقررہ وقت سے پہلے ہی اُس کے مقام پر پہنچ کر مکان کی اطلاعی گھنٹی بجا دی۔ دروازہ وا ہونے تک میں نے آگے کا مختصر سا باغیچہ دیکھا، جو خوشبودار پھولوں سے لدا پھندا تھا۔ ڈرائیو وے میں دو چمچماتی کاریں بھی کھڑی تھیں۔ دروازہ کھلا تو جانی قیمتی لباس پہنے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ میرا خیر مقدم کر رہی

تھی۔ میرا چہرہ بھی ویسی ہی دلکش مسکراہٹ سے بھر گیا تھا، جس کے پیچھے برسوں کی یادیں، باتیں، واقعات اور زندگی کے کتنے کونے چھپے ہوئے تھے۔ بازو پھیلا کر میں اُس سے بے تحاشہ لپٹ گیا۔ وہ بھی مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ کچھ دیر تک ہم بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ مگر اُس کی گرفت میں وہ برسوں پہلے والی گرمجوشی نہ تھی۔ بانہوں میں وہ دباؤ نہ تھا۔ خون میں وہ گرمی نہ تھی۔ تاہم اُس نے میری پشت سے ہاتھ نہ ہٹایا اور اُسی انداز میں "پلیز کم اِن۔ کم اِن" کہتا مجھے لاؤنج میں لے آیا۔ صوفے پر بیٹھ کر میں نے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ بے حد خوبصورت لاؤنج تھا۔ قیمتی فرنیچر سے سجا ہوا، جو امیر طبقے کے گھروں کا ہوا کرتا ہے۔ اگلے پل ہی میری آنکھوں میں ہوسٹل کا وہ بے ترتیب اور مختصر سا کمرہ گھوم گیا، جہاں جانی رہا کرتا تھا۔ میں سوچتا رہ گیا کہ آدمی وقت کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے اور کیا سے کیا حاصل کر لیتا ہے؟ مگر جانی بڑا زیرک تھا اور ہوشیار بھی۔ فوراً میرے ذہن سے ہو کر میری سوچ تک پہنچ گیا تھا۔ ہونٹوں پر اپنے مخصوص انگریزی لب و لہجے میں گویا ہوا:

"اگر میں انڈیا میں رہ جاتا تو ہوسٹل کے کمرے سے ایک اوسط درجے کے فلیٹ تک ہی پہنچ پاتا؟"

"یہ محض سوچ کی بات ہے۔"

"EXACTLY وہاں لوگ زیادہ ہیں اور مواقع کم ——— نظام کا ڈھرا کچھ یوں رکھا گیا ہے کہ ہمارے واسطے وہاں جدوجہد کے سوا اور کچھ نہ تھا۔"

"تم کچھ بھی کہو ——— مگر ہے وہ ہمارا اپنا دیش ——— یقین کرو مجھے آئے ہوئے چند روز ہی ہوئے ہیں۔ مگر اپنا دیش رہ رہ کر یاد آ رہا ہے۔"

"شروع شروع میں ایسا ہوتا ہے ——— لیکن وقت گزرنے پر بہت کچھ بدل جاتا ہے۔" اس نے سگریٹ سلگایا اور اپنی بات کو جاری رکھا:

"یہاں کی سوسائٹی بڑی انوکھی ہے۔ پہلے برس میں وہ نوواردوں کی ذہنی نسوں تک کو ہلا دیتی ہے اور وہ واپس جانے کی سوچتا ہے۔ پھر دوسرے برس میں اُس کی نسیں معمول پر آنے لگتی ہیں اور تیسرے برس یہ سوسائٹی اُس کی ذات میں یوں رچ بس جاتی ہے کہ پھر وہ دنیا کے کسی خطے میں بھی نہیں رہ پاتا۔"

اُس نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ مجھ کو مجبوراً کہنا پڑا:

"تم تو یہاں کی سوسائٹی کا تجزیہ کر ڈالے بیٹھے ہو؟"

"تم کہہ سکتے ہو کہ ہاں ——— دراصل یہاں کی سوسائٹی پڑھے لکھے آدمی کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اُس کی جڑیں کہاں ہیں؟"

پھر میرے استفسار کرنے پر کہ اُس کی پروفیسر بیوی دکھائی نہیں دے رہی اور اب وہ کتنے بچوں کا باپ بن چکا ہے کہ مجھے صرف ایک کا علم تھا۔

اُس نے فخریہ بتایا کہ اب وہ دو بیٹوں کا باپ ہے۔ بڑا آٹھ برس کا ہے اور چھوٹا سات کا۔ وہ ان دنوں اپنی ماں کے ساتھ انڈیا گئے ہوئے ہیں۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا:

"تم کیوں نہیں گئے؟ چھٹی نہیں ملی کیا؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے ——— میں گیا تھا پچھلے برس ایک ماہ کے لئے ——— مگر مشکل سے پندرہ روز وہاں رہ پایا ——— وہ بھی گھر والوں کے اصرار پر۔"

"کیوں دل نہیں لگا وہاں؟"

اُس کے چہرے کی رنگت گہری ہو گئی تھی۔ آنکھیں اُداس ہو گئی تھیں۔ گویا پچھتاوے کا کوئی احساس ہو، جو اُسے تنگ کر رہا ہو اور وہ اس سے نجات پانا چاہتا ہو۔ بولا:

"مجھے وہاں کی ہر شے بدلی بدلی سی لگی؟"

"ہاں یہ تو ہے۔ بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں وہاں ——— اپنے دیش نے خوب ترقی کی ہے۔ سماج کا ڈھانچہ بھی بدل گیا ہے۔ غربت بھی کافی حد تک دور ہوئی ہے۔"

"یقین جانو۔ برسوں پہلے جن ہری بھری اشیاء، دوستوں اور رشتہ داروں سے میرا تعلق تھا، وہ سب کے سب مجھے بیگانے لگے۔" وہ کہتے کہتے اچانک رک گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بے دلی سے بولا: تم کہہ سکتے ہو کہ میں بدل گیا ہوں۔ میرے سوچنے سمجھنے اور دیکھنے کا ڈھنگ بدل گیا ہے ——— یقین کرو میں وہاں خود کو اجنبی محسوس کر رہا تھا؟"

"اجنبی؟ میں ششدر اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنے ہی دیش میں خود کو اجنبی محسوس کر رہا ہو؟ جبکہ اُس کا خمیر اپنے دیش کی دھرتی، مٹی اور تہذیب سے اُٹھا ہو؟ آدمی اپنے دیش سے کتنا بھی دور کیوں نہ چلا جائے، وہ جذباتی طور پر اُس سے جڑا رہتا ہے۔ مگر جانی زیرک تھا۔ ایک بار پھر میرے ذہن سے ہو کر میری سوچ تک پہنچ گیا تھا۔

"مجھے غلط مت سمجھنا ——— مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے واسطے اب وہاں کچھ باقی نہیں رہا۔ کوئی بھی پرانا مسجد، مندر، چوراہا، سڑک، مقام، ریستوران، عمارت، گہری یاری ایسی نہیں رہی جو مجھ کو اپنی طرف کھینچتی ہو یا میرے واسطے کوئی کشش رکھتی ہو۔"

"یعنی ہر شے کے ساتھ تمہارا رشتہ ختم ہو چکا ہے؟"

"تم کہہ سکتے ہو کہ ہاں ——— اور اگر ہے بھی تو وہ محض برائے نام ہے ——— دراصل وہ اپنی طاقت کھو بیٹھا ہے۔"

"طاقت کھو بیٹھا ہے؟ ——— وہ کیسے؟" میری حیرانگی بڑھ رہی تھی۔

خاموش رہ کر اُس نے مجھے اِس انداز سے دیکھا کہ وہ جو کچھ کہنا چا
رہا ہے میں اُس کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں یا نہیں؟ ۔۔۔۔ دھیرے سے اُس
نے اپنے لب کھولے

"اُس کی وجہ موجودہ زندگی، فاصلے اور دوری ہے ۔۔۔۔ برسوں
یہاں رہ کر میں وہاں کی ہر شے سے غیر شعوری طور پر کٹتا چلا گیا۔ اُس کا ہوتے
ہوئے اپنی اہمیت کھونا قدرتی امر تھا۔ میں یہاں کی زندگی میں اتنا ڈوب گیا کہ وہ
میری ذات کا حصہ بن گئی اور وہاں کی ہر شے مجھ سے چھنتی چلی گئی۔ اِس کا احساس
مجھے بڑا پیچ کر ہوا۔"

خاموش رہنا ہی میرے لئے مناسب تھا کہ اُس نے مجھ اِس طرح
کا غیر دلچسپ اور خشک موضوع چھیڑ ڈالا تھا کہ مجھ جیسے شخص کو اس میں زیادہ دلچسپی
نہ تھی۔ میں تو اِس خیال میں تھا کہ وہ شکریہ ادا کرتے ہی پوچھے گا کہ میں بیتے سالوں
میں کیا کیا کرتا رہا؟ زندگی نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ شادی کی یا نہیں؟
اِن دنوں کیا کر رہے ہو؟ انگلینڈ کیسے آنا ہوا؟ کب تک یہاں ٹھہرنے کا ارادہ
ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

کچن سے لوٹ کر اس کے ہاتھوں میں دو بھرے چھلکتے پیالوں کی پلیٹیں
تھیں۔ کیبنٹ سے وہسکی کی بوتل نکال کر وہ گلاس بنانے میں مصروف ہو گیا۔
میں نے پہلو بدل کر لاؤنج کے ہر کونے پر نگاہ ڈالی۔ بغور جائزہ لینے پر بھی مجھے
کوئی حصہ، کوئی شے ایسی دکھائی نہ دی، جس سے ہندوستانی ثقافت کا کوئی رنگ
جھلکتا ہو اور نو وارد کو فوری احساس ہو کہ وہ کسی ہندوستانی گھر میں بیٹھا ہوا
ہے جبکہ میں اپنے آشناؤں کے گھروں پر کیا کچھ نہیں دیکھ چکا تھا۔ کہیں ٹیلی
وژن پر چھوٹا سا مور پنکھ پھیلائے کھڑا ہے تو کہیں پنجاب کی نئی نویلی دلہن گڑیا کے
روپ میں کارنر پر سجی رکھی ہے۔ کہیں مراد آبادی گل دان دھرا ہے تو کہیں کشمیری
لیمپ اسٹینڈ۔ کسی کونے میں بھگوان شو کا بت رکھا ہے تو کسی دیوار پر گورو نانک
جی کی تصویر آویزاں ہے۔ پھر صاحب خانہ نے چھوٹتے ہی اپنے دیش کے
بدلتے ہوئے سیاسی، معاشی اور ملکی حالات جاننا چاہے تھے۔ کسی گھر میں
میزبان نے دیش کی بڑھتی ہوئی آبادی، کرپشن، مہنگائی اور فرقہ وارانہ کشیدگی
کے متعلق جاننا چاہا تھا۔ غرضیکہ میں ہر جگہ ایک ہی احساس سے دوچار ہوا تھا کہ
وہ تمام لوگ ہزاروں میل دور رہ کر بھی اپنے دیش کے کتنے قریب ہیں اور ہر لحاظ
سے اس کی بہتری کے خواہشمند ہیں۔ مگر ایک جانی تھا، جس نے اپنی ہی ڈیڑھ
اینٹ کی مسجد بنا رکھی تھی اور خود ہی تو اِن دنوں سے بھاگا تھا۔ کیا وہی آدمی مختلف حالات
میں مختلف پایا جاتا ہے؟ اِس سوچ کے ساتھ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ موضوع
بدل دیا جائے۔ لہٰذا گلاس ٹکرا کر میں نے پوچھا: "سنا ہے اِس علاقے میں اپنے
لوگ کافی رہتے ہیں؟"

"ساؤتھ ہال کا علاقہ ہم سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں بھاری
تعداد میں اپنے لوگ آباد ہیں۔۔۔۔ لیکن میں بہت کم کو جانتا ہوں۔۔۔۔ جن کو
جانتا بھی ہوں، ان کو فاصلے پر رکھتا ہوں؟" اس نے رک رک کر بے دلی سے
جواب دیا تھا۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ پایا:

"تم ان سے ملنا پسند نہیں کرتے یا وہ اس قابل نہیں ہیں کہ تم تک
پہنچ پائیں؟"

"تم کچھ بھی سمجھ لو۔" یہ کہہ کر وہ ماضی میں کھو گیا: "میں تازہ تازہ
جب اس دیش میں سیٹل ہوا تھا تو اپنے لوگوں سے دل کھول کر ملتا تھا۔۔۔۔ لیکن
آہستہ آہستہ دور ہوتا چلا گیا۔"

"کیوں؟ ۔۔۔۔ کوئی خاص وجہ تھی؟"

"یہاں ہر کوئی پیسہ بنانے کی غرض سے آیا ہے۔ ہر کسی کو سونے کی
تلاش ہے ۔۔۔۔ پھر جب ہم کو احساس ہوا کہ پڑھے لکھے اور اَن پڑھ طبقے کی
سوچ الگ الگ ہے اور ہم میں تہذیبی فاصلے بھی موجود ہیں تو ہم اُن سے دور
ہوتے چلے گئے۔"

"یعنی یہاں کوئی انڈین فیملی ایسی نہیں، جس سے تمہارے گھریلو
تعلقات ہوں؟"

"نہیں ایسا تو نہیں ہے ۔۔۔۔ دو تین تعلیم یافتہ خاندان یہاں
ضرور ہیں جو ہمارے بہت قریب ہیں۔ وہ بھی ہم جیسی سوچ رکھتے ہیں۔ اُنہوں
نے بھی شروع میں وہی محسوس کیا، جو ہم نے کیا تھا؟"

"یہ تو خوشی کی بات ہے ورنہ پردیس میں آدمی اپنوں کے بغیر رہ
نہیں پاتا؟"

اس کے ہونٹوں پر جانے کیوں ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی جو
برملا میرا مذاق اُڑائے جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں ذرا بھی نہیں آ رہا تھا کہ میں نے
ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ اُس کے چہرے کے تاثرات بدل کر رہ گئے ہیں۔ چند گھونٹ
بھرنے پر وہ مزید شاداب دکھنے لگا۔ مجھے سمجھاتے ہوئے مخاطب ہوا:

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں پردیس میں نہیں، اپنے دیش میں رہتا
ہوں۔ میں نے یہاں کی شہریت حاصل کر لی ہے ۔۔۔۔ اب میں انڈین نہیں،
برٹش ہوں اور یہ میرا دیش ہے۔"

اس کی باتوں سے زیادہ اُس کی شراب مجھ پر اثر چھوڑ رہی تھی۔
مگر یہ جان کر کہ اب وہ برٹش ہے اور یہ اس کا دیش ہے، غصہ آنے لگا۔ میں نے
بوتل اٹھا کر ایک جام اور چڑھایا:

"مگر جانی تم تو اپنی صورت سے مجھ کو ہندوستانی دکھ رہے ہو۔ تم
برٹش کیسے بن گئے؟"

"وہ یوں کہ میرے پاس برٹش پاسپورٹ ہے اور اُسے میں نے
سوچ سمجھ کر حاصل کیا ہے۔ میرے اندر غصے کا طوفان اُمڈ آیا تھا۔ دل نے فلک

شگاف تھا جسے بلند کرنا چاہا مگر میں نے دل کو مارا، ہنسی کو دبایا اور خواہش پر پہرہ بٹھا کر تصدیق کرنی چاہی:

"میں سمجھ گیا۔۔۔۔۔ یہاں کی شہریت حاصل کر لینے پر اب تم کو انگلینڈ سے کوئی نکال نہیں سکتا؟"

"تم غلط سوچ رہے ہو۔ انڈیا سے لوٹنے پر میں نے برٹش پاسپورٹ حاصل کیا ہے۔۔۔۔۔ ماحول کا اثر گہرا ہوتا ہے۔ میں جہاں ملازم ہوں وہاں سب انگلش کام کرتے ہیں۔۔۔۔۔ میرا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، گھومنا پھرنا زیادہ تر اُن ہی لوگوں کے ساتھ رہتا ہے۔۔۔۔۔ پھر میری مسز کے جاننے والے بھی تمام انگلش ہیں۔ ہمارا دیکھنا، سوچنا اور جیون گزارنے کا ڈھنگ بدل چکا ہے۔"

"مگر تم اوپر سے نیچے تک بدل چکے ہو۔ تاہم زندگی کے ہر موڑ پر تم انڈین ہی کہلائے جاؤ گے؟"

اس نے آنکھیں سکوڑ کر مجھے اس انداز میں دیکھا کہ وہ میری بات سمجھ کر بھی کچھ نہ پایا ہو؟ میں اس سوچ میں تھا کہ جو حقیقت وہ برسوں یہاں رہ کر بھی کچھ نہ پایا، میں چند دنوں کے قیام کے بعد ہی جان گیا تھا، بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ تو بلا کا دانا اور زیرک ہے کیا اُسے اتنا بھی علم نہیں کہ اس کے چہرے مہرے پر اپنے چھوڑے ہوئے دیش کا نام لکھا ہوا ہے جو مرتے دم تک لکھا رہے گا؟ پھر وہ برٹش کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ جس نسل سے اس کا تعلق ہے اس کی جڑیں ہندوستان میں ہیں وہ یہاں نہیں۔ البتہ آنے والی ایشیائی نسل ضرور برٹش ہوگی، مگر اُسے بھی شناخت کا مسئلہ درپیش رہے گا۔ میرے دونوں نے واقعی اُسے الجھا ڈالا تھا۔ کبھی وہ دانتوں سے ہونٹ کاٹ رہا تھا تو کبھی تلخ حقائق میں اُتر رہا تھا۔ گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرتا رہا۔ پھر مخاطب ہوا تھا:

"مت بھولو کہ اب ہمیں یہیں رہنا ہے۔۔۔۔۔ اس دیش کو اپنا کر اس کا اٹوٹ حصہ بننا ہے۔۔۔۔۔ مقامی لوگوں کو ہم سے یہی شکایت ہے کہ ہم اُن سے پرے پرے رہتے ہیں؟ یہاں کی سوشل لائف میں بڑھ چڑھ کر شامل نہیں ہوتے؟۔۔۔۔۔ اگر ہمارا رویہ نہ بدلا تو ہم مرکزی دھارے سے ہمیشہ کٹ کر رہیں گے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ حالانکہ میرے اندر کوئی شے مجھے شدت سے اُکسا رہی تھی کہ اُس کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے کو نوچ کر اُسے آگاہ کروں کہ شہریت بدلنے سے سرکاری نظروں میں شناخت ضرور بدل جایا کرتی ہے مگر عوام کی نظر میں نہیں؟ اسے بدلنے کے واسطے آدمی کو اپنا رنگ روپ، چمڑی سب بدلنا پڑتا ہے جو ممکن نہیں؟

پی پلا کر میں نے اجازت چاہی۔ اُس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ شام ہو چلی تھی۔ لیکن اُس نے میرا دل رکھنے کی خاطر اتنا بھی نہ کہا کر کھانا کھا کر جانا۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ وہ مجھے اپنی کار میں ضرور چھوڑ آتا، جہاں کہیں بھی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ مگر اُس نے میرے آنے کی خوشی میں چھلکنا دبا لی ہے اُسے ڈر ہے کہ کہیں وہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھ جائے ورنہ وہ ڈرائیونگ لائسنس سے بھی جاتا رہے گا۔ میں کہنا چاہتا تھا: "یار زندہ صحبت باقی۔" مگر میرے لبوں نے ساتھ دینے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ وہ دروازے تک میری کمر میں ہاتھ ڈالے مجھے چھوڑنے کو آیا اور مصافحہ کرتے ہوئے بولا:

"ملتے رہنا۔ BE IN TOUCH"

لیکن میرے ہونٹوں میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ نہ کوئی مسکراہٹ اُبھری اور نہ ہی میں نے اُس کے کہے کا کوئی نوٹس لیا۔ میں پتھرایا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

انڈرگراؤنڈ اسٹیشن کی طرف بڑھتے ہوئے میرا جذباتی توازن اتنا بگڑ چکا تھا کہ وہ ناقابل بیان ہے۔ میں جیون میں کبھی اتنا مایوس نہیں ہوا جتنا جانی سے مل کر ہوا تھا۔ آدمی کتنا بھی کامیاب کیوں نہ ہو جائے؟ کتنا بھی اونچا سماجی رتبہ کیوں نہ حاصل کر لے؟ کتنا بھی مالدار کیوں نہ بن جائے؟ مگر کسی دیرینہ دوست سے مل کر وہ سب کچھ فراموش کر بیٹھتا ہے اور تمام دیواروں کو گرا کر برابری کی سطح پر کچھ دیر کے واسطے، پھر سے جی اُٹھتا ہے مگر جانی میں اتنا بھی خلوص نہ رہا تھا کہ وہ مجھ سے برائے نام ہی پوچھ لیتا کہ میں انگلینڈ کس غرض سے آیا ہوں؟ کہاں ٹھہرا ہوں؟ کیا کرنے کا ارادہ ہے یہاں؟ مگر اُس سے میرے ساتھ یوں برتاؤ کیا تھا، جیسے کوئی واقف کار کسی شخص سے ملنے اُس کے گھر چلا جائے لیکن میزبان مہمان کا مقصد جانے بغیر اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ کر اُسے چائے کا پیالہ پلا کر چلتا کر دے۔ مگر جانی نے مجھ کو چائے کی جگہ شراب پلائی تھی اور وہ بھی اسکاچ۔

مجھے فلیٹ کی چابی مل گئی تھی۔ کمپنی کے پہلے والے ملازم نے فلیٹ کو نہایت قرینے سے رکھا تھا۔ فوراً ہی میں نے اپنے دور دراز کے رشتہ داروں اور آشناؤں کو اپنی رہائش گاہ اور فون نمبر آگاہ کرنا چاہا۔ اُس وقت مجھے جانی کا بھی خیال آیا، جو [illegible] سے میرے ساتھ رہا تھا۔ لیکن؟؟ عزت نفس میرے آڑے آ گئی تھی۔ ضمیر کے آگے اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں۔ انہیں گرانا یا پھلانگنا میرے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ اس لئے کہ ایک انڈین اور ایک برٹش شخص کی سوچ میں ہمیشہ سے فرق رہا ہے۔

میں پابندی سے اپنے کام کاج میں جٹ گیا۔ مجھے نئے معاشرے کے تضادات، اقدار و روایات، مقامی لوگوں کی سوچ، رویے اور ہر گام زندگی کے مختلف پہلو سمجھ میں آنے لگے۔ آدمی کا ذہن کچھ کھلا ہو اور وہ نظر بھی تیز رکھتا ہو تو اُسے اندھیرے میں بھی چیزیں دکھنے لگتی ہیں۔ میں نے بھی دیکھا اور بھی جانا کہ سوسائٹی کی بنیاد INDIVIDUALISM پر رکھی گئی ہے۔ کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے معاملے میں دخل دینا پسند نہیں کرتا۔ کوئی دوسرے کی مدد نہیں

کرتا۔ ہر کوئی اپنے مسائل خود حل کیا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ محض اپنے لیے زندہ ہے۔ اُسے نہ تو دوسرے سے کوئی ہمدردی ہے اور نہ ہی کوئی واسطہ۔ بس وقتی ضرورت خود ساختہ معاشرے میں ایک پھلتی پھولتی، سوتی جاگتی اکائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا فیملی یونٹ کمزور قرار دیا گیا ہے۔

میرے قیام کو قریب قریب ایک برس ہو چکا تھا۔ اُن ہی دنوں ملک کے پارلیمانی انتخابات کا اعلان ہوا۔ تاریخ مقرر کر دی گئی۔ اہم سیاسی پارٹیاں لیبر، ٹوری اور لبرل کے سربراہ اور سیاست دان مکمل جوش و خروش سے اپنے خیالات اور پالیسیوں کا اظہار کرنے لگے۔ ٹوری پارٹی کی لیڈی لیڈر نے مارگیریٹ تھیچر (مسز تھیچر) کی بڑھتی ہوئی آبادی کو اُن کا کاروباری میدان میں بے پناہ کامیابی کے ساتھ مزید پھیلا ؤ اور سوسائٹی میں اپنی جڑوں کو مضبوط ہوتا دیکھ کر اپنی ایک تقریر میں اپنے چند ایک ایسے جملے ادا کیے کہ نسلی تعلقات کی فضا مکدر ہو کر رہ گئی۔

"PEOPLE SAY OUR CULTURE WILL BE SWAMPED. OUR VALUES AND TRADTIONS WILL BE IN DANGER "

اِس تقریر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ سفید بر اوری کے دلوں میں، تارکین وطن کے لئے ناپسندیدگی اور نفرت کی دبی ہوئی لہر پھر سے اُبھر آئی۔ میڈیا نے ہمیشہ کی طرح امگریشن کے سنگین مسئلے کو اچھالا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بحث مباحثے شروع ہو گئے۔ لیبر اور لبرل پارٹیوں کے ذمہ دار سیاست دانوں نے دائیں بازو کی لیڈی لیڈر کے خیالات کی پُر زور مذمت کی۔ مگر نسلی تناؤ میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ وہ روز بروز بڑھنے لگا۔ رد عمل یہاں تک ہوا کہ ایک ایشیائی نوجوان کو لب سڑک قتل کر دیا گیا۔ مندر، مسجد، اور گوردوارے پتھراؤ کی زد میں آ گئے۔ کئی دکانیں توڑ پھوڑ دی گئیں اور اُن کے مالک سہمے سہمے خود کو پردیس میں انتہائی غیر محفوظ پانے لگے۔ لیکن میں ان تمام واقعات سے دور اِس سوچ میں گم تھا کہ اکثر میرے دنیا کے ہر علاقے میں انگلینڈ کو ''گھر'' سمجھا کرتی ہے اور اُسے گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور کرتی ہے۔ میں ہر صبح کام پر جاتے ہوئے اور شام کو لوٹتے وقت بھی تنا ور ہتا تھا۔

ایک صبح دفتر جاتے وقت میں شیفرڈ بش اسٹیشن سے لوکل ٹرین میں داخل ہوا۔ ڈبہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے نشست پانے کی خاطر ہر کونے پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں ایک نشست پر جانی کو بیٹھا دیکھ کر میں حیران رہ گیا، بلکہ اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہ آیا۔ وہ پوری کائنات سے بے خبر کتاب پڑھنے میں گم تھا۔ اُسے ٹیوب سے سفر کرتا دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا کہ وہ ہمیشہ اپنی کار سے دفتر جایا کرتا تھا۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ اگلے اسٹیشن پر اس کے ساتھ بیٹھا ہوا انگریز مسافر اُتر گیا اور میں جلدی سے خالی نشست کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے وہاں پا کر جانی کو بھی سخت حیرانی ہوئی۔ وہ مسکراتے ہوئے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھ کو دیکھا رہا۔ میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ کوٹ کی جیب میں سے دایاں ہاتھ نکالتے نکالتے رک گیا۔ اُس کا ہاتھ پلاسٹر اور پٹی میں لپٹا ہوا تھا۔

''کیا ہوا ہاتھ پر؟''

''کچھ نہیں۔۔۔۔ معمولی سی چوٹ آئی ہے۔۔۔۔ کام پر جا رہے ہو؟''

''ہاں۔ تم کو کیسے پتہ چلا کہ میں کام پر جا رہا ہوں؟''

''اتنی صبح تو لوگ کام پر ہی جایا کرتے ہیں۔''

ہم دونوں ہنس دیئے۔ وہ شکایت کرنے لگا کہ میں ایک ہی ملاقات کے بعد غائب ہو گیا۔ دوبارہ ملنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی فون پر رابطہ رکھا۔ خیال آیا کہ اُسے دل کھول کر اتنی سناؤں کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ مگر صبح کا وقت تھا، کیوں اپنا موڈ خراب کیا جائے؟ مگر یہ کہے بنا نہ رہا گیا:

''بڑی نادان جانی۔ زندگی کے سفر میں آدمی سب سے زیادہ اہمیت خود کو اور اپنی ذات کو دیتا ہے۔ رشتہ دار، دوست یار، واقف کار سب بعد میں آتے ہیں۔۔۔۔ پھر میں تو ٹھہرا پردیسی؟۔۔۔۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''

میرا سوچا سمجھا طنز اور گہری چوٹ پریشان کُن تھی۔ لیکن وہ بجھا بجھا سا ماتم گردن جھکائے ہوئے جھیل گیا تھا۔ ایک لمبا سانس بھر کر اُس نے باہر کو چھوڑا اور کتاب کو جھولی میں رکھ کر بایاں ہاتھ چہرے پر پھیرنے لگا۔

گاڑی اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا اسٹیشن گزر رہا تھا۔

''کیا بات ہے آج تم ٹیوب سے سفر کر رہے ہو؟ تمہاری کار کا کیا ہوا؟''

یہ سننا تھا کہ وہ اتنا گمبھیر ہو گیا کہ وہ مجھے کوئی غیر شخص ہی دکھائی دیا۔ دُکھ اور افسوس سے بولا:

''اب تم سے کیا چھپانا۔۔۔۔ اپنی کار رائٹ آف (WRITE OFF) ہو گئی ہے۔''

''کہیں ایکسی ڈینٹ ہوا ہے کیا؟''

''ایکسی ڈینٹ ہی سمجھ لو۔۔۔۔ یہ تو اچھا ہوا میں بچ گیا۔''

اُس کے چہرے پر آتے جاتے رنگ اور ذہنی کیفیت سے عیاں تھا کہ جس کربناک اور تکلیف دہ حادثے سے وہ گزرا ہے اُسے بیان کرنے پا نہیں؟ لیکن لگے ہی جب اس نے مجھے نہایت چاہت سے دیکھا تو لگا کہ میرا پرانا جانی میرے برابر بیٹھا ہوا مجھے اپنے دُکھ درد میں شریک ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ بڑے کرب سے بولا:

''پچھلے دنوں یہاں نسلی تناؤ بہت زیادہ تھا۔۔۔۔ ایک شام ایک پب (PUB) سے میں تھوڑی سی پی کے نکلا تو باہر چھ سات انگریز جوان کھڑے

۔ باقی: شاعر کا جہاں اور ہے میں۔

وراثت

ناصر بغدادی (کراچی)

عبداللہ نے اس شخص کو حیرت سے دیکھا جس نے یہ بات اُس شخص کے گوش گزار کی تھی جس کے متعلق وہ تو یہی سمجھتا تھا کہ اس کا ظہور پذیر ہونا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ اس کے نزدیک پہاڑ روئی کے گالے بن کر فضا میں منتشر ہو سکتے تھے، گائے دودھ کی بجائے پانی دے سکتی تھی، اور مرد کے بطن سے بچے پیدا ہو سکتے تھے لیکن اس بات کا معرضِ وجود میں آنا ممکن تھا اُس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اس لئے وہ تیسری مرتبہ پھر پوچھ بیٹھا۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"کتنی مرتبہ یہ بات پوچھیں گے جناب؟" وہ شخص بھی شاید اس کے بار بار استفسار سے تنگ آ گیا تھا۔ "بھلا مجھے جھوٹ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور اس کی مجھے جرأت بھی کیسے ہو سکتی ہے؟ میں تو اُن کا ایک معمولی نوکر ہوں۔ اگر میری شکایت ہو گئی تو پھر نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

"اچھا اُن سے کہنا میں حاضر ہو جاؤں گا"

اُس شخص کے جانے کے بعد عبداللہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ بڑی عجیب کشمکش پیدا ہو گئی تھی جس کے باعث اُس کا ذہن بہت دیر تک غور و خوض کے ریگ زاروں میں بھٹکتا رہا۔ حیرت کے ساتھ اس کے دل میں خوشی کے شادیانے بھی بج رہے تھے۔

اس کرۂ ارض پر اس کے باپ کے سوا کسی کو اُس سے اس قدر نفرت نہیں تھی۔ اس کے دل میں عبداللہ کے لئے شر کے اس قدر سخت جذبات و احساسات موجود تھے جو کبھی پگھلے تھے اور نہ کوئی زمانہ انہیں کمزور کر سکا تھا۔ وہ تو وقت بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہی گئے تھے۔ اگر قانون اُس کو معاف کر سکتا تو شاید وہ نفرت کے زیرِ اثر عبداللہ کا گلا ہی دبا کر اُس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا۔ ویسے فطرتاً اُس کا باپ بے حد رحم دل، بے حد نیک اور امرت دھارے کی طرح شیرینی سے بھرپور تھا۔ اُس کا زیادہ تر وقت حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتے ہوئے، یتیموں، بیواؤں کی مدد کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ کبھی اس کے گھر سے کوئی فقیر خالی ہاتھ نہیں گیا تھا۔ اس کے حلقہ بگوشوں میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کا احسان مند نہ ہو۔ ہر ایک اُس کو پارسا اور فرشتہ صفت تسلیم کرتا تھا لیکن اپنے بیٹے عبداللہ کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ نتھنے کسی غصیلے بیل کی طرح پھول جاتے تھے، سانسیں تیزی سے چلنے لگتی تھیں۔ عبداللہ تو دور کی بات، اُس کی پرچھائیں بھی اُس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ نہ تو عبداللہ کی صورت دیکھنے کا روادار تھا، اور نہ ہی کسی سے اُس کا ذکر سن سکتا تھا۔

اگر کبھی اتفاق سے اُس کا کوئی دوست اُس کے سامنے عبداللہ کا دردناک پیرائے میں تذکرہ کرتا، اور اُس کو احساس دلانے کی کوشش کرتا کہ اُس کی حالت ناگفتہ بہ ہے، معاشی بدحالی نے اُس کی چولیں ڈھیلی کر دی ہے اس لئے باپ ہونے کے ناطے اُس کو عبداللہ کی مدد کرنی چاہیے۔ اور یہ کہ وہ لاکھ بُرا سہی، ناخلف سہی لیکن بیٹا تو اُسی کا ہے۔ بس پھر تو جیسے اتنا کچھ سننے کے بعد عبداللہ کا باپ بےقابو ہو کر رہ جاتا۔

"تم کون ہوتے ہو اُس کی سفارش کرنے والے؟" وہ انتہائی شدت سے برس اُٹھتا۔ پھر تو جیسے سمجھانے والے کی گھگھی بندھ جاتی، اور وہ بڑی مشکل سے سنبھل پاتا۔ بات بنانے کی کوشش کرتا کہ وہ عبداللہ کی سفارش نہیں کر رہا ہے بلکہ اس نے جس حال میں اُس کو دیکھا ہے وہ من و عن بیان کر رہا ہے اور یہ کہ کوئی بھی شخص کسی کو زبوں حالی میں دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ عبداللہ کی اسی طرح مدد کر سکتا ہے جس طرح دوسروں کی کرتا رہا ہے، باپ ہونے کے ناطے نہ سہی انسان ہونے کے ناطے تو وہ یہ کام کر سکتا ہے!!

"دوسرے لوگ اس ناخلف سے زیادہ مستحق ہیں۔" عبداللہ کے والد احسان اللہ کا جذباتی غصہ برقرار رہتا۔ "اگر میں اُس پر ایک کوڑی بھی خرچ کروں تو مجھے زندگی بھر افسوس ہوگا۔ اگر تمہیں اس سے اتنی ہمدردی ہے تو تم اُس کی حاجت روائی کرو۔ میں مدد کرنا تو دور کنار اُس کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتا۔"

احسان اللہ کی اپنے بیٹے سے نفرت ممکن ہے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہو لیکن بلاوجہ نہیں تھی۔ جوانی میں عبداللہ کو جو صحبت ملی تھی اس نے اُس کو کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ ذہن تعلیم سے ہٹ کر دوسری فضول چیزوں کی طرف راغب ہو گیا تھا۔ اُن دنوں احسان اللہ کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ آٹے کے دو ملیں چل رہی تھیں۔ خوشی کا دور دورہ تھا۔ اپنے ارد گرد دولت کی ریل پیل دیکھ کر عبداللہ بھی جامے سے باہر ہو گیا تھا۔ اس کی غلط حرکتوں کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ پچھلے تین برسوں سے وہ انتہائی ثابت قدمی سے میٹرک کے امتحان میں فیل ہوتا جا رہا تھا۔ تعلیم کے میدان میں اس کی نااہلی اور دوسرے کاموں میں کرداری کمزوری کے حوالے سے احسان اللہ کو بہت ساری شکایتیں بھی گاہے بگاہے ملتی رہی تھیں۔ لہٰذا اُس نے یہی سمجھا کہ عبداللہ کی تعلیمی مصروفیات کو مزید جاری رکھنا سراسر بلاجواز ہے اور وقت کا ضیاع بھی ـــــ چنانچہ حالات کے پیشِ نظر مناسب یہی تھا کہ اسے ملوں کی نگرانی کا کام سونپ دیا جائے۔

احسان اللہ نے تو یہی سوچا تھا کہ عملی زندگی کی تند جھٹکوں سے آنکھیں چار کرنے کے بعد عبداللہ کے قدم از خود صراطِ مستقیم کی جانب گامزن ہو جائیں گے۔ لیکن نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ عبداللہ نے اتنے قریب سے روپے کی جھنکاریں سنیں تو اپنے آپ سے باہر نکل آیا۔ شراب تو اُس نے منہ سے نہیں لگائی لیکن یار دوستوں کی مہربانی سے وہ ریس، جوے اور عورت بازی جیسی

چیزوں میں اپنا وقت ضائع کرنے لگا۔ ظاہر ہے ایسا کام جاری تو جاری نہیں رہ سکتے۔ کچھ عرصے بعد خاندان کے خیر خواہوں نے احسان اللہ کو آنکھوں دیکھا حال بیان کر دیا۔ چونکہ بیٹا جوان تھا اس لئے احسان اللہ نے اُسے سمجھایا۔ زندگی کے نشیب و فراز کی باریکیوں سے آگاہ کیا۔ لیکن اس کے باوجود عبداللہ کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تو اس نے اُسے دل پر جبر کرتے ہوئے روک دیا، اور جیب خرچ بھی بند کر دیا۔ اب اُسے یقین ہو گیا کہ عبداللہ راہِ راست پر آ جائے گا لیکن اس کی توقعات کی بساط ہی الٹ کر رہ گئی۔ ایک دن عبداللہ سارا دن غائب رہا کوئی نئی بات نہ تھی کہ گھر والے پریشان ہوتے۔ ویسا کچھ تو اکثر ہوتا رہتا تھا لہٰذا کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی لیکن دوسرے ہی دن احسان اللہ کو پتہ چلا کہ اس کا برخوردار چوری کے الزام میں تھانے کے لاک اَپ میں تشریف فرما ہے تو اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ محلّے میں احسان اللہ کی بڑی عزت تھی سب اس کو تکریم اور احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اگر اُن کو اُس کے سپوت کے کرتوت کی بابت علم ہو جاتا تو گیا احسان اللہ کی بنی بنائی عزت خاک میں مل جاتی!! احسان اللہ نے پولیس حکام کی خوب خاطر تواضع کے بعد چوری کی رقم اپنی جیب سے ادا کی، اور یوں معاملہ رفع دفع ہوا۔ لیکن اس دن پہلی مرتبہ اس نے اپنے دل میں عبداللہ کے لئے نفرت کی کسک محسوس کی وہ تو اُس کو عاق کر کے گھر سے نکال دیتا لیکن ماں کی ممتا کے آگے اُسے ہتھیار ڈال دینا پڑا۔

اسی دوران چند مخلص دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ عبداللہ کی شادی کر دے کہ شادی سو بُری عادتوں کا مجرب اور آزمودہ علاج ہے اور یہ کہ اس کے بعد عبداللہ خود بخود راہِ راست پر آ جائے گا۔ اُن کا خیال تھا کہ نوجوان اور نئی نویلی دلہن کی البیلی مسکراہٹ عبداللہ جیسے پراگندہ فطرت کے شوہر کے لئے تیر بہدف ثابت ہو سکتی ہے۔ احسان اللہ نے سوچا جہاں اُس نے عبداللہ کو صراطِ مستقیم کا مسافر بنانے کے لئے کئی تجربے کئے، وہاں ایک اور سہی۔ جوں ہی عبداللہ کی شادی کا تذکرہ بیٹی والوں کے کانوں تک پہنچا، اَن گنت پیغام مالِ حرام کی طرح آنا شروع ہو گئے۔ کسی نے عبداللہ پر توجہ نہیں دی۔ اُن کی نظریں تو احسان اللہ کی دولت پر مرکوز تھیں جیسے اُن کی بیٹی کی شادی عبداللہ سے نہیں بلکہ احسان اللہ کی دولت سے ہو رہی ہو۔

اور پھر عبداللہ کی شادی ہو گئی۔ کچھ دنوں تک تو وہ ٹھیک چلتا رہا لیکن ایک دن اس نے وہ گھٹیا حرکت کی کہ احسان اللہ کی اکڑی ہوئی گردن میں خم آ گیا۔ احسان اللہ کے پڑوس میں ایک خوشحال خاندان رہتا تھا۔ ایک دن نہ جانے عبداللہ کو کیا ہوا کہ اس نے ان کی چھ سالہ لڑکی کے کانوں سے سونے کی بالیاں جبراً اتار لیں۔ پڑوسی شریف تھے کچھ نہ بولے لیکن احسان اللہ کا سارا وجود غصے اور نفرت سے آگ کی بھٹی بن گیا۔ اس نے اسی لمحے عبداللہ کو گھر خالی کرنے کا الٹی میٹم دے دیا۔ عبداللہ نے بیزار مرتبہ کان پکڑ کر توبہ کی لیکن اس نے اُس کی ایک نہیں سنی اور ٹیکسی منگوا کر عبداللہ کا سارا سامان لدوا دیا۔

اس واقعہ کا عبداللہ کے دل پر کچھ ایسا گہرا اثر ہوا کہ اس نے اپنی تمام بُری عادتوں سے دستکشی اختیار کر لی، شراب محبت کو خیرباد کہہ دیا اور اپنے لنگوٹیا یاروں کو آخری سلام کر کے دوسرے محلّے میں ایک چھوٹی سی دکان لگا لی۔ اگرچہ گھر سے نکالے جانے کے بعد وہ معاشی بدحالی کے شکنجوں میں جکڑ گیا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے ناجائز ذریعے سے دولت اکٹھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ احسان اللہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ عبداللہ بُری عادتوں سے کنارہ کشی اختیار کر چکا ہے لیکن اس کے باوجود عبداللہ کے باپ میں اُس کی نفرت کم نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے گھر میں عبداللہ کا داخلہ ممنوع تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں تھا اور نہ گھر والوں کو اُس سے ملنے کی اجازت تھی۔ کبھی کبھی اُس کی ماں چوری چھپے عبداللہ سے مل لیا کرتی تھی۔

اب تو گھر سے نکالے جانے کے واقعے کو بھی ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ اب احسان اللہ کے دوستوں نے بھی اس کے سامنے عبداللہ کا ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر عبداللہ کی معاشی حالت بھی اب پہلے جیسی خراب نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے پیٹ کی آگ فرو کرنے کا انتظام کر دیا تھا، اور وہ یہ بات بھول چکا تھا کہ آئندہ کبھی اپنے باپ سے مل سکے گا۔ لیکن آج۔۔۔ آج جب احسان اللہ کے ملازم نے یہ مژدہ سنایا کہ اس کا باپ بے حد علیل ہے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اور چند گھنٹوں بعد ہسپتال میں اُس کا آپریشن ہونے والا ہے اور وہ عبداللہ سے فوری ملنا چاہتا ہے تو عبداللہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات نے اُس کے اندرون کے چاروں کھونٹ میں کھلبلی مچا دی تھی۔ اسی کیفیت میں جب اُس کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بُری طرح چونک پڑا

''آج صبح ہی صبح کون آ گیا تھا؟'' اس کا لہجہ تجسس سے بھرپور تھا۔

''ابا کا نوکر۔۔۔''

کیا۔۔۔ کیا۔۔۔!! فرطِ حیرت سے اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''سچ کہہ رہا ہوں انھوں نے مجھے بلایا ہے''

''کیوں مذاق کر رہے ہیں آپ۔۔۔''

''سچ کہہ رہا ہوں۔''

''مجھے تو یقین نہیں آ رہا ہے''

''یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا'' اس نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''لیکن نوکر نے سچ ہی کہا ہے کہ وہ جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اور پھر اُس کو اس کی ضرورت بھی کیا ہے''

''ہاں یہ تو ٹھیک ہے'' بیوی بولی۔ ''لیکن بلایا کس لیے ہے آپ کو؟''

''آج اُن کا ایک میجر آپریشن ہو رہا ہے'' وہ بولا۔ ''ڈاکٹروں کا کہنا

ہے کہ وہ بچ گئے تو ایک معجزہ ہوگا۔" عبداللہ نے ایک گہری سانس لی اور کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "ممکن ہے اس آخری وقت میں انہیں اس ناخلف کی یاد آگئی ہو۔"

''وہ تو یہ بات ہے" انجیلا نے سنجیدگی سے کہا۔ "اب میں سمجھ گئی۔"

''وہ کیا؟''

''شاید وہ اپنی جائیداد اور کاروبار کا انتظام آپ کو سونپنا چاہتے ہوں"

''میں یہ بات بھی سوچ چکا ہوں۔ کاش ایسا ہی ہو۔"

''ظاہر ہے ایسا ہی ہوگا" بیوی نے ہونٹ سے سرگوشی کی۔ "آپ اُن کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ ویسے بھی قانوناً آپ ہی وارث ہیں۔"

عبداللہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا، کپڑے تبدیل کئے اور ہسپتال کی جانب چل پڑا۔ راستے بھر اُس کا ذہن خیالوں کا کارخانہ بنا رہا۔ بے شمار خیالات جنم لے کر دم توڑتے گئے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی قسمت کا ستارہ اپنی پوری آب و تاب سے جگمگا اٹھا تو اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی گمشدہ منزل خود چل کر اُس کے پاس آ گئی ہے۔ یہ وہی خواب تھا جو ایک عرصہ قبل اُس سے اوجھل ہو گیا تھا لیکن اب تو جیسے اُس سے آنکھ ملاتے ہوئے بار بار شوخی سے مسکرا رہا تھا۔

ہسپتال کے ایک خاص انتہائی وارڈ کے قریب علاقہ بھر کی ایک بڑی تعداد ٹولیوں کی شکل میں جمع تھی۔ سب کے چہروں پر فکرمندی کے آثار نمایاں تھے۔ سرگوشیوں کے انداز میں گفتگو ہو رہی تھی۔ یہ سب نہ صرف اس کے باپ کے قریبی دوست تھے بلکہ کاروباری برادری کے معروف اور بااثر افراد کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ اس نے اپنے چند رشتے داروں کو بھی دیکھا جن سے ملے ہوئے اسے برسوں بیت گئے تھے چونکہ اُس کے باپ نے اُسے غیر اعلانیہ طور پر عاق کر رکھا تھا اس لیے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اُس سے ملنے کی کوشش کرتا۔ انہیں خوب علم تھا کہ اس کی خیریت معلوم کرنا سر تا سر گھاٹے کا سودا ہے۔ وارڈ کے اندر مکمل خاموشی کی حکمرانی تھی۔ در و دیوار پر ایسا سناٹا طاری تھا جیسے احسان اللہ کی قبل از وقت موت کا تصور کر کے ہر شے نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہو۔

دل کو ڈھارس دے کر وہ وارڈ کے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے پلنگ پر کوئی چت لیٹا ہوا تھا۔ گردن تک سارا جسم کفن کی طرح سفید چادر میں ڈھکا ہوا تھا۔ برابر ہی ایک کرسی پر اس کی بوڑھی ماں اُداسی کا مرقع بنی ہوئی خیالات کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسی دوران پلنگ پر لیٹا ہوا جسم متحرک ہوا اور کوئی کراہتا ہوا بولا۔

''عبداللہ۔۔۔میرے بیٹے''

''ابا جان۔۔۔" وہ جھک کر اپنے باپ سے لپٹ گیا۔ وہ ایک طویل عرصے کے بعد اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا، اور وہ بھی اس وقت جب وہ موت کے عفریت سے پنجہ آزمائی میں مصروف تھا۔ کسی زمانے میں وہ انتہائی صحت مند اور قوی ہیکل ہوا کرتا تھا لیکن آج تو جیسے وہ اپنے وجود کی نفی پر چھائیں ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے، آنکھیں بے نور ہو رہی تھیں۔ لیکن عبداللہ نے محسوس کیا کہ باپ کو اس بُری حالت میں دیکھ کر بھی اُس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور اندرون میں جذبات نام کی ہر شے مر چکی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنے باپ کو اجنبی نظروں سے دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں سے مسلسل ساون بھادوں برس رہا تھا۔

''مت رویئے۔ طبیعت بگڑ جائے گی۔" اس کی ماں نے اپنے شوہر کو دلاسا دیا۔

''مجھے مت روکو۔ مجھے رونے دو۔" مکلباپ نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "شاید میرے آنسوؤں سے میری شرمندگی کا داغ دھل جائے۔"

تھوڑی دیر بعد جب رونے سے اس کی طبیعت بحال ہوئی تو عبداللہ نے اجنبیوں کے انداز میں باپ کی بیماری کے متعلق دریافت کیا۔ اُس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ محض رسمِ دنیا نبھا رہا ہے ورنہ وہ باپ کی تکلیف کے حوالے سے بالکل لاتعلق ہو چکا تھا۔ اُس کا دل تو ایک پتھر ہو چکا تھا جس پر محبت کا کوئی پودا اُگ ہی نہیں سکتا تھا۔

اسی دوران ایک عمر رسیدہ ڈاکٹر اسٹیتھسکوپ گلے میں لٹکائے دو جونیئر ڈاکٹرز کی معیت میں وہاں پہنچ گیا۔ اس نے احسان اللہ کی نبض دیکھی، ٹمپریچر دیکھا اور میڈیکل چارٹ پر ریمارکس دے کر یہ پیشگی اطلاع دیتا ہوا وہاں سے چل دیا کہ احسان اللہ کو آپریشن تھیٹر لے جانے کی خاطر کسی بھی لمحے اسٹریچر آ سکتا ہے۔ یہ سب کچھ سن کر عبداللہ پر تو سرِمو اثر نہیں ہوا لیکن اس کے باپ کی جذباتی پریشانی بے کراں ہو کر رہ گئی۔ بظاہر وہ خود کو سنبھالنے کی بے انتہا کوشش کر رہا تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ اس کا چہرہ پریشانی کی منہ بولتی تصویر بن کر رہ گیا تھا۔ وہ بار بار یوں عبداللہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا جیسے اس سے کچھ کہنا چاہتا ہو، لیکن اُس نے باپ کی طرف متوجہ ہونے کے متعلق کوشش نہیں کی۔ وارڈ کے اندر موجود افراد اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اطراف میں گہری سناٹوں کی دیواروں پر آنے والے وقت کی داستان مرقوم ہو چکی ہے۔

اسی اثناء میں وارڈ بوائے اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ اُن کو دیکھ کر احسان اللہ کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہو گیا جیسے اُسے مذبح لے جانے کی تیاری کی جا رہی ہو۔ اس کا جسم ارتعاشات کی زد میں تھا اور ہونٹوں کے تحرک سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ عبداللہ سے کچھ کہنا چاہتا ہے اگرچہ عبداللہ خیال و خواب

باقی غالب کا سفر کلکتہ میں۔

گاندی میں چھپا آتنک وادی

مراق مرزا (ممبئی بھارت)

شہر کے لوگ اسے مسیحا مانتے تھے۔ بازار کی تقریباً سبھی چھوٹی بڑی دکانوں میں بھگوان کے فوٹو فریم کے ساتھ لوگوں نے اس کی تصویر بھی لگا رکھی تھی۔ اور روز صبح شام جب وہ اگربتی جلا کر بھگوان کی پوجا کرتے تھے تو ساتھ ہی اس کی پوجا بھی ہو جاتی تھی۔ وہ تھا بھی اس لائق کہ اسے بھگوان کی طرح پوجے جانے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ وہ جنگِ آزادی کا سپاہی تھا اور مادرِ وطن کو انگریزوں کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے متعدد مرتبہ جیل بھی گیا تھا۔ جدوجہدِ آزادی کے دوران اس نے انگریزوں کے ذریعے ڈھائے جانے والے سخت ترین مظالم بھی برداشت کیے تھے مگر کبھی کسی فرنگی کے سامنے اپنا سر جھکنے نہیں دیا تھا۔ وہ غلامی کو انسان کے لیے سب سے بڑی لعنت خیال کرتا تھا اور اس کی نگاہ میں انسانوں یا قوموں کو غلام بنانے والی طاقتیں انسانیت کی سب سے بڑی دشمن تھیں۔

اس کی عمر اسی پچاسی کے آس پاس تھی۔ سر کے تقریباً سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ جسم اگرچہ ضعیفی کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا تھا مگر چہرے پر زندگی کی چمک برقرار تھی۔ اس عمر میں بھی اس کی شخصیت بے حد پرکشش تھی۔ وہ زیادہ تر سفید لباس زیب تن کرتا تھا۔ گھٹنوں سے کافی نیچے تک لمبا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ۔ پیر میں کولھاپوری چپل ۔۔۔۔۔ وہ گاندھی جی کا کٹر بھگت تھا۔ نام کبیر گاندھی تھا مگر شہر کے لوگ اسے داداجی کہہ کر پکارتے تھے۔

وہ آج بھی بے حد سرگرم اور فعال تھا۔ اس نے اپنی زندگی عوام کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دی تھی۔ جوانی کے ایام میں ملک کی آزادی کے لیے لڑا تھا اور آج اپنے شہر کے لوگوں کی خوشحالی کے لیے لڑ رہا تھا۔ کئی اسکول و کالج اس کی کاوشوں کے نتیجے میں کھلے۔ کئی یتیم خانے اور Old Age Home اس کی جدوجہد کے سبب وجود میں آئے۔ جہاں کچی سڑکیں تھیں وہاں پکی سڑکیں تعمیر کروائیں۔ جن بستیوں میں بجلی اور پانی جیسی بنیادی سہولتیں دستیاب نہ تھیں وہاں یہ سہولتیں پہنچائیں۔ یہی سبب تھا کہ بلا تفریقِ مذہب و ملت لوگ اسے دیوتا مانتے تھے۔

اس کا ذہن ذات پات اور بھید بھاؤ کے زہریلے جرثیم سے پاک تھا

حدودِ ذات سے باہر نکل کے دیکھ ذرا
نہ کوئی غیر نہ کوئی رقیب لگتا ہے

ڈاکٹر اقبال کے اس شعر میں پوشیدہ حیاتِ انسانی کے فلسفہ کو اس نے بڑی گہرائی سے سمجھ لیا تھا شاید اسی لیے وہ انسانوں کو مذہب کے خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتا تھا۔

کئی بار لوگوں نے اسے سیاسی انتخابات میں حصہ لینے کے لیے کہا مگر وہ تیار نہ ہوا۔ عوام کی خدمت کو اس نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔ اس کے دل میں حکومت کرنے کی خواہش یا تمنا کبھی نہیں جاگی۔ حکمرانی کی شیطانی کرسی سے اس نے ہمیشہ خود کو دور رکھا۔ مگر اس کا بیٹا وکاس نئے زمانے کا نوجوان تھا اور اس کے افکار و خیالات اپنے پتا سے بالکل مختلف تھے۔

وکاس نے نپولین بونا پارٹ اور ہٹلر کو پڑھا تھا۔ مہاتما گاندھی کی تعلیمات و نظریات سے وہ بہت زیادہ متاثر نہ تھا۔ اس کے اندر دکا کی بھوک جنم لے چکی تھی۔ وہ سیاست کے میدان میں اتر کر حکومت کی کرسی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے جن وکاس پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور دو ماہ بعد ہونے والے اسمبلی الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ بات جب داداجی کو پتہ چلی تو وہ اندر سے خوش نہیں ہوئے اور انھوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "سیاست اکثر آدمی سے اس کی شرافت اس کا ایمان دھرم چھین لیتی ہے۔۔۔ اور اسے بے ایمانی مکاری اور ظلم و جبر کے راستے پر چلنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔ اگر تم اپنے شہر یا ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو تو سیاست سے دور رہ کر بھی کر سکتے ہو۔۔۔۔ جس طرح میں کر رہا ہوں!" داداجی کی دلیل اسے قائل نہ کر سکی اور اس نے کہا کہ آج زمانہ بدل چکا ہے۔ صرف باتوں سے ملک یا قوم کی تقدیر نہیں بدلی جا سکتی۔ اگر دیش اور سماج کے لیے کچھ کرنا ہے تو اسے راج نیتی میں آنا ہی پڑے گا۔

بیٹے کی ضد کے آگے داداجی کمزور پڑ گئے اور انھیں ہار ماننی پڑی۔

وکاس کالج کے دنوں سے ہی لیڈری کرنے لگا تھا۔ اسٹوڈنٹ یونین کا صدر منتخب ہونے کے بعد وہ نوجوانوں کا نیتا بن گیا تھا اور دھیرے دھیرے پورے شہر میں مشہور ہونے لگا تھا۔ چونکہ وہ داداجی کا بیٹا تھا لہٰذا باپ کی مقبولیت اور عظمت کا بھی بھرپور فائدہ ہوا تھا اسے۔ داداجی کے سبب لوگ اس کا بھی احترام کرتے تھے۔

جن وکاس پارٹی کے ٹکٹ پر جب وکاس گاندھی نے نومینیشن (Nomination) داخل کیا تو شہر کے نوجوانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میڈیا کے لیے بھی یہ ایک بڑی خبر تھی۔ شہر کے سبھی بڑے اخبارات اور ٹی وی چینلوں نے اس خبر کو ہائی لائٹ کر کے پیش کیا۔ مگر بجرنگ تیواری کے دل و دماغ پر یہ نیوز میزائل کی طرح گری۔

بجرنگ تیواری سیاسی اکھاڑے کا بہت پرانا اور ماہر کھلاڑی تھا۔ پچھلے پندرہ برسوں سے آج تک کبھی کوئی شکست نہیں دے پایا تھا۔ اس نے شہر کی ترقی کے لیے بہت سے قابلِ تعریف کام بھی انجام دیے تھے۔ شہر میں اس کی ایک اچھی شناخت تھی۔ دلتوں اور مسلمانوں کا ووٹ ہمیشہ اسے ہی ملتا تھا اس لیے کوئی دوسرا نیتا اس کے مقابلے میں کھڑا ہو کر کبھی جیت نہیں پایا۔ مگر وکاس گاندھی کے اچانک انتخابی میدان میں کود پڑنے کے باعث وہ شدید الجھن میں پڑ گیا اور ایک پل کے لیے اسے اپنا سیاسی سامراج خطرے میں نظر آنے لگا۔

ادھر وکاس کو ذہنی اور جذباتی دھکا تب لگا جب داداجی نے اس کے

لیے Campaigning کرنے سے انکار کر دیا اور یہ جواز پیش کیا کہ اگر وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہوتا تو شاید وہ اس کی حمایت میں عوام سے اپیل کر بھی سکتے تھے لیکن کسی مخصوص پارٹی کے لیے وہ کسی بھی حالت میں پرچار نہیں کریں گے کیونکہ ایسا کرنا ان کے اصولوں کے خلاف ہے۔

اگرچہ پتا جی کی حمایت حاصل نہ ہونے کے سبب وکاس قدرے مایوس ہو گیا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ شہر کا پورا نوجوان طبقہ اس کے ساتھ تھا جو ہر قیمت پر اسکے سر پر فتح مندی کا تاج دیکھنا چاہتا تھا۔ نوجوانوں نے گھر گھر جا کر وکاس کے لیے Campaigning شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ دھیرے دھیرے اس نوجوان نیتا سے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ پھر اچانک پوری مسلم برادری نے اعلان کر دیا کہ اس بار وہ ووٹ وکاس گاندھی کو دیں گے۔ اس سے بجرنگ تیواری کے خیمے میں کھلبلی مچ گئی۔

گو کہ بجرنگ تیواری اپنی اچھائیوں کے لیے عوام میں مشہور تھا تاہم اس کی تصویر کا دوسرا رخ بھی تھا۔ وہ ستا کی کرسی کا بھوکا تھا اور چناؤ جیتنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ اس کی پارٹی کے کارکنوں نے جم کر ووٹوں میں پرچار شروع کر دیا اور وکاس گاندھی کے لوگ دلتوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شہر میں قریب دو لاکھ دلت ووٹر تھے اور انہی پر ہار جیت کے فیصلہ کا انحصار تھا۔ وکاس گاندھی اور بجرنگ تیواری کے درمیان کانٹے کی ٹکر تھی اور دونوں ہی کے لیے یہ چناؤ جیتنا ایک بہت بڑی چنوتی تھی۔

الیکشن سے دس دن قبل اچانک شہر کا سارا منظر بدل گیا۔ دلتوں کے مسیحا بابا صاحب امبیڈکر کی مورتی کو رات کے اندھیرے میں کسی نے جوتوں کا ہار پہنا دیا جس کے سبب شہر میں دنگا بھڑک اٹھا۔ دلتوں کا ایک بڑا ہجوم سڑکوں پر اتر آیا۔ ہندوؤں کے خلاف نعرہ بازی ہونے لگی۔ بازار کی بھی دکانیں دھڑا دھڑ بند ہو گئیں۔ سڑک سے گزرنے والی گاڑیوں پر پتھراؤ شروع ہو گئے۔

شام تک وہ شخص گرفتار کر لیا گیا جس نے امبیڈکر کی مورتی پر جوتوں کی مالا ڈال دی تھی۔ چونکہ وہ ہندو تھا اور بڑی ذات سے تعلق رکھتا تھا لہٰذا اس خبر کے رد عمل میں دلت ہندو فساد شروع ہو گیا۔ دونوں گروہوں کے لوگ ایک دوسرے کو مارنے کاٹنے کے لیے نکل پڑے۔ بازار کی بہت سی دکانیں لوٹ کر جلا دی گئیں۔ بہت سے گھروں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ پولیس کے اس بھیانک فساد پر قابو پانے تک قریب ڈھائی تین ہزار لوگ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

یہ خونی فساد قریب تین دنوں تک جاری رہا۔ بعد میں دادا جی کی اپیل کے سبب شہر میں پھر سے دھیرے دھیرے امن و امان قائم ہو گیا۔ بجرنگ تیواری نے حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انتخاب روکے جانے کی مانگ کر دی مگر اس کی یہ چال الٹی پڑ گئی۔ میڈیا والوں نے اس پر الزام لگانا شروع کر دیا کہ اس دنگے کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے۔ چونکہ اس بار الیکشن میں اس کی شکست یقینی تھی اس لیے اس نے دلت ہندو فساد کروایا تا کہ اس بہانے انتخاب کی تاریخ رد کروا سکے اور اپنے حق میں ماحول سازگار بنانے کے لیے کچھ وقت حاصل کر سکے۔ دراصل فساد سے پہلے دلت ووٹوں کا جھکاؤ بھی وکاس گاندھی کی طرف ہونے لگا تھا۔

میڈیا والوں نے بجرنگ تیواری پر جو الزامات عائد کیے وہ اتنے مضبوط اور مدلل تھے کہ ان پر یقین نہ کرنا ناگزیر تھا۔ دادا جی کو بھی ان الزامات میں صداقت نظر آئی لہٰذا انھوں نے الیکشن کمیشن سے درخواست کی کہ انتخاب طے شدہ تاریخ پر ہی کرائی جائے۔ اس حادثہ کے بعد دلتوں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ ووٹ وکاس گاندھی کو ہی دیں گے۔

انتخاب کا جو نتیجہ سامنے آیا وہ متوقع تھا۔ وکاس گاندھی قریب تین لاکھ ووٹوں سے جیت گیا۔ شہر کے نوجوان نے بڑے ہی جوش و ولولے کے ساتھ اس جیت کا جشن منایا اور وہ جے یاترا کا جلوس لے کر گاندھی میدان پہنچے جہاں تقریباً پانچ لاکھ لوگوں کا جم غفیر پہلے سے موجود تھا۔ وکاس گاندھی نے عوام کی بھیڑ سے خطاب کرتے ہوئے جب اپنے مستقبل کے منصوبوں کا اعلان کیا تو زوردار تالیاں بجیں۔ یہ سارا منظر ٹیلی ویژن پر لائیو ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔

دو دن بعد ایک دھماکہ خیز خبر نے سارے شہر میں سنسنی پھیلا دی۔ یہ خبر تھی وکاس گاندھی کے قتل کی۔ اس خبر کے نشر کرتے ہی ایک بار پھر شہر میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ کسی بھی وقت دنگا بھڑک سکتا تھا۔ نازک حالات کے پیش نظر پورے شہر میں دفعہ 144 لاگو کر دیا گیا۔ جن وکاس پارٹی کے لوگوں کو یقین تھا کہ وکاس گاندھی کا قتل بجرنگ تیواری کے سوا کوئی اور نہیں کروا سکتا لہٰذا نوجوانوں کا ایک مشتعل ہجوم تیواری کے بنگلے پر پہنچ گیا مگر وہاں پہلے سے پولیس تعینات تھی اس لیے حالات قابو سے باہر نہ ہو سکے۔

دوسرے دن ایک اور چونکا دینے والی خبر ٹی وی پر آئی کہ وکاس گاندھی کے قاتل نے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیا ہے۔ اس خبر کے پھیلتے ہی ہزاروں لوگوں کی بھیڑ پولیس اسٹیشن کے باہر جمع ہو گئی۔ اس قاتل کو دیکھنے کے لیے ـــــ وہ قاتل پولیس اسٹیشن کے اندر بیٹھا تھا۔ ٹی وی رپورٹرس کی بھیڑ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ قریب بیٹھا ٹی وی کیمرے کے سامنے اپنا بیان دے رہا تھا۔ "یہ سچ ہے کہ میں نے ہی اسے مارا ہے!۔۔۔ اور اسی کے ریوالور سے اس کا قتل کیا ہے میں نے!!۔۔۔ دراصل وہ جینے کا حقدار نہیں تھا!۔۔۔ ستا کی بھوک نے اسے حیوان بنا دیا تھا!۔۔۔ انتخاب سے پہلے جو ڈھائی تین ہزار بے گناہ لوگ مارے گئے ان کی موت کا ذمہ دار وکاس گاندھی ہی تھا۔ وہ شخص جس نے امبیڈکر کی مورتی کو جوتوں کا ہار پہنایا تھا وہ وکاس گاندھی کا ہی خریدا ہوا آدمی تھا اور اس کے اشارے پر اس نے یہ غلیظ حرکت کی تھی!! ـــــ وہ میرا خون ضرور تھا مگر گاندھی نہیں تھا!! ـــــ درحقیقت وہ گاندھی میں چھپا ہوا آتنک وادی تھا!!" ـــــ اس سے آگے دادا جی کچھ نہ کہہ سکے۔

پکی عمر کی ماں

فرخندہ شمیم (راولپنڈی)

سڑک پار کرتے ایک بار پھر وہی بچہ اس کی وجود کی دیوار پر عشق پیچاں کی طرح لپٹ گیا۔ اصل میں سامنے ہی اسکول کی چھٹی ہوئی تھی اور ننھے ننھے بچے سفید یونیفارم اور سیاہ بستوں سے لدے ٹریفک سے بھری سڑک پر یوں بے فکری سے گزر رہے تھے جیسے زندگی ان کے لیے کسی رنگین فٹ بال سے زیادہ نہ ہو۔۔۔ گول ہو گیا تو ٹھیک۔۔۔ ورنہ۔۔۔ اتنا بھی Amlutious ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

بچے نے اس کا پرس تھام لیا۔ "ممی۔۔۔ ممی۔۔۔" وہ چونک پڑی۔ "بے فکر ہو کر پار کر دینا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس نے نجانے کس سے کہا تھا۔ پیچھے آنے والی دو نوجوان لڑکیاں یہ آواز سن کر پہلے تو حیران ہوئیں پھر۔۔۔ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"یہ میڈم شاید۔۔۔ "تھوڑی کھسکی ہوئی ہیں"۔ ایک نے دوسری سے سرگوشی کی نجانے کس سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے دونوں کی آواز سن لی اور شرمندہ سی آگے بڑھ گئی۔ ایسا کئی بار ہو چکا تھا۔ تمکین جیسے ایک صدی سے کسی ایسے بچے کو گود میں اٹھائے پھرتی تھی جیسے اس نے خود تخلیق کیا ہو۔ حالانکہ کئی بھائیوں میں ایسا اس کے ساتھ کئی بار ہو چکا تھا۔ شاید پچھلی صدی سے ایسا ہو رہا تھا۔ وہ کسی ایسے بچے کو ہر وقت گود میں اٹھائے پھرتی تھی جیسے اس نے خود پیدا کیا تھا۔ بچپن میں وہ اپنے بھائیوں اور ہمسایوں، سبھی کے ساتھ کھیلا کرتی تھی لیکن ایک ہوا سا بچہ اس وقت بھی اس کے لباس کے ساتھ چپکا رہتا تھا۔ جب وہ خود بھی ڈھنگ سے پہننا اوڑھنا نہیں جانتی تھی شاید تمکین اپنی پیدائش سے پہلے کی ماں تھی۔

لیکن سچ مچ ماں بننے کی عمر آئی تو کسی نے اسے یہ اعزاز نہیں بخشا۔ ماں بننے کے لیے پہلے سہاگن بننا پڑتا ہے مگر اسے سرخ رنگ اوڑھنے کو نہیں ملا اور نہ ہی نتھ کو پیچ۔ ان دو شرطوں کے بغیر ماں بننا گالی ہوتا ہے اور تمکین کو گالیوں سے نفرت تھی۔ اس نے کئی سال چپ چاپ خود کو اجڑتے دیکھا گوارا کر لیا لیکن غدر کے بعد کے دلی کی طرح اپنی شرافت کو ادھر ادھر چلنے نہیں دیا۔

دنیا کا ہر گھڑیال وقت گزرنے کا اعلان کرتا ہے بس صرف عمر کی گھڑی گزرنے کی اطلاع نہیں دیتی اس کی گھنٹی تو صرف اس وقت بج کر چونکاتی ہے جب آواز سننے والی سماعت بہری ہو چکی ہوتی ہے۔ اور ویسے بھی دنیا نوخیز عمری کو ہی جوانی مانتی ہے اس کے بعد تو کھرچن کہا جاتا ہے۔ تمکین کے والدین اس کے ہاتھ پر سہاگ لکیر ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود ہی لکیر ہو گئے اور بھائی بہنوں کے اپنے اپنے گھر بس گئے۔ وہ تو اس وقت چونکی تھی جب ایک دن بھائی اور بھابی گھر میں پیسے ختم ہو جانے پر جھگڑ رہے تھے اور بھابی کہہ رہی تھیں۔

"تمکین بھی اتنی پڑھی لکھی ہے کہیں نوکری کر کے بھائی کا ہاتھ کیوں نہیں بٹا لیتی؟"

تمکین نے فوراً اپنے پہلو سے چپکے بچے کو دیکھا اور گھبرا کر سوچنے لگی۔ میں نوکری تو کر لوں لیکن۔۔۔ میرے بچے کو کون سنبھالے گا؟ کون دودھ پلائے گا اسے کون نہلائے گا اور کون اس کے ساتھ کھیلے گا؟؟

بے اختیار اس نے سیاہ چمکدار آنکھوں والے شہریار کو سینے سے لگا لیا۔ اور اس کا تخیل پرسکون ہو گیا تھا لیکن بھابی کی آواز نے دوبارہ ہلچل مچادی۔ ابھی اس پر کون سی میاں اور بچوں کی ذمہ داریاں ہیں۔ اکیلی جان ہے نوکری سے وقت بھی کٹ جائے گا اور دو پیسے بھی ہاتھ آ جائیں گے۔ بھابی مسلسل تقریر جھاڑ رہی تھیں۔

ایک چھناکا سا تمکین کے وجود کو لرزا گیا کہیں غائب ہو گیا۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ شہریار کہیں بھی نہیں تھا۔ بستر پر صرف وہ اکیلی تھی ایک سوگواری کربلا تمکین کے پہلے فرات پر اتر آئی۔ وہ کچھ دیر تک ساکت رہی پھر تپائی سے آج کا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی۔ زمینی حقائق کی تلخیوں پر ایک کالم اخبار میں چھپا تھا۔ اس نے پڑھا اور سچائیوں کا سامنا کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے غربت کے جالے گھر سے صاف کرنے کا ارادہ کیا کیا کہ غیر متوقع طور پر اسے ایک ادارے میں معقول سی ملازمت بھی مل گئی۔ مناسب آفس تھا اس کا، دو اور خواتین بھی تھیں اس کے علاوہ۔ ماحول مہذب اور کام کی فضا بھی خاصی پیشہ وارانہ۔ تمکین کو کام کرنے میں اتنا لطف آنے لگا کہ صبح سے شام ہو جاتی اور وہ پوری مستعدی سے بغیر تھکان فائلوں میں گھسی رہتی۔ آہستہ آہستہ دوسری خواتین نے بھی اپنا کام تھوڑا تھوڑا کر کے تمکین کو سونپنا شروع کر دیا اور دفتر سے جلدی چھٹی کرنے لگیں۔ وہ تمکین کو مجبوری سے بتاتیں کہ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے گھر میں اکیلے ہیں جن کے لیے ضروری خریداری اور دوا دارو بھی پوری دل جمعی سے نہیں ہو پاتی۔ اگر تمکین ان کے حصے کا کچھ کام کر دے تو وہ اپنے ننھے ننھے بچوں کو وقت دے سکیں گی۔

تمکین کو یوں لگا جیسے ان دونوں خواتین کے بچے دراصل اس کا اپنا شہریار ہوں۔ ہر بچہ ایک شہریار ہی تو ہوتا ہے۔ وہی شہریار۔ جو اس کے دامن سے لپٹا اور سینے سے چپکا رہتا تھا اور جس نے آفس میں بھی اس کے پلو کو نہیں چھوڑا اور ایک چھوٹی سی کرسی اپنی ماما کی بڑی کرسی سے ساتھ لگوا کر اس پر بیٹھا ٹانگیں ہلاتا رہتا تھا۔ تمکین اکثر فائلوں سے نظر چرا کر اس بچے کو دیکھتی جو اپنی کرسی پر جھولتا، منہ میں کینڈی چوستا اور تمکین کے پین ہولڈر کے تمام قلم ادھر ادھر پھینکتا رہتا تھا۔ وہ ماحول کے بشاش رنگ میں خود کو ڈوبا ہوا محسوس کرتی اور خالی آفس پا کر شہریار سے ننھی ننھی باتیں شروع کر دیتی تھی۔ شہریار کی شکل میں اس کا تخیلاتی ڈھانچہ حیرت انگیز طور پر مضبوط تھا۔

تمکین کی دونوں کولیگس جانتی تھیں کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے اور اس عمر تک بھی اس کے سہرے کے پھول نہیں کھلے ہیں وہ دونوں اس موضوع پر جبکہ باتیں ایک مرتبہ عارف صاحب نے دونوں خواتین کو بتایا تھا کہ جب تک شادی نہ ہو لڑکی، لڑکی رہتی ہے عورت نہیں بنتی۔۔۔ خواہ اس کی عمر کتنی بھی ہو جائے تو دونوں کولیگس نے گھور کر عارف صاحب کو دیکھا اور کہا ایسا تو کہیں نہیں ہوتا کہ چہرے پر پڑی جھریاں لڑکی ہونے کا اعلان کر رہی ہوں ہر چیز وقت پر اچھی لگتی ہے عارف صاحب شادی بھی اور بچے بھی۔۔۔ آپ کا نظریہ تو بابا آدم کی لائن کے مترادف ہے۔ عارف صاحب کو اس شدید ردِ عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنی بات واضح کرنے ہی والے تھے کہ دوسری کولیگ بولی۔

ٹھیک ہے بعض اوقات وقت پر شادی نہیں ہو پاتی۔ دیر سے ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی لیکن اگر کوئی عورت ضعیف ہو کر مر جائے تو کیا آپ جیسے لوگ اس کی موت کو نوجوان کنیا کی موت کہیں گے؟

تمکین کی کولیگ اتنی جھنجلائی ہوئی تھی کہ عارف صاحب پریشان ہو گئے۔

عورت واقعی عمر کے موضوع پر زخمی شیرنی ہوتی ہے۔ انہوں نے کیفے ٹیریا سے اٹھنے ہی میں عافیت جانی تھی۔

تمکین کے اپنے آفس میں یوں تو صرف دو کولیگس تھیں لیکن باقی پورے دفتر کو بھی علم تھا کہ ایک نئی خاتون ادارے میں آئی ہے جو 48/45 برس کے باوجود چاک و چوبند اور خوش شکل ہے اور کئی جوان خواتین سے چھوٹی نظر آتی ہے۔ نئی عورت کا پتہ تو ویسے ہی چل جاتا ہے چاہے وہ محلے میں نئی آئی ہو یا محفل میں۔ تمکین کے گال اور بال دونوں تنومند تھے جن پر لوگوں کی ستائشی نظریں دیکھ کر تمکین کی دونوں فی میل کولیگس جل کر رہ جاتی تھیں۔

لیکن اس جھل بل سے فرق کیا پڑے گا۔ عمر کے اندھیرے تو پورے جسم کو ڈھانپنے ہی والے ہیں۔ گھر بسے تو جانیں! دونوں بڑبڑانے لگتیں لیکن تمکین کو دور دور خبر نہ ہو پاتی کہ اُسے کوسنے پڑ رہے ہیں۔ وہ تو جونہی فراغت پاتی اپنے خیالی شہزادے کو دودھ پلانے لگتی!

ایک ہی ماہ گزرا ہوگا جب تمکین کی کولیگس تو کیا، پورے آفس نے محسوس کیا کہ تمکین کے اندر کسی جنگلی ہرنی کی سی کوئی لپک آئی ہے۔ یوں جیسے کاریزیں چل پڑی ہوں۔ کوئی جھیل سی جس کی دور دور امید نہ ہو۔ دونوں کولیگس کو حیرت ہوئی۔ تمکین تو کبھی فائلوں سے باہر نہیں نکلتی اس نے تو ان دونوں عورتوں پر بھی کبھی دھیان نہیں دیا تھا جو اوٹ پٹانگ کپڑوں، اَن دھلے بالوں اور بغیر برش جوتوں میں ہی دفتر آ جاتی تھیں۔ ان کی ٹیبلیں بھی گندی ہوتیں اور کھانے کے برتن بھی ناصاف۔ لیکن چونکہ تمکین محض اپنے کام سے کام رکھتی تھی اس لیے اس نے کبھی ان دونوں خواتین کی چیزوں اور عادات کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور یہ بات ان دونوں کے لیے بڑی اطمینان بخش تھی۔

اور اب یہ ہوا تھا کہ تمکین کے ناز بھوتے پڑ رہے تھے اور اس نے گرم گرم نگاہوں سے دونوں کولیگس کو دیکھا بھی تھا۔ آخر ان دونوں سے رہا نہیں گیا اور وہ ایک دوسری کو آنکھ مارتی تمکین کی میز پر چلی آئیں۔

کیا بات ہے آج بہت شوخ لگ رہی ہو۔ خیر ہے؟

"کچھ نہیں" تمکین نے کسی نئی نویلی لڑکی کی طرح نظریں چرائیں۔

پھر بھی۔۔۔ دوسری بضد تھی۔ لگتا ہے کالج دور میں شرمانے کا یہی انداز رہا ہوگا تمہارا؟ اس کے لہجے میں استہزا تھا۔

تمکین پھر بھی مسکراتی رہی۔

"عورت کی شرماہٹ ہر عمر میں نوخیز ہوتی ہے"

تمکین نے کچھ ایسے پن سے کہا کہ دونوں کولیگس چونکی رہ گئیں۔ تو پھر بتاؤ نا اس شرمانے کی وجہ؟ انھوں نے ڈھیٹ بن کر پوچھا۔ تمکین نے پرس سے ایک رنگین تصویر نکال کر میز پر رکھ دی۔

ہائیں؟ دونوں تصویر دیکھ کر چیخ پڑیں۔ سرخ نارنجی کپڑوں میں دلہن بنی تمکین اور ساتھ میں اتنا جوان سا ایک لڑکا۔ کیا یہ واقعی تمہارا ہی دولہا ہے؟ اس کی ایک کولیگ نے بڑی بدتمیزی سے ریمارکس دیے۔

تمکین کو نوک چبھی۔۔۔ مگر چپ رہی۔

"تم کیا ہو تمکین" "تمہیں اتنا ینگ لڑکا ملا ہے۔ ورنہ آج کل تو نوجوان لڑکیاں بھی گھروں میں بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ دوسری کیا نہیں آتی۔"

"تم سے اندازاً کتنا چھوٹا ہوگا"؟ پہلی نے پرتنک پھینکا

پتہ نہیں میں نے عمر نہیں پوچھی؟ تمکین نے روکھا سا جواب دیا

پھر بھی ۔۔۔ کچھ تو آئیڈیا ہوگا آج کل میں ینگ ایج کے لڑکے ذرا امیچور ہوتے ہیں۔۔۔!!

اس کی کولیگ ضرورت سے زیادہ غیر مہذب تھی۔ اچھا؟ تمکین نے حیرانگی کی ایکٹنگ کی۔ میں نے دفتر والوں سے سنا ہے کہ آپ کے میاں تو عمر کے کافی پکے ہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔ پھر بھی آپ دونوں میں ہم آہنگی نہیں ہو سکی؟ کیوں؟ تمکین نے بڑے بھولے پن سے پوچھا۔

اس کی کولیگ دم بخود رہ گئی۔ دیکھنے میں بجھے ہوئے تیر لگنے میں کتنے طرار ہوتے ہیں۔ یہ بات تمکین کی دونوں کولیگس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ دونوں اٹھ کر چلی گئیں۔ شیرنی کچھار سے باہر آیا ہی چاہتی تھی۔

تاہم اس واقعے نے دونوں عورتوں کو تمکین کی ہلاکت کے نئے منصوبوں پر آمادہ کرنا شروع کر دیا۔ ویسے بھی شیطان نے تو اپنے رب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی بے وقوف مخلوق کو آپس کی دشمنی کا کروائے گا چنانچہ شیطان کی

مراد پوری ہوئی اور آفس میں ایک دن ایک بہت خوبصورت اور نوجوان شادی شدہ لڑکی سینئر پوسٹ کی پوسٹ پر اپائنٹ ہوئی۔ شادی شدہ ہو کر بھی شاید وہ حسن کے پروانوں کے لیے شمع محفل بن جاتی اور وہ چاہتی بھی کچھ ایسا ہی تھی لیکن شادی کے فوراً بعد ماں بن جانے کے آثار اس کے اور حسن پجاریوں کے درمیان حائل ہو رہے تھے۔ اسے کبھی کبھی جھنجھلاہٹ بھی ہوتی کہ اتنا جلدی اس پر تخلیق کا رنج کی مہر تصدیق لگ گئی ہے۔ صرف شادی شدہ ہونے کا لیبل ہوتا تو وہ کئی سال تک انجوائے کرتی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، اس کا شوہر بڑے کڑے اصولوں کا آدمی تھا۔ البتہ یہ واقعہ تمکین کی دونوں کولیگس کے لیے تسکین کو زک پہنچانے کا ایک نیا ذریعہ بن گیا۔ لنچ بریک کے دوران ان میں سے ایک نے قدرے بلند آواز میں اپنی نئی خوبصورت کولیگ ژوبیہ سے کہا۔

ژوبیہ اس ماں بننے کی کنڈیشن میں تم وڈی چارمنگ لگ رہی ہو۔ دراصل پریگنیسی کا اپنا حسن ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک نوجوان عورت ہی پریگنینٹ ہو سکتی ہے ایک تو ڈھلتی عمر دوسرے چہرے پر ماں بننے کی چاندنی۔ ہائے۔۔۔ ہم تو اپنا وہ دور کبھی نہیں بھول سکتے! شکر ہے ہم لوگوں کی شادیاں وقت پر ہو گئیں ورنہ تو۔۔۔ اس نے استہزائیہ نظروں سے تمکین کی طرف دیکھا اور تینوں نے بے ہودہ سا قہقہہ لگا دیا۔ تمکین تو بس زیر لب کوئی ورد ہی کر رہی تھی۔ شہریار تصویر کے پیچھے سے نکل کر بالکل سامنے آ بیٹھا تھا اور وہ جیسے اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی تھی۔ بڑی عمر کی یہ عورت بڑی سیانی تھی خیال کے پنجرے میں رکھے شہریار کے خدوخال اور واضح ہو گئے تھے۔

پھر ایک دن جب ژوبیہ اپنے ہونے والے بچے کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کر کے دفتر آئی تو دونوں کولیگس کے ہاتھ ایک اور موقع لگ گیا۔

اف اللہ۔۔۔ کتنے پیارے ننھے ننھے کپڑے اور سویٹر ہیں ماں بننے کے دوران یہ سب کتنا پرکشش لگتا ہے پر کاش ہر عورت کے نصیب میں بچوں کی شاپنگ لکھی ہوتی۔ مگر کیا کریں۔۔۔ ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے۔ باسی کڑھی میں ابال کبھی نہیں بچا ہے؟

تمکین کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے کوئی عورت اپنے اوپر اس سے بڑی تہمت نہیں سہہ سکتی کہ وہ بانجھ ہے۔ اس کا جی چاہا وہ تینوں چھچھوری عورتوں کا ستیاناس کر دے لیکن کرسی پر ننھی سی ٹانگیں ہلاتے شہری نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا اور وہ خود پر قابو پانے کی کوشش میں نمناک ہوتی باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے تینوں عورتوں کی وحشی آوازیں بدروحوں کی طرح ادھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔

پھر ایک دن اچانک دفتر سے کبھی ناغہ نہ کرنے والی تمکین کا میڈیکل آ گیا۔ ایک ماہ کی چھٹی ڈاکٹروں نے سفارش کی تھی۔ اور اسے مکمل بیڈ ریسٹ کی ضرورت تھی۔

کیا؟ کیا کہا؟ تمکین اور بیڈ ریسٹ؟ اس عمر میں؟؟ دونوں کولیگس تو بے شرمی کی حد تک چیخیں۔ کیفے ٹیریا میں لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے۔

اس میں چلانے کی کیا بات ہے؟ مسز جمشید پہلی بار آہستہ سے گویا ہوئیں۔ قدرت کے کرشمے میں کسے دخل ہے؟ انسان سے انسان کو وجود میں لانا قدرت کا کام ہے انسانوں کے بس کا روگ نہیں! انہوں نے کہا۔

یہ تو وہی مثل ہوئی۔ بڑی عمر کی ماں۔ کہاں کھائے گی کہاں جنے گی!! چلو یونہی سہی۔ عورت کسی بھی عمر میں ماں بنے سنور جاتی ہے کلیوں کی طرح مسز جمشید کی آواز میں سرمدی مسکان تھی۔

اور جب تمکین بیڈ ریسٹ سے واپس آئی تو اس کی میز پر نہایت بدتہذیبی سے ایک مرجھائے ہوئے پھول کی تصویر کسی نے رکھ دی تھی جس کے کونے پر لکھا تھا ”بڑی عمر کی ماں“ لیکن تمکین نے اطمینان سے ایک پیاری سی نظر اپنے شہریار پر ڈالی پھر تینوں عورتوں کے سامنے مرجھائے پھول کی تصویر کو بوسہ دیا اور اسے عقیدت سے اپنے پرس میں رکھ لیا۔ آفس کے اندر زہریلی ہوا چلنے لگی جو تینوں جوان عورتوں کے منہ پر جھریاں ڈال رہی تھی۔

ژوبیہ کے دن جوں جوں گزر رہے تھے اس کا شباب اور نکھر رہا تھا۔ دونوں کولیگس اس کی تعریفیں کر کر کے اس سے خوب آؤٹ ڈور لنچ اور پارٹیاں لیتیں البتہ تینوں کا ذائقہ تمکین کی اہانت کا محتاج تھا۔ وہ جب تک اس کی موجودگی یا عدم موجودگی میں اس کا مضحکہ نہ اڑا لیتیں بے ذائقہ رہتیں لیکن تمکین کچھ دنوں بعد پھر ایک بچے کے میڈیکل لیو پر چلی گئی۔

”ہمیں پہلے ہی پتہ تھا“ دونوں کولیگس نے طنز کیا۔ بھلا اس عمر میں بچہ ٹھہرتا ہے کمزور ہڈیاں، گرتی عمر، سہن نہ کر سکتا۔ ہزاروں پیچیدگیاں ہیں کوئی اس عمر میں بنا رسک ہے“ وہ تبصرہ کرتی چلی گئیں۔

لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ تمکین اپنے شوہر کے ساتھ گھومنے پھرنے گئی تھی۔ تینوں کے ارمان اوس اوس ہو گئے اور اس روز تو قیامت ہی آ گئی جب چکرا کر گرتی نوجوان ژوبیہ وقت مقررہ سے پہلے میٹرنٹی وارڈ میں داخل کر دی گئی۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”مس کیرج“ ژوبیہ کی ساس نے افسردگی سے بتایا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے ژوبیہ اتنی تندرست، اتنی ینگ، کولیگس بولیں

”ایسا ہونا ناممکن نہیں“ ساس نے کہا ”ایسا ہو بھی جاتا ہے لیکن۔۔۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے یہ ہے کہ میری بہو اب کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ دونوں کولیگس کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔

تمکین کو بھی اطلاع ملی اسے دکھ تو ہوا لیکن اس نے کچی ریل کی عمر میں جس شہریار کو سوچا تھا اُسے جسم دیا اور پکی عمر میں ملنے والے شہریار کو پیار کرنے لگی جو چار دن کر اس کی گود میں آنے ہی والا تھا۔

☆

ایک خواہش ایک سوال

ڈاکٹر رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

میں نے جب دل کی بات مان کر عقل کو پیچھے دھکیل دیا اُس کی آواز اَن سنی کر دی جو مجھے بار بار میری عمر اور رتبے کا احساس دلا رہی تھی مگر دل تھا کہ اس عمر میں بھی ادھوری خواہش پوری کرنے کے موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ اُس وقت میں نے انجام کی پروا نہیں کی۔ اُسے دیکھتے ہی میرا دل پھر سے ویسے ہی دھڑکنے لگا تھا جیسے جوانی میں دھڑکتا تھا۔

میں اپنے دوست کو چھوڑ کر ایئرپورٹ سے نکل رہا تھا کہ میری نظر سامنے کھڑی اُس عورت پر ٹک گئی جس کا چہرہ پچھلے پچیس سالوں سے میرے دل میں بسا تھا۔ اس تصویر اور سامنے کھڑی اس عورت میں عمر کا فرق تو آ گیا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ میں اُسے پہچان نہ پاتا۔ اُس چہرے کو میں لاکھوں کی بھیڑ میں بھی پہچان لیتا۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی میں نے اُس کی یادوں کو دل کے کسی کونے میں زندہ رکھا تھا وہ میرا پہلا پیار تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹھک گئی غور سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو پھر آنکھوں میں ایک دم چمک اُبھر آئی اور چہرا کھل اُٹھا۔ لپک کر وہ میری طرف بڑھی۔

''تم کرن ہو نا؟''

''ابھی تک تو کرن ہی ہوں کل کا پتا نہیں''۔ میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملانے کو آگے بڑھایا تو وہ تپاک سے گلے لگ گئی۔ وہ اس گرم جوشی سے ملی جیسے دو پرانے دوست ایک مدت بعد ملتے ہیں۔ اور میں اس لمحے کی سحر آگیں فضا میں کھو گیا۔ میرا پیار پہلی بار مجھے گلے مل رہا تھا دل کی یہ آرزو تھی کہ وقت یہیں تھم جائے مگر وقت کہاں رُکتا ہے۔ اگلے ہی پل وہ مجھ سے الگ ہو کر مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''جوانی میں تو اتنے ہینڈسم نہیں تھے؟''

''تمہیں کس نے کہہ دیا کہ میں جوان نہیں ہوں۔ میں تو ابھی بھی جوان ہوں۔ یہ بات اور ہے کہ بالوں میں تھوڑی چاندی جھلکنے لگی ہے۔ دل تو ابھی بھی تیس سے پار نہیں ہوا''۔

''انٹرسٹنگ! ویری انٹرسٹنگ۔ (Very interesting ! interesting)۔

''اکیلی آئی ہو؟''

''بالکل اکیلی۔ میاں جی کے پاس وقت نہیں ہے۔ وہ آج کل فرانس گئے ہوئے ہیں۔ ایک بیٹی ہے وہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہے۔ تم بتاؤ کہاں ہوتے ہو آج کل؟

''میں تو اسی شہر کا باشندہ ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ کوئی لینے آنے والا ہے تمہیں؟''

''نہیں۔ میں سرپرائز دینے والی ہوں سب کو۔ اچانک اپنے سامنے دیکھ کر جو ماں بابا کی آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے بس وہ دیر تک یاد رہتی ہے پھر''۔

''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں چھوڑ دیتا ہوں تمہیں''۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔ اسی بہانے تمہارے ساتھ باتیں کرنے کا موقع بھی مل جائے گا''۔

''مجھ سے باتیں کرنے کا موقع یا بہانہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں''۔

''شاعری بھی کرنے لگے ہو؟ کچھ اپنے کچھ دوستوں کے بارے میں بتاؤ۔ مجھے تو مدت ہو گئی کبھی کسی سے ملاقات ہی نہیں ہوئی''۔

راستے بھر کالج کے دوستوں اور اُن دنوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ میرے بارے میں بھی پوری معلومات حاصل کر لی۔ پچیس سالوں کا سفر ہم نے پچیس منٹ کے راستے میں طے کر لیا۔ باتوں باتوں میں کب اس کا گھر آ گیا پتا ہی نہ چلا۔ اس نے اندر آنے کو کہا تو میں ٹال گیا۔

''آج نہیں پھر کسی دن آؤں گا''۔

''صرف ایک ہفتے ہی ہوں میں یہاں۔ اگلے منگل کو میں واپس چلی جاؤں گی۔ ہو سکے تو وقت نکال لینا۔ سچ کہوں تو تم سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ایسے لگا گزرا زمانہ لوٹ آیا ہے''۔

''مجھے بھی بہت اچھا لگا۔ میں خود تم سے ملنا چاہوں گا۔ تمہارا سیل نمبر میں نے فیڈ کر لیا ہے۔ جلد ہی فون پر بات ہوتی ہے''۔

اتنا کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا مگر ذہن کالج کے دنوں میں کھو گیا۔ رچنا میرے ساتھ کالج میں پڑھا کرتی تھی۔ آٹھ لڑکے لڑکیوں کا گروپ تھا جس میں وہ بھی شامل تھی۔ سب کو اس بات کا علم تھا کہ میں اس کا شیدائی ہوں۔ اسے دیکھ کر میں سب کچھ بھول سا جاتا ہوں۔ اسے اس بات کا پتا تھا مگر اس نے کبھی ہو نہیں لگنے دی۔ وہ میرا پہلا پیار تھی۔ اسے لے کر اس دل نے بہت سے خواب سجا رکھے تھے ابھی میں اپنی حسرتوں اپنی خواہشات کا اپنے جذبات کا اظہار بھی نہ کر پایا تھا کہ معلوم ہوا کہ وہ تو جلد ہی اپنی نئی دنیا بسانے جا رہی ہے۔ دل کی بات دل میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ میں چپ چاپ تماشائی بنا ہی رہ گیا اور اس نے کسی اور کی دنیا بسا دی۔ بمبئی کے کھاتے پیتے گھر میں اس کا رشتہ طے ہوا تھا۔ اسی خوشی میں اس نے دوستوں کو بڑی شاندار پارٹی بھی دی تھی جس میں میں شامل نہیں ہوا۔ اس نے گلہ بھی کیا مگر میں خاموش رہا۔ اس دن کے بعد میں اس سے کترانے لگا تھا۔ پھر امتحانوں کے ختم ہوتے ہی اس کی شادی ہو گئی اور اس کے

بعد میری اس سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس کی ہر خبر مجھے ملتی رہتی۔ زندگی اپنی رفتار سے بڑھتی گئی اور میں بھی زندگی کے بہاؤ میں بہتا چلا گیا۔

معروفیت کے باوجود اس کے فون کا انتظار دل میں رہا۔ دفتر کے کام سے باہر جانے والا تھا وہ بھی رد کر دیا۔ منگل والے دن صبح ہی اس کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ اُسے کچھ خریداری کرنی ہے اور پھر یہ طے پایا کہ ہوٹل تاج محل میں ہم دونوں لنچ ایک ساتھ کریں گے۔ ٹھیک دو بجے میں تاج کی ''Lobby'' میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ انتظار کے پل کاٹے نہیں کٹ رہے تھے۔ مجھے خود پر تعجب تھا کہ اس عمر میں بھی دل کی دھڑکنے نہیں بدلیں اس کے ارمان نہیں بدلے۔ مسکراہٹ چہرے پر سجائے اور ہاتھوں میں شاپنگ کے تھیلے لئے بڑھی چلی آ رہی تھی اور میں اس کی دلفریب مسکراہٹ میں کھو گیا۔ لنچ کے دوران پرانے قصوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دوستوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ باتوں باتوں میں پتہ ہی نہ چلا کہ کیسے میرے دل کی بات زباں تک آ گئی۔

''تمہاری شادی کا سن کر بہت دھکا لگا تھا مجھے۔ تم جانتی تھیں کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں''۔

''جانتی تو تھی پر کر کچھ نہیں سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری شادی پاپا کے دوست کے بیٹے سے ہی ہوتی ہے۔ تمہیں بتا کر کیا کرتی کہ تم مجھے پسند ہو''۔

اُس کی بات سن کر میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ لڑکیوں کا ہاضمہ اتنا مضبوط ہوتا ہے؟ کوئی بھی راز چاہے تو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں اس کی بھنک تک نہیں پڑنے دیتیں۔

''اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ اشوک نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا ہے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ پیسے کی کوئی کمی نہیں کبھی کسی بات پر روک ٹوک نہیں۔ ایک بیٹی ہے جو ہم دونوں کو بہت پیار کرتی ہے۔ ہماری جان ہے۔ زندگی کا ہر سکھ میسر ہے۔ زندگی سے کوئی گلہ کوئی شکایت نہیں''۔

''اس معاملے میں بد نصیب میں بھی نہیں ہوں۔ ساوی دل وجان سے چاہتی ہے۔ دونوں بیٹے پڑھ رہے ہیں۔ نوکری اچھی ہے۔ سب کچھ تو ہے پھر بھی تھوڑی سی کسک ہے جو کہ بیچا ہے پریشان کرتی ہے''۔

''وہ کیا؟''

''اپنے پہلے پیار کو چاہتے ہوئے بھی بھلا نہ پایا۔ بہت سے سپنے دیکھے تھے جوانی میں جو آج بھی آنکھوں میں تیرتے ہیں''۔

''مثلاً؟''

''اپنے پیار کے ساتھ زندگی گزارنے کے گھر بسانے کے''۔

''وہ تو اس جنم میں ممکن نہیں۔ ہاں زندگی تو نہیں ایک دن اس زندگی سے چرا تو سکتے ہیں''۔ اس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

مجھے اس کی بات پر حیرانگی بھی ہوئی اور دل میں خوشی بھی محسوس ہوئی۔ میں اپنی جوانی کے ادھورے ارمان اس عمر میں ایک دن میں پورے کر سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہی میری آنکھیں چمک اٹھیں۔

''اگر میں اس وقت ہاں کر دیتی تو پورا دن تم میرے ساتھ کیسے بتاتے؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''میں تمہیں اپنی موٹر سائیکل پر شملہ لے جاتا۔ ان حسین خوبصورت پہاڑیوں میں ہاتھوں میں ہاتھ تھامے گھومتے خوب موج مستی کرتے پیار کی باتیں کرتے جیتے مرنے کی قسمیں کھاتے اور شام کو واپس لوٹ آتے''۔

مجھے خود اپنے جذبات بڑے معصوم لگے۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اب اس عمر میں میں موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھوں گی اور شملہ بھی نہیں جاؤں گی۔ گاڑی میں لے چلو اور وہ بھی کسولی تک ہی۔ کسولی کی پہاڑیوں میں گھوم لیں گے۔ وہ بھی اتنی ہی دلکش اور خوبصورت ہیں''۔

''ٹھیک ہے تو کس دن ڈیٹ پر چل رہی ہو؟''

''میں اشوک سے پوچھ لیتی ہوں تم ساوی سے پوچھ لو پھر چلتے ہیں''۔

وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

''پھر تو یہ دن اگلے ہی جنم میں آئے گا''۔ میں نے مایوس ہو کر کہا۔

''پرسوں چلیں؟ شیکھر کو تو میری واپسی ہے''۔

''پرسوں تو منگل ہے۔ صبح کیا دس بجے کہاں ملوگی؟ گھر لینے آؤں؟''

''پرانے دن واپس لانے کی کوشش کر رہے ہو تو کالج کے باہر ہی ملوں گی''۔

''ٹھیک۔ منگل صبح کیا دس بجے''

''ساوی کو ساتھ لے چلتے ہیں۔ میں اس سے کبھی ملی نہیں۔ اسی بہانے ملاقات بھی ہو جائے گی''۔

مجھے چڑانے میں اُسے مزا آ رہا تھا۔

''اگلی بار ملواؤں گا۔ ڈیٹ پر ہم دونوں ہی جائیں گے''۔

میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا اور پھر مقرر دن اور وقت پر ملنے کا وعدہ کر کے ہم دونوں اپنے اپنے راستے ہو لئے۔

یہ دو دن میں نے بہت مشکل سے کاٹے۔ میری بے چینی ساوی سے چھپی نہ رہ سکی۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''کیوں کیا ہوا میری طبیعت کو؟''

''کچھ پریشانی ہے کیا؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ دفتر میں کچھ کام زیادہ ہے اسی سلسلے میں مجھے کل شاید سوان بھی جانا پڑے۔ تم فکر مت کرو یہ سب تو چلتا رہتا ہے''۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میں جانتا تھا میرے اس جواب سے اسے تسلی نہیں ہونے والی۔ میرا چہرہ دیکھ کر وہ سب بھانپ لیتی تھی۔ زندگی کے ہر موڑ پر ہر مشکل میں اس نے میرا ساتھ دیا ہے۔ بچوں کی پرورش اچھی طرح سے ہو سکے اس نے بینک کی ملازمت چھوڑ دی۔ اپنا (career) اپنے گھر پر قربان کر دیا۔ اپنی ایک بھولی بسری چھوٹی سی خواہش کو پورا کرنے کے لئے میں اپنی بیوی سے جھوٹ بول رہا تھا۔ دوسرے ہی پل میری آرزوؤں نے ضمیر کی آواز کو دبا دیا۔

گھر بار گیارہ بجے سے چند منٹ پہلے ہی میں گاڑی لے کر کالج کے باہر کھڑا تھا۔ دفتر سے چھٹی لے لی تھی اور ساوی کو بہانہ بنا دیا تھا کہ سوان دفتر کے کام سے جا رہا ہوں شام تک لوٹ آؤں گا۔ ٹھیک گیارہ بجے رچنا میرے سامنے تھی۔ کالج کے ماحول اور اپنے اردگرد نوجوان لڑکے لڑکیوں کو دیکھ کر اپنی عمر کا احساس ہی نہیں رہا۔ ہم دونوں اس طرح خوش تھے کہ کالج کی پکنک پر جا رہے ہوں۔ گاڑی اپنی رفتار سے کسولی کی طرف بڑھ رہی تھی اور ہم دونوں اپنی موجودہ زندگی کو بھول کر ماضی میں پہنچ چکے تھے۔ اس عمر کو جیتے ہوئے لمحوں میں جینا چاہتے تھے صرف ایک دن اس زندگی سے چوری کر کے ادھوری خواہشوں' ادھورے ارمان کے نام کر دی تھی۔ کسولی کی فضا میں عجیب سا جادو تھا۔ گھنے دیودار کے پیڑ، چاروں طرف ہریالی، ہوا کا سنگیت اور اس پر ہلکی ہلکی بوچھاڑ' کہیں کہیں بادلوں کا دھواں جیسے بادل زمین پر اتر آئے ہوں۔ ایک دوسرے کے ساتھ کا خمار کچھ موسم اور کچھ ان حسین وادیوں کا جادو جس نے ان لمحوں کو یادگار بنا دیا۔ ہاتھوں میں ہاتھ پکڑے ان گھنے درختوں کے بیچ و بیچ کبھی خاموش تو کبھی باتیں کرتے ہنستے مسکراتے ٹہلتے رہے۔ ایک دوسرے کے دل کے تاروں کو چھیڑتے جسموں کی لذتوں سے کوسوں دور اپنی اپنی حدوں میں مقید پھر بھی رشتوں کی ڈور سے آزاد ایک دوسرے کی محبت میں وقت کیسے پنکھ لگا کر اڑ گیا پتہ ہی نہ چلا۔ سورج ڈھلنے لگا تو گھنے درختوں میں شام کے سائے بڑھنے لگے۔ چہچہاتے پرندوں کو گھر کی اور اڑان بھرتے دیکھ ہمیں بھی اپنے آشیانے یاد آنے لگے۔ خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں لوٹنے کا وقت آ گیا۔ زندگی میں یہ وہ سنہرا دن تھا جو کبھی پلٹ کر نہیں آنے والا تھا۔ اب وہ صرف یادوں کا اک حصہ بن کر دل و دماغ پر اپنی امٹ چھاپ چھوڑ گیا تھا۔ پھر کبھی دوبارہ نہ ملنے کا اک دوسرے سے وعدہ کر کے ہم واپسی کے لئے روانہ ہو پڑے۔ ہم نے کب سوچا تھا کہ اس یادگار سنہرے دن کا اختتام اس طرح ہوگا۔ شام کے سائے بڑھ رہے تھے۔

بارش کی وجہ سے راستہ بھی دھندلا سا تھا۔ لمن کی تماری' گھبر نے کا غم سب تاثرات ذہن پر اس طرح حاوی تھے کہ سامنے سے آتی ٹرک کی تیز روشنی نے آنکھیں چندھیا دی۔ سڑک پر پھسلن کی وجہ سے میرے سٹیرنگ (Steering) کا بیلنس خراب ہو گیا۔ زوردار ٹکر کی آواز اور رچنا کی دردناک چیخ پہاڑوں میں گونج گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ ہوش نہیں۔ آنکھیں کھلیں تو خود کو ہسپتال کے بستر پر پایا۔ میں نہیں جانتا میں کب اور کیسے یہاں لایا گیا۔ درد سے جسم کا روؤں روؤں ٹوٹ رہا ہے۔ بے خودی کی حالت سے بے خبر رچنا کے انجام سے انجان میں صرف اپنے اردگرد کھڑے لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر ساوی، میرے دونوں بیٹے چند ڈاکٹر اور نرسیں میرے آس پاس کھڑے تھے۔ ساوی کو دیکھ کر میرے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ایک ہلچل سی شروع ہو گئی۔ کمرے میں دو پولیس والے بھی داخل ہوئے تو سارا واقعہ میری آنکھوں کے آگے گھوم گیا۔ اب میں نے جان بوجھ کر آنکھیں موند لی۔ ایک چھوٹی سی خواہش نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا کن سوالوں کے گھیرے میں پھنسا دیا۔

۔چہارسو۔

صہبائے آرزو کا ہے نشہ چہار سُو
جاری ہے کب سے رقصِ تمنا چہار سُو

دیکھا تجھے تو دیکھنے کی تاب ہی گئی
اک چہرہ اور ایک ہی چہرہ چہار سُو

یہ اہتمامِ عشق۔ یہ ساماں وصال کے
یا آئینوں میں عکس ہے میرا چہار سُو

بانہوں میں ایک پل میں ہی صدیاں گزر گئیں
پھیلا ہوا ہے ایک ہی لمحہ چہار سُو

دیکھو نگاہِ دل سے مناظر ہیں مختلف
لگتا ہے ویسے ایک ہی جلوہ چہار سُو

۔محمود شام۔

(کراچی)

جنّتِ گم گشتہ

محمود الحسن (راولپنڈی)

یہ اور بات کہ کمتر تری نگاہ میں ہوں
مگر یہ کم تو نہیں تیری بارگاہ میں ہوں

گدا ضرور ہوں لیکن ہوں تیرے در کا گدا
میں مشتِ خاک اگر ہوں تو تیری راہ میں ہوں

ڈرا رہے ہیں مجھے لوگ کیوں اندھیروں سے
خبر نہیں ہے انہیں تیری جلوہ گاہ میں ہوں

ابھی تو مجھ پہ کھلا ہی نہیں ہے رازِ حیات
ابھی تو صرفِ تمنائے واہ واہ میں ہوں

ابھی تو گردشِ دوراں سے میں نہیں خائف
ابھی تو اے مرے آقا تری پناہ میں ہوں

ابھی تو سارا زمانہ ہے ہمنوا میرا
ابھی تو نغمہ سرا مدحِ بادشاہ میں ہوں

نہیں ہے جنّتِ گم گشتہ کی تلاش مجھے
میں تیرے دل میں ہوں جب تک تری نگاہ میں ہوں

نہیں ملا تو ترا گھر نہیں ملا مجھ کو
کبھی میں اس کی کبھی اُس کی خانقاہ میں ہوں

ابھی تو دیدۂ عبرت ہی وا نہیں محمودؔ
ابھی تو محو میں پندارِ کج کلاہ میں ہوں

سید مشکور حسین یاد (لاہور)

تُو ساتھ ہے تو مرا زمانہ بطورِ امکاں بھی خوب تر ہے
مرا شعورِ معاصرانہ بطورِ بیاں بھی خوب تر ہے

اِسے بھی چاہو اُسے بھی چاہو ہر ایک سے عشق کو بڑھاؤ
یہ ہے تقاضاً عاشقانہ بطورِ فرماں بھی خوب تر ہے

میں جانتا ہوں میں مانتا ہوں تو پاس بھی ہے سپاس بھی ہے
مرا یقیں دانشِ یگانہ بطورِ ناداں بھی خوب تر ہے

تُو جان کر بھی نہ مجھ کو جانے میں مان کر بھی نہ خود کو مانوں
یہ اپنا پندارِ کافرانہ بطورِ ایماں بھی خوب تر ہے

یہ رُوپ غم کی تمازتوں کا یہ دُھوپ دم کی تمازتوں کی
بطورِ ارماں بھی خوب تر ہے بطورِ درماں بھی خوب تر ہے

ترا گمانِ گواہِ ساماں ترا پیامِ پناہِ پیکاں
بطورِ آساں بھی خوب تر ہے بطورِ احساں بھی خوب تر ہے

ہمارا دل یاد میں جو تیری ہے فرش تا عرش اپنی حد میں
بطورِ ایواں بھی خوب تر ہے بطورِ کیواں بھی خوب تر ہے

انور سدید (لاہور)

مرے ساتھ چلنے والو مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ
میں جو گر پڑا ہوں رہ میں، مجھے آ کے خود اٹھاؤ

جو ستون گر گیا ہے، نہ ملال اس کا کیجیے
یہاں کون جم سکا ہے؟ یہ ہے وقت کا بہاؤ

جسے راس آ گئی تھی روشِ زمانہ سازی
اسے اک نظر نہ بھایا، مرا عجز، رکھ رکھاؤ

ہوں اداس رت کا باسی مری زیست کی اداسی
یہی کہہ رہی ہے سب کو کہ خوشی کے گیت گاؤ

ہوں خنک مزاج بندہ، تری بزم دوستاں میں
مرے ذہن میں اگرچہ ہے سلگ رہا، الاؤ

جو گزر گیا ہے لمحہ، نہ اب اس کا ذکر کیجیے
ہے جو حال کا زمانہ، اسے خوش نظر بناؤ

مرے دشمنوں نے کی ہے مری خوب چارہ سازی
مرے دوستوں سے کہہ دو، مرا بھر چلا ہے گھاؤ

وہ جو ایک شخص انورؔ بنا راہ کے لیے پتھر
یہ ہے وقت کا تقاضا، اسے راہ سے ہٹاؤ

○

مظفر حنفی (دہلی بھارت)

سیلابوں کو شہ دینے میں، طوفاں کو اُکسانے میں
کتنے ہاتھوں کی سازش ہے اک دیوار گرانے میں

تو نے بہتیرا سمجھایا، موٹی کھال، گرہ میں مال
اے دنیا کیسے آ جاتے ہم تیرے بہکانے میں

فن کو مہکائے رکھتے ہیں زخمی دل کے تازہ پھول
ٹوٹی کشتی کام آتی ہے نیا پار لگانے کو

تتلی جیسے رنگ بکھیر و گھائل ہو کر کانٹوں سے
مکڑی جیسے کیا الجھے بیٹھے ہو غم کے تانے بانے میں

بیزاری کے ہاتھ نہ مرنا، سو حیلے ہیں جینے کے
پیارے، سر میں وحشت ہو تو گرد بہت ویرانے میں

بجھتے بجھتے بھی ظالم نے اپنا سر جھکنے نہ دیا
پھول گئی ہے سانس ہوا کی ایک چراغ بجھانے میں

کھویا جی کا چین مظفرؔ اُن سے ترکِ تعلق پر
آ پہنچے گرداب کے منہ تک، دریا سے کترانے میں

○

محمود شام (کراچی)

یوں جو کم دام ہوئے چشمِ خریدار میں ہم
اس سے بہتر تھا کہ آتے ہی نہ بازار میں ہم

وہ تو دیوار گرانے سے ہی مل سکتی تھی
جو اماں ڈھونڈتے تھے سایۂ دیوار میں ہم

عمر تو کاٹ دی اس شوخ کی دلداری میں
وقت آیا تو شمارے گئے اغیار میں ہم

تیر دشمن پہ چلاتے تھے ترے نام کے بھی
یاد رکھتے تھے مجھے عرصۂ پیکار میں ہم

اشک گرتے تھے کراچی کے تم ہم پہنچے تھے
گرچہ کچھ اور ہی منصب پہ تھے دربار میں ہم

طبلِ صلح بجانے پہ ہی مجبور ہے تو
ایسے پیوست ہوئے ہیں تری تلوار میں ہم

جسم جھلسے ہوئے، دل کرب میں، روحیں زخمی
سرخیاں کیسی لگاتے رہے اخبار میں ہم

ناخدا دور کنارے پہ کھڑے دیکھتے ہیں
شامؔ پہلے کی طرح آج بھی منجدھار میں ہم

○

مامون ایمنؔ (نیویارک)

دھڑکنوں میں دید کا سودا نہیں
خواب، دل سے آنکھ تک پہنچا نہیں

پاس داری عشق میں بے جا نہیں
حسن کی دیوار، اے دل! ڈھا نہیں

ایک بھی دیوار میں در وا نہیں
بے خودی میں خود کو دل بھولا نہیں

آئینے میں دید کی ریکھا نہیں
مڑ کے ہم نے راستہ دیکھا نہیں

پیار جگ میں سوچ کر ہوتا نہیں
کس لیے ہوتا ہے یہ سوچا نہیں

عشق کہتا ہے کہ اندھی آنکھ کا
حسن کی جانب قدم اٹھتا نہیں

ٹوٹ کر بادل نیا برسے کوئی
دشت کا دامن ابھی بھیگا نہیں

خود بنائے راستے ہم نے سدا
راستہ تقدیر کا دیکھا نہیں

بے غرض ہم کو سفر میں راہ سے
کیا کہیں جانا کہاں جانا نہیں

اس کو ہرجائی کہے گا ہر قدم
ایک در پہ دل اگر ٹھہرا نہیں

آسرا ہے زندگی کو موت کا
کیسے کہہ دیں دھوپ میں چھلا نہیں

غم کے پتھر سے کہا جائے، ابھی
آئینۂ احساس کا ٹوٹا نہیں

آئے ہیں لاہور سے نیویارک ہم
اس سفر کا راستہ سیدھا نہیں

آپ ہی، ایمنؔ! غزل پڑھ دیجیے
شہر کا موسم اگر اچھا نہیں

کرشن کمار طور (دھرم شالہ بھارت)

نمایاں کاسۂ تدبیر میں جو ہوا تھا
وہی ہوا مری تقدیر میں جو ہوا تھا

وہ اک مکان الگ سے دکھائی دیتا ہے
ہماری حسرت تعمیر میں جو ہوا تھا

عجیب ردعمل ہے مرے عمل کا یہاں
ہے خواب' خواب کی تعبیر میں جو ہوا تھا

کہیں سپاٹ بیانی نہ اب مقدر ہو
وہ ہے بھی لذت تقریر میں جو ہوا تھا

ہیں اور ساری ہی باتیں ورق پہ لکھی ہوئیں
وہی نہیں ہے کہ تحریر میں جو ہوا تھا

وہ میری آنکھ بچا کر نکل کے جاتا کہاں
اسے یہاں مری تسخیر میں جو ہوا تھا

میں بچ کے جاتا کہاں طور اس اسیری سے
مجھے کہ حلقۂ زنجیر میں جو ہوا تھا

○

غلام مرتضٰی راہی (فتح پور بھارت)

سیدھی اکدم نہ مری چال رہنی چاہیئے ہے
کچھ کسر اس میں بہر حال رہنی چاہیئے ہے

پھُو لیے جلتے رہیں سرسبز درختوں کے طفیل
خشک بھی کوئی کوئی ڈال رہنی چاہیئے ہے

ذائقہ تھوڑا بہت پیار کی ہانڈی میں رہے
اس میں کچھ گلتی ہوئی دال رہنی چاہیئے ہے

زور بازو کا چلے جنگ کے میدان میں پھر
وہی تلوار وہی ڈھال رہنی چاہیئے ہے

مجھ سے جو خوف نظر کرتے ہیں' یہ مانتے ہیں
گھاس تو گھاس ہے پامال رہنی چاہیئے ہے

ایک اک پل کا کیا کرتے ہیں جو قرض ادا
زندگی ایسوں کی سو سال رہنی چاہیئے ہے

مجھ کو پہنچایئے راہی کسی نسبت کے بغیر
جسم پر میرے مری کھال رہنی چاہیئے ہے

○

نکہت بریلوی (کراچی)

عظمتِ عشق بڑھاتے ہی رہے ہیں ہم لوگ
آگ میں پھول کھلاتے ہی رہے ہیں ہم لوگ

فصلِ گُل ہو کہ خزاں صحنِ چمن ہو کہ قفس
پیار کی دھوم مچاتے ہی رہے ہیں ہم لوگ

درد کے پھول نکھرتے ہی رہے ہیں ہر شب
جشنِ نَو روز مناتے ہی رہے ہیں ہم لوگ

شعلۂ غم ہے کہ سینے میں اتر آیا ہے
اور دامن کو بچاتے ہی رہے ہیں ہم لوگ

اب کے جائیں گے تو کچھ اور ہی سج دھج ہوگی
یوں تو اُس بزم میں جاتے ہی رہے ہیں ہم لوگ

○

قیصر نجفی (کراچی)

کوئی نہ کوئی تو حق بات بھی کہے گا کبھی
سراب و آب میں کیا فرق ہے کھلے گا کبھی

اس ایک آس پہ چلتے رہے اندھیروں میں
کوئی چراغ بکف راہ میں ملے گا کبھی

بجا کہ آج نہیں کوئی گوش برآواز
یہ دیکھنا کہ مجھے شہر بھر سنے گا کبھی

امیر شہر بھی دیتا نہیں ضمانت اب
کہ فاقہ کش نہ کوئی خودکشی کرے گا کبھی

یہ خوش گمانی تو ہم کو ہے ایک مدت سے
کہ سر سے سایۂ آسیب یہ ہٹے گا کبھی

تُو خوب لکھتا ہے قیصرؔ بزعم خود لیکن
یہ کیا ضرور کہ کوئی تجھے پڑھے گا کبھی

سرُور انبالوی (راولپنڈی)

وہ حسن کے پھول ابھی تک بھی ہیں کتابوں میں
اُنہیں کا نام لکھا ہم نے انتسابوں میں

ہزار پردوں سے چھن کر نظر تک آ پہنچا
کبھی چھپا ہے بھلا حُسن بھی حجابوں میں

یہ تیری اُنگلیوں کے لمس کا کرشمہ ہے
کہ بس گئی ہے تری باس اِن گلابوں میں

کسی کی یاد کو دل میں بسا لیا تھا کبھی!!
گھرا ہوا ہوں ابھی تک میں کن عذابوں میں

نہ جانے کونسی منزل میں کھو گئے ہو تم
جھلک بھی اب تو دکھاتے نہیں ہو خوابوں میں

ہزار کھینچئے زنجیرِ سوجتن بھی کریں
گزرتا لمحہ ٹھہرتا ہے کب رکابوں میں

ہر ایک چہرہ پہ لکھی ہے داستانِ الم
یہ راہبر ہمیں لے آئیں کن خرابوں میں

نہ جانے کتنے ہی ارماں لے اُڑی کونجیں
مجھے یہ خوف نہ گر جائیں یہ عقابوں میں

سرُور اشک بھی آنکھوں میں اب نہیں باقی
کسی کی یاد بھی آئی ہے کن سرابوں میں

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

(بھارت)

روشنی کا بزم میں گرچہ بہت دفتر کھلا
ظلمتوں کا ہر ورق لیکن ہمارے گھر کھلا

یوں تو اس کا خوب سے ہے خوب تر جوہر کھلا
کب مگر پوری طرح انساں ہے انساں پر کھلا

ہم بنائے بھی گئے تو ایسے زندگی کے اسیر
جس حویلی کا ہے دروازہ نہ کوئی در کھلا

اک کتاب بند ہے جو آج تک اپنے لئے
کیا گلہ وہ خود نما مجھ پر نہیں ہے گر کھلا

باغبانِ موسمِ گل کا کیا ہے اہتمام
ہے پرندوں کا تہہ دام اب چمن میں پر کھلا

رات میں ڈالا گیا تھا قید میعادی میں جو
ایسے ہی سورج کا شعلہ سر پہ ہے دن بھر کھلا

جو ہمارے ابروؤں کے بل کی پیداوار ہے
کیا دکھاتا ہے مناظرؔ ہم کو وہ تیور کھلا

O

غالب عرفان (کراچی)

کفن سر پر لبوں پر پیاس رکھنا
قلم لیکن سرِ قرطاس رکھنا

علامت ہے بھنور میں ڈوبنے کی
سمندر سے بہت سی آس رکھنا

بدن پر ہو نہ ہو رنگیں لبادہ
سدا سچائی کی بو باس رکھنا

اُگا سکتے نہیں گھر میں شجر تو
بڑھا کر صحن میں کچھ گھاس رکھنا

بہت مشکل ہے اپنے دکھ سے بڑھ کر
پرائے درد کا احساس رکھنا

ثبوتِ پستیِ فکر و نظر ہے
زرِ عرفاں کو محوِ یاس رکھنا

O

اکبر حمید (اسلام آباد)

زندگی احتیاط چاہتی ہے
اپنی باتوں سی بات چاہتی ہے
وہ تو وہ، ہے اصول فطرت کا
ہر شے اثباتِ ذات چاہتی ہے
دیکھ کر مجھ سے کورے کاغذ کو
وہ قلم اور دوات چاہتی ہے
پہلی سی بات پھر نہیں ممکن
اور وہ پہلی سی بات چاہتی ہے
کون توہین چاہے گا اپنی
ہر نظر التفات چاہتی ہے
دنیا آباد ہے مرے دل میں
وہ کوئی سومنات چاہتی ہے
کاٹ لیتا ہوں جیسے ہو اکبرؔ
اور کیا مجھ سے رات چاہتی ہے

ادب کا آدمی

سید ابوالخیر کشفی کی آخری تحریر

سید ابوالخیر کشفی (کراچی)

میں اسد محمد خاں کو ادب کا آدمی کہتا ہوں۔ شاید میں اِس سے زیادہ کچھ اور نہ کہہ سکوں۔ آنے والی سطروں میں جو کچھ کہا جائے گا اُسے اسی اجمال کی تفصیل سمجھیے۔

جب اسد محمد خاں کی کتاب ''کھڑکی بھر آسمان'' میرے ہاتھ میں آئی تو مجھے نیویارک میں اپنے قیام کا تجربہ یاد آ گیا۔ میں جس سڑک پر رہتا تھا وہ خاصی پتلی تھی۔ تنگ کے لفظ سے دانستہ گریز کر رہا ہوں۔ سردیوں میں موسم کی سختی کی وجہ سے گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی اور جب دو رویہ بلند و بالا عمارتوں کے درمیان گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھا تو بے ساختہ ذہن میں ایک ہی بات آئی گلی بھر آسمان میں وہ اصل سڑک پر نہیں بلکہ گلی میں رہتا تھا۔ LANE۔ اسد محمد خاں نے اپنی کتاب کا نام کھڑکی بھر آسمان رکھ کر ہمیں یہ بتایا ہے کہ کائنات کی وسعتوں میں ہمارا وژن ہمیں بس کھڑکی بھر آسمان کی خبر دے سکتا ہے۔ لیکن ہماری زندگی کی کھڑکی سے جتنا آسمان نظر آتا ہے اس میں کیا کچھ نہیں ہے مسائل، دیوار رزق، رومانیت، ممکنات اور ناممکنات کے درمیان زندگی۔ شر اور ظلم کی کلفتیں اور ہماری ذات میں چھپا ہوا امر۔ اور ان ساری قباحتوں کے درمیان ''باسودے کی مریم'' تک رسائی۔ بیس پچیس سال گذرنے کے بعد آج تک باسودے کی مریم کی یاد سے اپنے ذہن کو نجات نہیں دلا سکا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اُس کی یاد سے اپنے خانۂ دل کو آباد رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ افسانہ بہت مختصر ہونے کے باوجود جدید افسانوی ادب میں کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی رومانیت سے میرا وجود بڑھتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے اور اس کی وسعت میں مکہ اور مدینہ دونوں سما جاتے ہیں۔ جن میں ہمارے ''حضور'' رہتے تھے۔

اسد محمد خاں کی ادبی کاوشوں میں مجھے بہت سے رنگ نظر آتے ہیں۔ اُس کی افسانہ نویسی کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ اُس کے افسانے لکھے نہیں کہے گئے ہیں۔ اسد محمد خاں ایک داستان گو ہے۔ ہمارے جدید افسانوی ادب میں مجھے تین داستان گو نظر آتے ہیں۔ وہ جن کی کہانیاں کاغذ پر نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ زندہ اور متحرک ہونٹوں سے کہی گئی ہیں۔ یہ داستان گو ہیں چوہدری محمد علی ردولوی، چوہدری ابوالفضل صدیقی، اور ''چوہدری'' اسد محمد خاں۔ اسد محمد خاں کی کہانیوں کی زبان اُن کئی صدیوں کو سمیٹ لیتی ہے جن کا اظہار صرف اردو زبان میں ہوا ہے۔ اردو زبان بھی ہے اور دکنی و تہذیبی مرقع بھی۔ اسد محمد خاں کتنے خوش نصیب ہیں کہ اس تہذیب کی مرقع کشی اُن کے حصے میں آئی ہے۔

اسد محمد خاں کی کتابوں کے ناموں سے ان کے ادبی سفر کی سمتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''برج خموشاں''، ''غصے کی نئی فصل'' اور ''ٹکڑوں میں کہی گئی کہانیاں''۔ اسد محمد خاں ادب کا ایسا بالغ بچہ ہے جو ٹکڑوں کو جوڑ کر ہماری اور آپ کی کہانی لکھ رہا ہے۔ زندگی کی کہانی جو

کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

خواب ادب کے تخلیقی امکانات کا اشارہ ہے، اصل خالقِ کائنات کا عطیہ ہے اور طرزِ بیان میں فنکار کی انفرادیت، یہی ادب ہے اور یہی زندگی۔

اسد محمد خاں نے اپنی ذات کی کھڑکی سے جو سچ دیکھا ہے اس میں برصغیر کی تہذیب کے کتنا دکھی منظر بھی ہیں، ہماری بستیاں اور بستیوں میں رہنے والے طرح طرح کے آدمی بھی ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ دور کے دیس بھی۔ شاید وہ وقت آ گیا ہے کہ نئی نسل اپنی نظر سے اسد محمد خاں کی کہانیوں میں یہ چھپی ہوئی حقیقتوں کو دیکھے۔

سوہاوہ کی کہانی

ڈاکٹر صفات احمد علوی

(برمنگھم، برطانیہ)

چند دن ہوئے میرے عزیز دوست اور مہربان خاص برمنگھم کے جناب جاوید اختر چوہدری نے مجھے اپنی نئی کتاب "سوہاوہ ـــــ میری بستی میرے لوگ" کا ایک ضخیم مسودہ دیا کہ اس کو پڑھ کر میں اس پر رائے لکھوں۔ نئے ادیب اور شاعر اس قسم کے کام عام طور سے اپنے شعبہ اختصاص کے اپنے ہم عصروں سے کروانے کی خواہش کرتے ہیں جو یا تو بین الاقوامی شہرت نہ رکھتے ہوں تو کم از کم ملک گیر شہرت کے حامل ہوں اور ایسے قد آور ہوں کہ جن کی طرف دیکھنے میں سر سے ٹوپی نہ گرے تو کم از کم سر سے سرک ضرور جائے۔

اپنا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ چند دن ہوئے میں نے اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں کے انتخاب "مخزن" میں شائع شدہ دو کہانیوں پر ایک تبصرہ لکھا۔ مسودے کی تیاری کے دوران پرانے مربی اور برطانیہ کے جانے مانے بزرگ تنقید نگار اور سابق صحافی سے گفتگو ہو رہی تھی جنھوں نے بڑے جتن کیا کہ ایسے قلم کار پر لکھ کر وقت کیوں ضائع کیا جائے جس کو کوئی نہیں جانتا۔ اگر لکھنا ہے تو میں قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے فن پر لکھوں۔ قلقے کا کچھ مزید اس وقت گہرا ہوا جب یہاں اردو کے ایک قد آور سابق صحافی اور آج کے کامیاب افسانہ نگار نے میرا نام یہاں کے کسی کہانی نگار صاحب کو تجویز کیا جو اپنی کہانیوں کے مجموعے پر کسی کو پیسے دے کر تبصرہ کروانے کے لیے ان سے مشورہ لے رہے تھے اور کہانی نگار موصوف نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اس تبصرہ نگار کو اردو کی ادبی دنیا میں جانتا ہی کون ہے۔ ایسی صورت میں بھی جاوید اختر چوہدری کا مجھ سے لکھوانے کی فرمائش کرنا یقیناً میری انا کے سکون کا باعث بنا۔

جہاں تک میں جانتا ہوں وہ یہ کہ جاوید صاحب ایک اچھے شاعر اور بہت اچھے افسانہ نگار ہیں اور اس سے قبل ان کی شعری کاوشوں کا ایک عدد مجموعہ اور افسانوں کے دو مجموعے عمدہ طباعت سے آراستہ ہو کر عوام و خاص میں مقبول ہو چکے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ اپنی کتابوں کے عنوان پر بھی بڑی محنت کرتے ہیں کیوں کہ ان کا قول ہے کہ قاری (جس میں خود بھی شامل ہیں) نام سے ہی کتاب کے کتاب کا اندازہ لگا لیتا ہے اس لیے کتاب کے نام میں کوئی انوکھا پن، نیا پن، کسی قسم کا دل آویز سجاؤ رچاؤ ہونا چاہیے۔ لیکن میرے خیال سے جب وہ یہ کہتے ہیں تو ان کا مطلب ایسی کتاب سے ہوتا ہے جو فکشن (بشمول شاعری) کے زمرے میں آتی ہے کیوں کہ فکشن بیک وقت سحر طراز چکر ویو بھی ہے اور ساتھ ہی بسا اوقات سچائی کا ایسا چکر کہ جہاں صاحب قلم اپنے قاری کو تخیل کے ایسے گھوڑے کی سواری کراتا ہے جو سرپٹ بھول بھلیوں کی لمبی پگڈنڈیوں پر دوڑتا ہے کہ وہ طالع آزمائی کرتا رہے اور منزل سامنے آنے کی خوشی آ کر امید کی کیفیت اس میں برقرار رہے پر وہ منزل کبھی نہ آئے (!) پھر غیر فکشن میں کیا مہیا ہو جو قاری کی طبیعت کو اپنی طرف کچھ اس طرح مائل کرے کہ وہ اس کتاب، اس مضمون اور اس تحریر کو پڑھنے کے لیے بےتاب ہو جائے۔ تاہم غیر فکشن کے سلسلے میں یہ بات اکثر سامنے آئے گی کہ تحریر کردہ مضمون یا کتاب قاری کے شعبہ اختصاص سے متعلق ہے کہ نہیں پھر بھی دنیا میں چند مضامین ایسے ہیں جن میں دلچسپی عمومیت لیے ہوئے ہوتی ہے اور ایسے مضامین پر کتاب یا تحریر عوام پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ "سوہاوہ ـــــ میری بستی میرے لوگ" کیا ایسی کتاب ہے؟

"سوہاوہ ـــــ میری بستی میرے لوگ" نام کی کوئی خصوصیت ایسی ہے جس کی وجہ سے اردو پڑھنے والے عام شخص کو اس میں دلچسپی ہو کہ وہ بے ساختہ اس کتاب کو اٹھالے اور پڑھنا شروع کر دے۔ "سوہاوہ" شمالی پاکستان کے دور دراز علاقے میں ایک بستی کا نام ہے۔ ایسا نام جو پاکستان کے اسکولوں اور کالجوں میں استعمال ہونے والے اٹلسوں میں بھی مشکل سے ملے تو پھر کسی بین الاقوامی سطح کے اٹلس میں تو اس کا جائے وقوع دکھائے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے تاریخ اردو ادب میں کسی مرحوم شاعر یا ادیب کے نام کے ساتھ "سوہاوی" کا لاحقہ بھی لگا ہوا نہیں ملتا اور نہ ہی کسی سائنس داں، تاریخ داں یا اور کسی اور علم و فن "داں" کے نام میں یہ لاحقہ موجود ہے نہ کسی موجد کے نام کے ساتھ اور نہ ہی ابھی تک کسی صوفی سنت کی اس علاقے سے کوئی نسبت بر سر عام آئی تو پھر عزیزی جاوید اختر چوہدری نے یہ سب زحمت کیوں اٹھائی اور ایسا نام اپنی کتاب کے عنوان کے لیے کیوں چنا؟

ایک زمانے میں غیر منقسم ہندوستان میں لوگ یا کہ سیاسی رہنماؤں کی زبان سے یا اخبار میں اور بچے اپنی درسی کتابوں میں ہندوستان نام پڑھتے تھے لیکن اکثر کے ذہنوں میں ہندوستان کوئی ایسی تجالسی تہذیبی اکائی نہ تھی جس سے وہ اپنے آپ کو ہندوستانی کہہ کر اس طرح فخر محسوس کرتے جیسا کہ علاقے کی نسبت سے بنگال کے عوام اپنے آپ کو بنگالی اور پنجاب کے لوگ اپنے آپ کو پنجابی کہلوانے میں یا بعض شہروں کے رہنے والے مثلاً دہلی والے

اپنے آپ کو دہلوی یا لکھنوی والے اپنے آپ کو لکھنوی کہلا کر فخر محسوس کرتے تھے۔ تاہم جب وہاں کے نوجوان طلبا اپنی تعلیمی کاوشوں کے لئے سات سمندر پار آئے تو انھوں نے یہاں اپنی پہچان لفظ ''ہندوستانی'' استعمال کر کے قائم کی۔

تقسیم ہند کے بعد کے غیر یقینی حالات نے روزگار کی تلاش اور بہتر محفوظ و مامون زندگی کے سوچ کی جستجو نے وہاں کے عوام میں عارضی یا مستقل ترکِ وطن کرنے کی سوچ کو راہ دی۔ ادھر جنگ عظیم دوم کے اختتام پر یورپ کی صنعتی پیداوار کے علاقے میں بوجہ مقامی مزدور کی نایابی غیر ملکی مزدور کی درآمد کو ناگزیر کر دیا تھا۔ چنانچہ تیسری دنیا کے نوجوانوں کی کھیپوں کی کھیپ برطانیہ اور دیگر مغربی یورپ کے ملکوں میں عازم ہو گئی اور برصغیر ہند سے بڑی تعداد میں ہندوستانی اور پاکستانی (بشمول آج کے بنگلہ دیشی) مزدور درآمد ہوئے۔

عام طور پر عوام اپنی پہچان موقع و محل کی مناسبت سے کرواتے ہیں۔ چھوٹے گاؤں میں لوگ اپنی پہچان کسی اکائی کی متجانس اکائی مثلاً اپنے گھرانے، خانوادے کے توسط سے کرواتے ہیں قصبے میں اپنی پہچان محلے کی نسبت سے اور محلے میں گھرانے کی نسبت سے۔ اگر وہ شہر میں ہوں تو اول پہچان گاؤں یا قصبے کے تعلق سے کی اور کروائی جاتی ہے اور جب ضلع کے صدر مقام پر ہوں تو شہر کے تعلق سے وہ جانے جاتے ہیں۔ اس طرح پہچان کرانے کے واسطے ایک تدریجی نظام مراتب ہے اپنی اور اپنے خاندان کے لیے روزی روٹی کے سلسلے میں جوان اپنے ہی ملک کے دور دراز علاقوں میں جاتے ضرور ہیں لیکن وہ شہر، قصبہ، قریہ یا گاؤں جو اکثر و بیشتر ان کی جنم بھومی ہوتی ہے اور جہاں انہوں نے اور ان کے پرکھوں نے اپنا سہانا بچپن بھی گزارا ہوتا ہے جہاں ان کی اور ان کی پیڑھیوں کی نالیں ان کی دائیوں نے گاڑی ہوتی ہیں، جہاں کے کھیتوں میں ان کے بزرگوں کی استھیاں بکھرائی گئی ہوتی ہیں عام طور سے اس جگہ سے ایک خاص انس رکھتے ہیں جسے زبان عام میں ''وطن سے محبت'' کہتے ہیں۔ لیکن سات سمندر پار کرنے کے بعد آبائی وطن، گاؤں، قریہ، قصبہ یا شہر کے بجائے وہ پورا ملک پہچان کا وسیلہ ٹھہر جاتا ہے جہاں سے یہ سفر کر کے آتے ہیں اور ان کی اس چھوٹے سے قطعۂ ارض سے جسے عرف عام میں ''وطن'' کہتے ہیں وہ محبت اب ''آبائی ملک سے محبت'' اور نتیجہ میں ''قومی محبت'' کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

پچھلے برس دہلی یاترا کے دوران ایک بزرگ دانشور سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے برملا اور برمحفل میں میرے آبائی گاؤں کے حوالے سے یہ بات کہی کہ اس گاؤں سے جو بھی تلاش معاش میں اور بہتر زندگی کی جستجو میں نکلا اس نے صرف اپنی ذات کے لیے سب کچھ کیا لیکن لوٹ کر کبھی واپس گاؤں آیا اور نہ ہی گاؤں کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کیا۔ اور نتیجہ میں وہ گاؤں جو کبھی روحانی فیض کا مرکز اور مرجع خلائق تھا، جہاں غریب کے دسترخوان سے بھی ایک دو سال یا سفر پیر ختم ہو کر آتے تھے اب وہاں کے حالات اس قدر ابتر ہو گئے ہیں کہ لوگ اپنی گزر اوقات کے لئے اپنے علم و ہنر کے باوجود کم تر درجے کے کام کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اور یہ بات ایک دو دن میں نہیں ہوئی بلکہ مسلسل تین صدی کے تدریجی تنزل سے پیش آئی ہے گو یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ وہاں کے مکینوں نے اٹھارہ سو ستاون اور اس سے قبل بھی آزادی ہند کے لیے دامے درمے قدمے جو کوششیں کی تھیں اس کے نتیجے میں سابق غیر ملکی سامراج نے گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ لیکن دانشور مذکور کی بات کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان حالات میں تو وطن اور اہلیانِ وطن سے محبت اس بات کی شدت سے طالب تھی کہ وہ لوگ جو تلاش روزگار میں گاؤں سے باہر نکلے اور وہاں سے باہر نکل کر جن کے دن پھر گئے انہیں تو بالخصوص گاؤں کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیے تھا۔ میں سمجھتا ہوں اس لحاظ سے یورپ میں پنجاب سے آئے ہوئے نووطنی قابل قدر ہیں کہ انہوں نے ہزاروں میل دور رہ کر بھی اپنے آبائی قریوں اور عزیزوں کو نہیں بھلایا۔ جو باتیں ان کی زبانی سنتا ہوں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے گاؤں میں ان کی کوششوں سے اس قدر ترقی ہوئی ہے کہ بعض جگہوں پر زندگی کرنے کی وہ سب آسائشیں مہیا ہو گئی ہیں جو آج کے ترقی یافتہ یورپ کے کسی قریے میں میسر ہیں اور ان کے عزیز و اقارب کی معاشی آسودگی، جو تقسیم ہند سے پہلے کسی بنیے کے پاس گروی رہتی تھی وہ اب بحال ہو گئی ہے کیا ''سوہاوہ ـــــ میری بستی میرے لوگ'' ان سلسلوں کی کوئی کوشش ہے؟

میرے نزدیک ''سوہاوہ ـــــ میری بستی میرے لوگ'' اس لحاظ سے ایک بڑی کامیاب کوشش ہے جس میں برصغیر ہند سے آئے ہوئے نوآباد کاروں کے ان جذبات کی نشان دہی موجود ہے جو وہ اپنے آبائی ملک میں اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے عزیز و اقارب، دوست اور جاننے والوں سے انس اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی سہانی یادوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں درحقیقت اکثر مواقع پر جذبات کی شدت اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ مؤلف کا قلم ان سے مغلوب ہوتا نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خیالات کی آمد کچھ اس طرح جھکڑ کا سے ہوئے ہے کہ لکھنے والے کو مناسب الفاظ کی تلاش میں دقت بسیار کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

عزیزی جاوید اختر چودھری نے بتایا ہے کہ اس کتاب کو لکھنے کا خیال انھیں سب سے پہلے اس وقت آیا جب سوہاوہ اور اس کے گردونواح کے چند دوستوں نے ان سے ایک ایسی کتاب کی تدوین کی فرمائش کی جس میں سوہاوہ اور اس کے متعلق قدیم اور آج کے باشندوں کے حالات ہوں۔ ان فرمائش کرنے والوں میں سے اکثر نے کتاب کے سلسلے میں مواد فراہم کرنے اور متعلقہ چھان بین کرنے میں اعانت کا وعدہ بھی کیا لیکن جب وقت آیا تو یہ لوگ اپنی

کاروباری مصروفیات کی وجہ سے تنگیٔ وقت کا شکار ہو گئے اور مکمل تعاون نہ دے سکے۔ تاہم ایسے لوگوں کو کسی خلجان میں مبتلا ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ جب ان کے پاس وقت ہو گا تو مجھے یقین ہے کہ جتنی حیات عزیز جاوید اختر چوہدری صاحب ان کے بزرگوں کے حالات مدوّن کرنے میں اپنا پورا پورا وقت دینے میں کوتاہی نہ کریں گے۔ کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں کتاب کی وجہ تصنیف اور مصنف کا طریقۂ کار کے بیان کے بعد "گورو چھیاں" کے چوہدری علی محمد کے نہایت مختصر حالاتِ زندگی سے شروع ہو کر ان کے بیٹے چوہدری شیر باز کا آبائی گھر چھوڑ کر "پیر زندہ" کے قریب میں اپنی بیوی اور اپنے تھے بیٹے امام دین کے ساتھ قیام پذیر ہوا اور پھر امام دین کا بڑے ہو کر ریلوے لائن پر کام کرنا اور بعد میں امام دین کی پس انداز کی ہوئی رقم سے سوہاوہ میں شیر باز کا زمین خرید کر مستقل اس کو اپنا وطنِ مالوف بنالینا بڑے دلچسپ اور کہانی نما انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر ایک نئے عنوان کو قائم کر کے سوہاوہ کا مختصر جغرافیہ بیان کیا گیا ہے۔ اور آخر میں نئے عنوان "لوگوں کا ذریعہ معاش، مشاغل روزگار" کے تحت وہاں کے عام مکینوں کے مشاغل روزگار کے ساتھ ساتھ چوہدری امام دین کی، مصنف کے دادا تھے، معاشی میدان میں مہم جوئی کا تفصیلی بیان ہے۔ دوسرے باب میں سوہاوہ کے تالاب، وہاں کی مساجد و مدارس، ڈسپنسری اور قلعہ روہتاس کی تاریخ، جرنیلی سڑک (گرینڈ ٹرنک روڈ) کے سلسلے میں چند مشاہدات دلکش انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ مصنف نے اس میں چند تاریخی واقعات پر سوال اٹھائے ہیں اور ان کے جواب دینے کی منطقی کوشش کی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مؤرخ دانوں کا ہے کہ وہ ان کے جوابات کو کس روشنی میں اور کس طرح پرکھیں گے۔ اسی باب میں ان کے دادا کے احباب اور سوہاوہ اسکول کے اساتذہ کرام کا تذکرہ بھی شامل ہے اور آخر میں لڑکپن کے دوست، ان کی کھٹی میٹھی یادیں اور پھر سوہاوہ کے سیاسی اور غیر سیاسی بااثر شخصیات کا تذکرہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

تیسرا باب اس اعتبار سے معلوماتی اور دلچسپ ہے کہ اس میں اردو ادب کے پاکستانی نابغۂ روزگار رفیق سے ملاقاتوں کا حال شامل ہے۔ یہاں ان دانشوروں کے علمی تبحر کے بیان کے ساتھ ساتھ ان خیال، ان کے آپس کی چشمکوں کا بھی کہیں کہیں چھینٹا ملتا ہے جن کو پڑھتے ہوئے قاری کو لوزنہ وہیر میں آمیا ائی کے پنے کی حلاوت منہ میں گھلتی محسوس ہوگی۔ اس کے علاوہ جہلم میں سلطان شہاب الدین غوری کے مزار کی زیارت کا بیان اور سلطان کے قاتلوں کے بارے میں جو کہانی عام طور سے مشہور ہے اس پر تاریخ کی روشنی میں ایک مختصر بحث ہے۔

چوتھا باب میں سوہاوہ کی ان شخصیتوں کا ذکر ہے جو وہاں کی زندگی میں کسی نہ کسی وجہ سے ایک سنگِ میل رہی تھیں۔ یہاں مصنف نے سنگِ میل شخصیت ہونے کے لیے جو کوئی پیمانہ عام طور سے تصور کیا جاتا ہے اس سے ہٹ کر شخصیتوں کو چنا ہے۔ چنانچہ ان میں بابا شرف الدین ہیں جو سو برس سے زائد عمر کے ہیں جن کی زندگی میں وقت ٹھہر سا گیا ہے لیکن مصنف کے والد کے پاس ہر روز صرف وقت دریافت کرنے لاٹھی ٹیکتے ہوئے اور اپنے بوڑھے لاغر جسم کو کھینچ کر بڑی ناتوانگی سے لاتے ہیں۔ اس باب میں آخری عنوان "چار نسلوں کا" ہے جہاں چار نسلوں نے جو شیر باز سے شروع ہو کر مصنف کے والد ماجد محترم چوہدری محمد یوسف کی وفات پر اپنی حیات کی داستان پوری کر گئیں اور اب ان کے لواحقین میں ایک سوہاوہ میں رہ گیا اور باقی تتر بتر ہو کر دنیا جہان میں اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

پانچواں باب اصل میں کتاب کا ضمیمہ ہے جس میں اس سوالنامے کی نقل ہے جو مصنف نے اپنے احباب کو پُر کرنے کے لئے بھیجے تھے ساتھ ہی ان خطوط کی نقول شامل ہیں جو اس نے ان احباب کو لکھے تھے جن کے جوابات آنے پر وہ سوہاوہ کی شخصیات کا وسیع و جامع تذکرہ لکھتا۔ اس میں سوہاوہ کے بازو میں دکانداروں، آڑھتیوں وغیرہ کے ناموں کی فہرست شامل ہے جو سوہاوہ کی اقتصادیات کے اہم رکن ہیں۔

اس تقاریظ میں راقم الحروف نے یہاں وہاں چند سوال اٹھائے ہیں۔ اور اس کے نزدیک ان سب کے جواب کتاب بڑا مثبت طور پر ملتے ہیں۔ عزیز مجاوید اختر چوہدری اس سلسلے میں قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ایک ایسا تذکرہ لکھا ہے جس سے پاکستان کے دیہی علاقوں سے آئی ہوئی اوّل نسل کے افراد (اس میں بزرگ شامل ہیں جو یہاں پیدا ہونے والی دوسری نسل کے والدین، دادا دادی، نانا نانی ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ وہ جوان بھی شامل ہیں جو آج کل بحیثیت مہاجر اس ملک میں آ کر آباد ہو رہے ہیں) جب کہ یہاں کی موجودہ سیاسی فضا میں دوسری نسل کے تعلیمیں سے ان کی آبائی قدروں کا سودا کچھ اس طرح کیا جا رہا ہے کہ نئی پود اپنے والدین کے سابق وطن سے محبت اور وہاں پر بسے ہوئے عزیزوں کی مالی مدد پر سوال اٹھا رہی ہے، اپنے گلے پر ایک گونہ طمانیت محسوس کریں گے۔ ان کی نئی نسل اس بات کی قدر کر سکے گی کہ جب کسی نئی جگہ پر آ کر آباد ہونے والا کوئی نو وارد اپنی مادرِ وطن کو یاد کرتا ہے، اس سے محبت کا اظہار کرتا ہے اور اس زمین، اس ملک کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کرتا ہے اور اپنی آبائی علاقائی قدروں کا واویلا کرتا ہے تو یہ سب اس کی مجبوری ہے کیونکہ وہ جگہ اس کا روحانی راس المال، اس کے جذبات کا مخرج ہے، اس کی ذات کا ایک اٹوٹ حصہ ہے جس کے بغیر اس کی شخصیت اور اس کا کردار نامکمل ہے۔

مجھے امیدِ واثق ہے کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور عزیز جاوید اختر چوہدری کی کاوش کو خاص و عام سراہیں گے۔

☆

شاعر کا جہاں اور ہے

غلام حسین ساجد (لاہور)

اردو شاعری سے اپنی چالیس سالہ رفاقت کے بعد یہ بات مجھ پر اب جا کر کھلی ہے کہ شاعری کی پسند یا ناپسند کے سلسلے میں، میں ایک خاص طرح کی کنڈیشننگ (Conditioning) کا شکار ہوں اور مجھے وہی شعر اور شاعر اچھے لگتے ہیں جو میری اپنی فریکوئنسی سے قریب ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے کہ ایسے شاعروں کی تفہیم اور تحسین کے لیے جس نوع کی مہارت یا ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے وہ میں نے اپنی چالیس سالہ شعری تپسیا میں حاصل کر لی ہے اور مجھے اپنے مزاج سے قریب تر شاعری کو سمجھنے اور اس سے حظ اٹھانے کے لیے کسی طرح کی مشقت کھینچنا پڑتی ہے نہ ہی کسی نوع کی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر یہ امر اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اس کنڈیشننگ کے باعث میں اپنے عہد کے بہت سارے شاعروں سے دور ہو گیا ہوں اور اپنے عہد کی شاعری کے ایک بڑے حصے کی تفہیم اور تحسین کرنے سے قاصر ہوں۔ حالاں کہ شاعری کو اپنا نصب العین حیات بنا لینے کے بعد مجھے اس طرح کے تعصب اور تحدید سے بچنا چاہیے تھا اور شاعری کے ہر رنگ اور ہر ذائقے سے لطف اندوز ہوتا ہوا اردو شاعری کی بحیثیت ایک وجود کے تحسین کرنے کے قابل رہنا چاہیے تھا۔

مجھ میں میری اس کمی کے احساس کو پیدا کرنے کا سبب رب نواز مائل صاحب کا شعری مجموعہ "پتھر کی ملکی آنکھ" بنا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اس مجموعے کا مطالعہ نہ کر پاتا اگر یہ رب نواز مائل کی تخلیق نہ ہوتا اور وہ اپنی دلربا سرزنش اور بے پایاں اصرار سے مجھے اسے پڑھنے پر آمادہ نہ کرتے۔ اُن سے پرانا تعلقِ خاطر اور دیرینہ نسبت ہونے کے باعث، میں نے اس مجموعے کو ایک بوجھل کام سمجھ کر ایک ناپسندیدہ فرض ادا کرنے کی طرح پڑھا اور اس کے مطالعے کے دوران مجھے قدم قدم پر یوں لگا کہ ایک ایک شعر کی ترسیل کے مابین یہ احساس دامن گیر رہا کہ اس شاعری اور میری پسندیدہ شاعری یا میری اپنی شاعری کی فریکوئنسی نہ صرف یہ کہ مختلف ہے بلکہ شاید دو الگ الگ سیاروں پر زیست کرنے اور دو الگ الگ دنیاؤں میں بسر کرنے کے تجربے کی طرح ہے۔ مجھے ان کے اور اپنے بیچ کوئی قدرِ مشترک دکھائی نہیں دی (سوائے اس کے کہ میں بھی ایک غزل گو ہوں اور اُن کا شعری مجموعہ بھی صنفِ غزل ہی سے متعلق ہے)۔ مصرع بنانے، لفظیات منتخب کرنے، استعارے وضع کرنے اور علامت تخلیق کرنے غرض تخلیقِ شعر میں اشتراک کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں ہم دونوں اُن میں سے کسی ایک میں بھی ایک جیسے نہیں۔ اُن کی دنیا الگ ہے میری الگ۔ اُن کا وضعِ شعر کا طریقہ کچھ اور ہے میرا کچھ اور۔ ان کے مضامینِ شعر اور فکری اشارے اور ہیں میرے کچھ اور۔ پھر بھی میں اس کتاب کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا کہ میرے پاس اس کتاب کو رد کر دینے یا اسے ناپسند کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جیسے کسی اور رنگ و نسل کے آدمی اور کسی اور مذہب کے ماننے والے پر مجھے صرف اس لیے فوقیت نہیں دی جا سکتی کہ میں اپنے مذہب اور اپنے رنگ و نسل کی محبت میں اُس کے مقابلے میں زیادہ پختہ ہوں۔

خیر میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ "پتھر کی ملکی آنکھ" ایک مقبولِ عام صنفِ شاعری کا مجموعہ ہونے کے باوجود ایک مختلف کتاب ہے۔ اس فرق کی بڑی وجہ شاعر کے شعر کہنے کا ڈھنگ یعنی اسلوبِ سخن ہے جو میری تمام تر کوشش کے باوجود اس حد تک میری گرفت میں نہیں آ سکا کہ میں اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دے سکوں۔ مگر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ رب نواز مائل کے اسلوبِ شعر پر اُس لینڈ اسکیپ کے اثرات واضح ہیں جو اُس کے اندر اور اُس کے باہر پھیلا ہوا ہے۔ بلوچستان جو "پھولوں کا باغ" ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کی سنگینی اور وحشت کا تاثر بھی پیدا کرتا ہے اس کتاب کے وجود میں اپنی تمام تر علامتوں اور استعاروں کے ساتھ پھیلا ہوا ہے حتیٰ کہ اس کتاب کی بعض مصرع ساخت کرنے کی وضع، شاعر کے فن اور دو مصرعوں کے مابین موجود خلا کو پُر کرنے یا موجود رہنے دینے کی ادا بھی پر اس خطے کی معاشرت اور تاریخ کے اثرات موجود دکھائی دیتے ہیں جو اپنی جگہ قابلِ تحسین بھی ہے اور لائقِ حیرت بھی۔ لائقِ حیرت اس لیے کہ عام طور پر غزل گو حضرات اس طرح کی حد بندیوں سے ماورا ہوتے ہیں اور غزل پڑھتے ہوئے بہت کم اس بات کا احساس ہو پاتا ہے کہ شاعر کا تعلق کس تہذیب یا سرزمین سے ہے۔ اردو غزل عمومی طور پر تہذیبی اور جغرافیائی لینڈ اسکیپ سے خالی ہے اور غزل میں اس نوع کی انفرادیت کا سراغ کم کم ہی ملتا ہے۔

اردو غزل کے سفر میں تہذیبی لینڈ اسکیپ کی موجودگی کی سب سے عمدہ مثال ولی دکنی ہیں اور یہی تہذیبی وسعت اور رنگینی پھیلاؤ کہیں اب جا کر مجھے رب نواز مائل کی اس کتاب "پتھر کی ملکی آنکھ" میں دکھائی دیا ہے۔ یہ بات میرے لیے خوشی بھی ہے اور دکھ بھی۔ کیوں کہ میں اب تک اس بات کا ادراک نہیں رکھتا تھا کہ مٹی، علاقہ یا تہذیبی خطہ کسی شاعری پر اس شدت کے ساتھ بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کے نام سے اس کتاب کے باطنی اسرار تک یہ تہذیبی علاقہ صورت پھیلا دکھائی دیتا ہے جو اس کتاب کو غزل کی دوسری کتابوں سے الگ کر کے ایک نئی جہت میں سفر آغاز ہونے کی نوید دیتا ہے اور ہمیں اس اجتہاد پر رب نواز مائل کی تحسین کرنی ہی چاہیے۔

رب نواز مائل کا یہ شعری مجموعہ اسلوبِ شعر اور اصولِ شعری کے لحاظ سے تو مختلف ہے مگر مضامینِ شعری کے لحاظ سے اردو غزل کے عمومی رویے اور فن کے قریب تر ہے۔ زندگی اور زندگی سے جڑے معاملات، حسن و عشق کی

گمانیں، موجود اور غیر موجود کی تفہیم اور وجود اور عدم موجود کی بحث سے نمو پاتے مضامین تصوف کی موجودگی، اس کتاب کو اردو غزل کی عمومی روایت سے کس طرح ممیز بنا رکھتی ہے، چند شعر دیکھیے:

رونے گزری کہ خوشی سے جیے ہم
بس یہاں سے تو اب پھر چلے ہم

بہت ہی آپ سے بیزار تھے جب
ہماری سمت وہ خوشبو بڑھی کیوں

یہ کیسا کال ہے کس درد خوشی کا
جو طالب کم ہوئے اُس وصل کے

نظر کی چمک ہے کہ جنت ہی لگی
جو ہر شے ستارہ نما دیے سے ہے

میں تجھ ذات سا یوں بھی بہت ہوں
سمندر کیا کناروں سے ملے گا!

اور اب دیکھیے کچھ اور اشعار غزل کے ایک منفرد لہجے کی سیر کرنے کی خاطر:

ہرنوں کی ڈار بھی تو بلکتی ہوئی چلی!
جنگل کی زندگی بھی وہاں کس کو راس تھی

ویرانہ حال ہے اور شب زدہ بھی ہے
خس و قمر کی چوب نہ ہو تو جلائیں کیا

پتھر سے تراشی تھی مگر جاگ اٹھی ہے
اک سانولی لڑکی مرے خوابوں میں بسی ہے
یہ لب پیاس اپنی جو خاموش سی ہے
کہیں پاس ہی ہر کوئی اٹھا ہے

جسے خالی اجل بھی کر سکے کیا!
خیالِ یار کا ہوں وہ مکاں میں

مختصر یہ کہ "پتھر کی مٹی آنکھ" اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اردو غزل کے قاری کو بھی کسی نوع کی کنزرفنگ کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور ان تمام رنگوں اور خوابوں سے وابستہ رہنا چاہیے جو صنفِ غزل کو بادو تار اور شعر و بنانے میں شریک ہیں اور جنہیں اب نوازنا کل "غزل جیسی کا فرصتِ سخن" کو ہوستانہ رنگ دینے کی سعی کر رہے ہیں۔

☆

☆

- بقیہ دیس پردیس -

تھے ـــــ انہوں نے مجھے اکیلا دیکھ کر مجھ پر چند جملے کسے ـــــ لیکن میں نے کوئی نوٹس نہ لیا اور سیدھا اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ مگر وہ باز نہ آئے گالی گلوچ پر اتر آئے۔"

"کیا کہا تھا انہوں نے؟"

"پاکی ـ بلیک ـ باسٹرڈ ـ ڈرٹی فیلو ـ فلتھ ـــــ تمہارے دن پورے ہو گئے ہیں۔ چلے جاؤ یہاں سے ـــــ ورنہ ہم تم کو بھیج دیں گے۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا ـــــ میں ان کو نظر انداز کر کے تیزی سے اپنی کار میں جا بیٹھا اور کار اسٹارٹ کی۔ مگر انہوں نے مجھے کار میں سے باہر کھینچ لیا اور وہ تینوں مجھ پر ٹوٹ پڑے ـــــ اپنے بچاؤ کی خاطر میں نے بھی ہاتھ پاؤں چلائے۔ مگر انہوں نے مجھے خوب پیٹا، خوب مارا۔ باقی لوگوں نے میری کار کا ستیاناس کر ڈالا۔" میں حادثے کی نوعیت کے متعلق سوچتا رہا سوچتا رہا۔ ہکا بکا رہ گیا تھا:

"جو بھی ہوا، بہت برا ہوا" میں نے دھیرے سے کہا۔ "مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے ـــــ مگر ایک بات پوچھوں جواب دو گے؟" اس نے ہاں میں گردن ہلا دی۔

"مگر جانی! تم کو کیوں مارا پیٹا انہوں نے؟ ـــــ تم تو برٹش شہری ہو! تمہارے پاس برٹش پاسپورٹ ہے؟ اور یہ دیش تمہارا ہے؟"

اس کے لب کچھ کہنے کو اوپر نیچے ہوئے۔ مگر وہ اس حالت میں نہ تھے کہ جانی کے الفاظ، خیال اور آواز کا ساتھ دے پاتے؟ پچھتاوے کا احساس اس کے وجود پر پھیل گیا تھا۔ وہ بے یار و مددگار دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اُس کے شانے پر رکھ دیا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو میں نے اپنائیت سے کہا:

"کیوں بھولتے ہو ـــــ تمہاری شکل پر اپنے چھوڑے ہوئے دیش کا لکھا ہے جو آخری دم تک لکھا رہے گا ـــــ تم اس سے بھاگ نہیں سکتے؟"

اس کی گردن جھک کر رہ گئی تھی۔

☆

بادلوں کی اوٹ سے

ڈاکٹر طیب منیر (راولپنڈی)

سید ضمیر جعفری
۳۱۔ڈی سیٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی
۲۳مئی ۱۹۹۷ء

ماشو پیارے (۱) اسلام و رحمت!
پچھلے دنوں آپ کا ایک کالم پڑھا تو اس پر انگریزی کے کالم کا گمان ہوا۔ یہ وہی کالم ہے جس میں آپ نے بریگیڈیئر گلزار احمد صاحب کی کمان میں چند قومی اہل قلم (بریگیڈیئر صدیق الرحمن، کرنل محمد خان، میجر صدیق سالک اور راقم الحروف) کو ''فٹ'' کر رکھا ہے۔
اس کالم سے معلوم ہوا کہ منظر گزشتہ کی محترمہ شاہین سیما صاحبہ کو بریگیڈیئر گلزار کی تصانیف کی فہرست درکار ہے۔ محترمہ نے تو یہ سوال آپ سے پوچھا تھا مگر آپ نے یہ سوال بجا طور پر میری طرف لڑھکا دیا ہے کہ میں آپ کی کرنلی کے زمانے میں آپ کا ایڈجوٹنٹ رہ چکا ہوں۔ بلکہ اس ضمن میں میری کچھ ''دو آتشہ'' کی کیفیت ہے کہ میں بریگیڈیئر گلزار صاحب کا بھی ایڈجوٹنٹ رہ چکا ہوں۔ کمانڈنگ افسر (CO)، ایڈجوٹنٹ (Adjutant) کا رشتہ کچھ ایسا ''سیسہ پلا'' ہوا اور پروف رشتہ ہے کہ سرد و گرم زمانہ اس پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا۔ یہ دونوں جہاں بھی ملیں، جب بھی ملیں، کمانڈنگ افسر بیڈ گھماتا ہوا آگے آگے ہوتا ہے اور ایڈجوٹنٹ چپل کا پاپ سنبھالے پیچھے پیچھے۔
آپ کو معلوم ہے بریگیڈیئر صاحب کی تصانیف ماشاء اللہ حسنِ نیاز حساب کتاب کی RANGE سے کہیں آگے نکل چکی ہیں۔ استفسار کے لیے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ اپنی انیکسی کے پورچ میں بیٹھے کسی نئی تصنیف پر کام کر رہے تھے۔ پچھلی مرتبہ جب آپ ان سے ملے تھے تو بڑی کوٹھی میں وہ خود رہتے تھے اور انیکسی میں کتب خانہ رکھتے تھے۔ آج کل بڑی کوٹھی میں کتب خانہ رکھتے ہیں اور انیکسی میں رہائش۔ کتابیں جمع کرنے کی یہی رفتار رہی تو ایک روز سڑک پر ہوں گے۔ سنگاپور کے چینی چھاپہ خانے ''کون وانگ'' کا چینی سپنٹر تو آپ کو یاد ہوگا جو اپنے چودہ پندرہ بچوں کو ناموں سے نہیں رول نمبروں سے بلایا کرتا تھا۔ کچھ یہی کیفیت ان کی کتابوں کے بارے میں ہے۔ میں نے کتابوں کے نام پوچھے تو اپنی پہاڑی کی کتاب ''جلوہ طور'' (افسانوں کا مجموعہ) کا نام لینے کے بعد سوچ کے گہرے غوطے میں اتر گئے جیسے دوسری جنگ عظیم کے گرد و دھوئیں میں سے کسی گورے سارجنٹ میجر کا نام ڈھونڈ رہے ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ خالص تلوار کے زمانے میں بھی بریگیڈیئر صاحب نے قلم کو جیتے سے لگائے رکھا لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد تو گویا قلم و قرطاس کے لیے وقف ہو گئے ہیں۔
ایک کتاب ذہن میں ہے دوسری کاغذ پر اتر رہی ہے تیسری زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر دولت خانے کو کتب خانے میں منقلب کر رہی ہے لطف یہ کہ ایک سے ایک تصنیف وقیع ہے مختصر جس پر تحقیق و تدقیق و فن کی کرتی ہے۔

ادبی سفر کی ابتداء انہوں نے افسانوں سے کی تھی مگر چونکہ عسکری کے سپاہی تھے اس لیے جلد ہی سنگلاخ حقیقتوں کی طرف نکل گئے۔ موضوعات کا قحط ان کو کبھی محسوس نہیں ہوا کیوں کہ ایک تو بفضلہ انہوں نے ذہن بڑا زرخیز پایا ہے دوسرے منصوبہ بندی کے عمل سے موضوعات کو انہوں نے چند محاذوں میں تقسیم کر رکھا ہے جن پر پیش قدمی جاری رکھتے ہیں ایک محاذ تذکروں کا ہے۔
''تذکرۂ افغانستان''، ''تذکرۂ ایام''، ''تذکرۂ فرشتہ''، آج کل تذکرۂ احباب لکھ رہے ہیں۔ ایک دفعہ تذکرۂ ملایا لکھنے کا قصد کیا تو میں نے قلم پکڑ لیا کہ جناب کوئی قطعۂ زمین ہمارے لیے بھی تو رہنے دیجئے۔
ایک محاذ تاریخ کی طرف کھلتا ہے پھر بذاتِ خود جنگ کا اپنا محاذ ہے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ پر اردو میں لازوال داستان اور انگریزی میں PAKISTAN MEETS INDIAN CHALLENGE ان کی معرکۃ آراء کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ''عسکری قیادت''، ''جنگ میکاولی سے ہٹلر تک'' اور حال میں ''جہاد'' اس موضوع پر ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ امیر تیمور پر ہیرالڈ لیمب کی شہرہ آفاق کتاب کو اردو میں منتقل کر چکے ہیں۔ ترکی کے بارے میں ان کی مبسوط انگریزی کی کتاب REBIRTH OF A NATION بیک وقت ترکی کی تمدنی اور آئینی تاریخ بھی ہے اور ترک جیالوں کی تاریخ جنگ بھی بہت سے مسودات وردی پیٹی میں ملبوس یعنی مکمل صورت میں الماریوں میں بند رکھے ہیں۔ پچھلے چند برسوں سے ''غزوات رسول'' پر کام کر رہے ہیں۔ یہ سوا برس اردو مجاز میں رو آئے ہیں۔ انگریزی کے تین مجلدات اس وقت تک مرتب ہو چکے ہیں۔ نام ہے
" THE BATTLES OF THE
PROPHET OF ALLAH "
ساتھ ساتھ حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت پاک پر بھی کام کر رہے ہیں۔ جس کو وہ اپنی علمی زندگی کا آخری اور سب سے اہم ایشان کا نامہ بنانے کے آرزومند ہیں۔ اور علمی سفر کا اس سے بہتر توشہ اور بھی کیا سکتا ہے۔

☆

حاشیے

(۱) سید ضمیر جعفری کرنل مسعود احمد کو ناشو کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ کرنل مسعود احمد ۱۹۱۲ء میں کولہا نر (حافظ آباد) میں پیدا ہوئے ۱۹۴۲ء میں ڈائریکٹر انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ''قلم اور کوڑے'' اخباری کالموں کا مجموعہ شائع ہوا ۱۹۹۸ء سے "ROVING EYE" کے عنوان سے مسلم میں کالم لکھتے رہے۔ سنگاپور میں چراغ حسن حسرت کے ساتھ جوان کی ادارت میں شامل رہے ۱۹۹۸ء میں اسلام آباد میں وفات پائی۔ راقم کرنل صاحب سے کئی بار ملا اور ان سے سنگاپور کے حسین و قدیم قصے بھی سنے جن میں چراغ حسن حسرت اور ضمیر جعفری مرحوم کی محفلوں کو زندہ کیا گیا تھا۔ موصوف زندگی کے آخری ایام تک بھی بڑے زندہ دل اور خوش طبع رہے۔

گوش بر آواز

ڈاکٹر شباب للت (نوشہرہ بھارت)

پہلے اُس کا غم تھا جو مجھ کو نہ حاصل ہو سکا
اب ہے رنج اُسکا جو پایا اور میں نے کھو دیا

کیوں گراوٹ کے عمل سے کوئی اسکو روکتا
تھے تماشائی زوالِ آدمی کے دیوتا

جب کہا تھا تُو نے مجھ سے اپنے دل کا ماجرا
تب پسِ دیوار کوئی گوش بر آواز تھا

''تُو نہ پائے گا اُسے'' جس دن نجومی نے کہا
بس اُسی دن آ کے وہ میرے گلے سے لگ گیا

بن کے اچھا کس لئے میں رحم کے قابل بنوں
ایک سا ہے آپ کی نظروں میں جب اچھا بُرا

ناؤ تیری کون جانے جا لگی کس گھاٹ پر
میں اذیت کے جزیرے میں مقید ہو گیا

بدگمانی کی غلیلیں دوستوں کے ہاتھ میں
دیکھ کر سہمی ہوئی ہے میرے دل کی فاختا

آئینہ ہوں اپنے سر پر قرض میں رکھتا نہیں
عکس جو تو نے دیا میں نے وہی لوٹا دیا

زندگی کے ساتھ ہم انصاف کر پائے نہیں
تھی حقیقت میں وہ بیوی ہم نے سمجھی داشتا

ہم نہیں بے دل سلوکِ اہلِ دنیا دیکھ کر
کاٹتے آئے ہیں کاٹیں گے شرافت کی سزا

اُس نے جو آواز دی گونجی وہی مجھ میں شباب
میں تو گنبد تھا فقط میرا بھلا کیا دوش تھا

○

حنیف نجمی (چھتیس گڑھ بھارت)

سچ پہ لایا نہ مجھ کو تہ نشیں رہنے دیا
میں جہاں تھا عمر بھر مجھ کو وہیں رہنے دیا

میں فلک زادہ ہوں مجھ کو خاک راس آتی نہیں
بے سبب تو نے گرفتارِ زمیں رہنے دیا

کیا مری خاطر یہ زنجیرِ زمیں کافی نہ تھی
کیوں مرے سر پر یہ چرخِ نیلمیں رہنے دیا

مل سکا مجھ کو نہ سب ملک بدن اس کا تو کیا
کچھ علاقہ تو مرے زیرِ نگیں رہنے دیا

بخش دیں اوروں کو اس نے بخششیں اپنی تمام
میرے حصے میں فقط داغِ جبیں رہنے دیا

شاد رہتا میں تو اس کو وسوسے آتے ہزار
تو نے یہ اچھا کیا مجھ کو غمیں رہنے دیا

شکر کر نجمی کہ مولا نے ترے محبوب کو
اس کہن سالی میں بھی اتنا حسیں رہنے دیا

○

صابر عظیم آبادی (کراچی)

دریچہ دل کا وا کرنا پڑے گا
کسی کو ہم نوا کرنا پڑے گا

یقیں کا ساتھ دوں یا پھر گماں کا
بتائیں مجھ کو کیا کرنا پڑے گا

اگر ہے خواہشِ منزل رسی تو
تمہیں کچھ حوصلہ کرنا پڑے گا

عمارت میں لگی ہے آگ کیسے
مجھے اس کا پتہ کرنا پڑے گا

طلب سے وہ زیادہ دے گا لیکن
خدا پر آسرا کرنا پڑے گا

سہانے خواب جو بنتے ہیں ان کو
الم سے آشنا کرنا پڑے گا

گھروں میں روشنی کرنے سے پہلے
دیئے سے مشورہ کرنا پڑے گا

ملے گی روکھی سوکھی جو بھی صابر
اُسی پر اکتفا کرنا پڑے گا

انور جاوید ہاشمی (کراچی)

خود اپنے آپ کو یا دل کو پیچھے چھوڑ آئے ہم — قدم آگے بڑھے منزل کو پیچھے چھوڑ آئے ہم
ہماری پیاس تھی صحرا' سمندر کیا بجھا پاتا — یہی تو سوچ کے ساحل کو پیچھے چھوڑ آئے ہم
خدا آسانیاں بخشے گا اے آئندگاں تم کو — کس آسانی سے ہر مشکل کو پیچھے چھوڑ آئے ہم
غزل کا ذائقہ درکار تھا کیسا سماعت کو — نہیں جانا بھری محفل کو پیچھے چھوڑ آئے ہم
محبت کا اثاثہ کر دیا تقسیم لوگوں میں — ہر اک حاصل کو، لا حاصل کو پیچھے چھوڑ آئے ہم

○

خالد ندیم بدایونی (بدایوں، بھارت)

مقتلوں میں پھر صداقت کا لہو بہتا نہ ہو — پتھروں کے درمیاں پھر آئینہ ٹوٹا نہ ہو
رہگذارِ زندگی کا وہ مسافر کون ہے — رنج و غم کے راستے سے جو کبھی گذرا نہ ہو
مشعلوں کی روشنی سے ہو رہا ہے یہ گماں — کوئی دریا کے کنارے قافلہ ٹھہرا نہ ہو
آؤ اُسکے پاس جا کر اُسکی صورت دیکھ لیں — پیڑ کے سائے میں کوئی آشنا بیٹھا نہ ہو
ایسے انساں سے محبت کی رکھیں اُمید کیا — جسکی آنکھوں میں وفا کا ایک بھی ڈورا نہ ہو
وہ ہماری زندگی پر کیا کریگا تبصرہ — جسنے اپنی زندگی کا آئینہ دیکھا نہ ہو
زندگی میں ہے اُسی کی اِمتیازی حیثیت — گردشوں نے راستہ جسکا کبھی روکا نہ ہو

○

افق دہلوی (لاہور)

اُن سے جو رسم و راہ رہی بھی تو کیا رہی — میری ہی ذات تختۂ مشقِ جفا رہی
در پر کسی کے دینی نہ دستک پڑی مجھے — زنجیرِ در کسی کی ہلاتی صبا رہی
اتنا عجیب جذبۂ دل کا اثر ہوا — پہونچی درِ قبول پہ لب پر دُعا رہی
اُس نے وفا کا عہد کسی اور سے کیا — جس بے وفا سے مجھ کو امیدِ وفا رہی
اللہ کا رہا ہے کرم حال پر مرے — دنیا ہی کیا مری تو مخالف ہوا رہی
جب موت کا ہے وقت معین تو پوچھیے — روحِ بشر کی تاک میں پھر کیوں قضا رہی
ظاہر کچھ اور آپ کا باطن رہا کچھ اور — مجھ کو رہی اگر یہ شکایت بجا رہی
اہلِ جہاں کو راس نہ آئی میری روش — سب سے الگ تھلگ رہی سب سے جدا رہی
شکوہ یہ جابروں کو ہمیشہ رہا افق — ہر بے نوا کی میری نوا ہمنوا رہی

○

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

تیری جدائی کا کتنا ہے احتمال مجھے
کہ گرد و پیش کا کوئی نہیں خیال مجھے

یہ زندگی تو امانت ہے میرے مولا کی
یہ کیسا خوف ہے کرتا ہے جو نڈھال مجھے

میں اپنے آپ کو بھولا تو سب کو بھول گیا
یہ روشنی ہے تو اس سے خدا نکال مجھے

کوئی پلاٹ مجھے بھی الاٹ ہو جاتا
پسند پنڈی میں ہے روڈ مصریال مجھے

تمہارے شہر سے گذرا ہوں سر اُٹھائے ہوئے
تمہارے شہر کے اچھے لگے رجال مجھے

مرے خدا مرے خامہ کو وہ ملے توفیق
میں نعت لکھوں محمد ﷺ کی دے کمال مجھے

زہیر کام میرے سب جلال والے ہیں
جو ہو سکے تو خدا پھر بھی دے جمال مجھے

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

سب راہوں کو اثبات کی رہ سے بدلنا ہے
منفی وطیرے چھوڑ کے اب تو سنبھلنا ہے

ہر شے نے اپنی اصل کی جانب ہے لوٹنا
مٹی کو اسلئے ہی تو مٹی میں ملنا ہے

حرفوں کی کشتیاں بہی جاتی ہیں ساتھ ساتھ
اور رنگ معنی کا ابھی پانی میں گھلنا ہے

سُود و زیاں کا وقت پہ احساس ہو تو خوب
افسوس سے تو بعد میں پھر ہاتھ ملنا ہے

ممکن ہو گر تو باہمی جھگڑے چکا ہی لیں
ورنہ تو اپنی آگ ہے اور آپ جلنا ہے

اپنی سنائیں پر سنیں گے دوسروں کی بھی
افہام اور تفہیم کے سانچے میں ڈھلنا ہے

سب سے تو پہلے سارے اپنا تجزیہ کریں
اس سے ہی تو اصلاح کا پہلو نکلنا ہے

ملکی مفاد ہی رہے ہر حال میں عزیز
قومی سلامتی کے ہی رستے پہ چلنا ہے

○

ظہیر ناصری (محبوب نگر، بھارت)

خیال ہوں، سخن معتبر میں رہتا ہوں
خمیر بن کے کفِ کوزہ گر میں رہتا ہوں

ہر ایک شخص ہے اپنی ہی ذات میں محصور
اک اجنبی کی طرح اپنے گھر میں رہتا ہوں

بس ایک آس کہ فریاد بن کے گونجوں گا
میں روز حلقۂ زنجیرِ در میں رہتا ہوں

کہیں تو تیرے قدم کا نشان مل جائے
میں صبح و شام تری رہ گزر میں رہتا ہوں

مرا تماشا ہیں ارض و سما کے نظارے
عجب تو یہ ہے دلِ مختصر میں رہتا ہوں

دہکتے شعر کا آہنگ ہوں نکھرتا ہوا
علامت اوڑھ کے عرضِ ہنر میں رہتا ہوں

ظہیر خوف کا ماحول ہے چہار طرف
کفن بدوش ہمیشہ سفر میں رہتا ہوں

○

سہیل غازی پوری (کراچی)

پاؤں کا آبلہ نہیں دیکھا
کتنا ہے فاصلہ نہیں دیکھا

سطحِ دریا پہ بارشوں کے بعد
تم نے کیا بلبلہ نہیں دیکھا

یوں تو دیوار پر بہت کچھ تھا
وقت کا فیصلہ نہیں دیکھا

تند دریا میں کود جاتے تھے
تم نے وہ حوصلہ نہیں دیکھا

ہم سے کیا پوچھتے ہو ہم سفرو
ہم نے بھی قافلہ نہیں دیکھا

پیڑ دیتے رہے ثمر سب کو
محنتوں کا صلہ نہیں دیکھا

آنسوؤں نے خوشی کے عالم میں
چشمِ نم کا گلہ نہیں دیکھا

منزلیں دور دور ہوتی رہیں
کون سا مرحلہ نہیں دیکھا

صبح سے شام تک گلوں نے سہیلؔ
کب خزاں سلسلہ نہیں دیکھا

○

عبداللہ سلیم (لاہور)

کیا خوب کرشمہ کاری ہے وہ دور بھی ہے اور دور نہیں
آنکھوں سے نہاں ہے دل میں عیاں مستور بھی ہے مستور نہیں

آتا ہی رہا ہے موسمِ گل اک تیرے بچھڑ جانے سے مگر
وہ کیف نہیں وہ جذب نہیں وہ رنگ نہیں وہ نور نہیں

اک تو جگر کی پیاس بجھے کل جانیے ساقی کیا ہوگا
خست یہ صبوحی کی خاطر اپنے تو یہاں دستور نہیں

رہبر بھی غلط اور رہ بھی غلط تا ہم یہ عجب خوش فہمی ہے
کچھ تم بھی کہو اے دیوانوں کہتے ہیں کہ غزل دور نہیں

جب طوفانوں کی یلغار ساحل کو بہا لے جاتی ہیں
کچھ ہوش کرو تن آسانوں وہ وقت زیادہ دور نہیں

آزادیٔ فکر پہ تعزیریں اور وقت کے ماداں آقاؤ
طوفانوں کی اٹھتی لہروں پر پہروں کا کہیں دستور نہیں

جب جینے کے ارماں روٹھ گئے اور موت کی آشا ٹوٹ گئی
کیا تم کو سلیم ان راتوں کا احسان سحر منظور نہیں

○

اوصاف شیخ (ساہیوال)

روز و شب موج میں ہے دشتِ تپاں میرے لیے
اک بگولہ ہے کہ ہے رقص کناں میرے لیے

میں ابھی نیند سے جاگا بھی نہیں تھا اور وہ
سو گیا چھوڑ کے حیرت کا جہاں میرے لیے

جبر کی مہر لگی ہے یہاں سب ہونٹوں پر
کون کھولے بھلا ایسے میں زباں میرے لیے

میں رہوں یا نہ رہوں فرق کسے پڑتا ہے
کس کو فرصت ہے کرے کون فغاں میرے لیے

روز آتی ہے جو مقتل سے اذاں کی آواز
منتظر ہے وہاں اک نوک سناں میرے لیے

میں نے جس ابر کے آنے کی دعائیں مانگیں
آخرِ کار ہوا شعلہ فشاں میرے لیے

○

تحسیر نوری (کراچی)

اس سے بڑھکر اس جہاں میں حادثہ کوئی نہیں
ہیں سبھی مطلب کے بندے باوفا کوئی نہیں
ہر ستم کو سہہ رہا ہوں اور گلا کوئی نہیں
مجھ سا لوگو صاحبِ صبر و رضا کوئی نہیں
جل رہا ہوں آندھیوں میں میں جو مانندِ چراغ
مجھ سا شاید اس جہاں میں غم زدہ کوئی نہیں
اس سے کچھ پہلے ہی تم قسطوں میں مرنا سیکھ لو
مت سنو اپنی صدا' اپنی صدا ، کوئی نہیں
میرا سینہ عزم اور ہمت سے خالی ہو گیا
زندگی کا مجھ سے شاید رابطہ کوئی نہیں
جم نہ جائے راکھ تنہائی کی آنکھوں پر مرے
اپنے گرد و پیش کو اب دیکھتا کوئی نہیں
میرا چہرہ ہے کہ اک سنگِ گراں ہے یہ تحسیر
آنے جانے کا ادھر سے راستہ کوئی نہیں

O

شارق بلیاوی (کراچی)

اُس سے بس رسم و راہ کافی ہے
اس طرح بھی نباہ کافی ہے
زندگی کیوں اِدھر اُدھر بھٹکے
عشق کی ایک راہ کافی ہے
گر فرشتوں سے قد بڑھانا ہو
تو صرف اک گناہ کافی ہے
فیصلہ ہے خدا کے ہاتھ میں جب
پھر خدا ہی گواہ کافی ہے
ہو سکے ہم نہ یوسف دوراں
ہم نے سوچا تھا' چاہ ، کافی ہے
اپنی ہی ذات میں چھپا ہوں میں
مجھ کو میری پناہ کافی ہے
تو فقط قدر کی نگاہ سے دیکھ
تری اتنی سی چاہ کافی ہے
عشق میں گھر کو بھی گنواتے کیا؟
ہو گئے ہم تباہ ، کافی ہے
دھوپ ساری سمیٹ لی شارق
مجھ کو یہ زادِ راہ کافی ہے

O

عادل حیات (دہلی بھارت)

اسے جب کوئی بھی نشہ نہیں ہے
وہ اچھا ہے ، مگر اچھا نہیں ہے
چھپا رکھا ہے خنجر آستیں میں
مگر دامن پہ اک دھبہ نہیں ہے
جواں سارے ہی بوڑھے ہو گئے ہیں
اور اب بچہ کوئی بچہ نہیں ہے
نظر میں دور تک شجر کھلے ہیں
درختوں پہ کوئی پتہ نہیں ہے
میں کیسے بات اس کی مان لیتا
وہ اپنے قول کا پکا نہیں ہے
خطائیں اس سے بھی ہوتی ہیں' لیکن
ہنر میں اپنے وہ کچا نہیں ہے
زباں پہ جھوٹ ہی اگتے ہیں عادل
کوئی بھی شخص اب سچا نہیں ہے

O

ڈرامہ

اندھے کو اندھا ملے، کر کر لمبے ہاتھ

گلزار جاوید

سین نمبر ۱

مقام: پیر صاحب کا آستانہ

کردار: پیر رضا حسن علی شاہ، شیخ ادریس، حاجت مند اور مریدین

پیر صاحب: ہونہہ (لمبی خاموشی کے بعد مراقبے سے باہر آ کر بھاری بھرکم ڈکار کے بعد داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) میاں! ہم نے پہلے بھی کئی بار سمجھایا ہے جو کچھ خدا نے دیا ہے اُسے صبر شکر کے ساتھ قبول کرتے رہو، بے جا بھاگ دوڑ تو دراصل قیامت کی نشانیاں ہیں!

شیخ ادریس: رب کی دین پر ناشکری کرنا، اُس سے منہ موڑنا بھی تو کفرانِ نعمت ہے سرکار!

پیر صاحب: میاں رہنے دو، شکر اور ناشکری کی باتیں ہمیں نہ سکھلاؤ!

شیخ ادریس: توبہ توبہ اللہ توبہ میری مجال! (کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے)

پیر صاحب: ہم سے کیا چاہتے ہو؟

شیخ ادریس: حضور! وہ وہ ہے نا، حاجی نور الٰہی، کسی طور قابو نہیں آ رہا!

پیر صاحب: (زیرِ لب تبسم کے ساتھ توند مبارک پر ہاتھ پھیر کر ڈکار لینے کی کوشش کرتے ہوئے) اس طرح کے کاموں میں ہاتھ کے ساتھ دل بھی کھلا رکھنا پڑتا ہے میاں! (اشتیاق سے شیخ ادریس کا چہرہ پڑھتے ہوئے)

شیخ ادریس: کیا عرض کروں سرکار! ہاتھ اور دل کھلا رکھنے کے ساتھ کئی بار اُسے کورے، نیلے، زرد نوٹوں کی گڈیوں کے درشن بھی کرا چکا ہوں، مگر وہ ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں!

پیر صاحب: یقین نہیں آتا! (طنزیہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے)

شیخ ادریس: قسم ہے پیدا کرنے والے کی، جھوٹ بولوں تو ابھی کے ابھی مر جاؤں!

پیر صاحب: رہنے دو میاں! (ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے) خدا اور رسول کو درمیان میں کیوں لاتے ہو، ہم سے زیادہ تمہاری فیاضی اور دریا دلی کا کون گواہ ہو سکتا ہے؟ (چند مرید اور حاجت مند یک بیک بلند آواز میں کہتے ہیں)

شیخ ادریس: آپ کا خادم بلکہ غلام ہوں، آپ کے ایک اشارے پر ــــــ

پیر صاحب: پچھلے برس گیارہویں کی نیاز تو ضرور یاد ہوگی تمہیں! (شیخ ادریس کا جملہ درمیان سے اُچک کر)

شیخ ادریس: جی جی یاد ہے، بالکل یاد ہے! (ہکلاتے ہوئے) کیا بتلاؤں سرکار! اُن دنوں دھندا ایک دم چوپٹ تھا!

پیر صاحب: اور آج کل؟ (تسبیح کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گھماتے ہوئے)

شیخ ادریس: آ آ آ آج آج کل، ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے (گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے)

پیر صاحب: بس ٹھیک ہے؟

شیخ ادریس: جی جی، آپ کی دعا سے ٹھیک چل رہا ہے، بالکل ٹھیک چل رہا ہے (آواز کی نسبت زور زور سے سر ہلا کر)

پیر صاحب: پھر دکان کو بڑا اور کشادہ کرنے کی ضرورت کیوں آن پڑی؟

شیخ ادریس: مائی باپ! کیا عرض کروں، ہمارے اور آپ کے زمانے میں خریداری ضرورت ہوا کرتی تھی، اب فیشن بن گئی ہے۔ پہلی بار مارکیٹ کا سروے ہوتا ہے، دوسری بار قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ، فیشن اور رواج، اُن کی جانچ پڑتال ہوتی ہے، تیسری بار پسند و ناپسند کی بحث چھڑ جاتی ہے، جو چیز بچی کو پسند ہوتی ہے وہی چیز ماں کو نہیں بھاتی، جو ماں کو بھاتی ہے وہ منا ناپسند کر دیتی ہے، غرض کئی کئی پھیروں اور بھاؤ تاؤ کے بعد خریداری کی نوبت آتی ہے، پھر! خریدار ایک ہوتا ہے، ہمراہی اور تماشائی درجن بھر!

پیر صاحب: ہونہہ! اچھا دیکھتے ہیں! (وقفہ دے کر) اچھی طرح سوچ لو میاں! کہیں پھر کا رونا ــــــ

شیخ ادریس: سرکار! شرمندہ کیوں کرتے ہیں (پیروں کو ہاتھ لگاتے ہوئے) آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر!

ایک مرید: (آگے بڑھ کر) شیخ صاحب، سرکار کے آرام کا وقت ہو گیا ہے، آپ بے فکر ہو کر تشریف لے جائیں، سرکار کے در سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہیں گیا، یوں سمجھئے! آپ کا کام ہوا کہ ہوا (چٹکی بجاتے ہوئے) بس آپ ایک کالا بکرا، ایک لٹھے کا تھان، سات سات کلو ساتوں اجناس، اتنے ہی ساتوں پھل، ایک تولہ کستوری، ایک تولہ زعفران، کچھ پھول، گگل اور لوبان کا انتظام کر دیجئے، پھر دیکھئے مرشد کا کمال!

سین نمبر ۲

مقام: مین بازار کے نکڑ پر چائے کا مشہور ہوٹل

کردار: ہوٹل کا مالک، ملازم، پیر صاحب کے مریدوں کا ٹولہ، گاہک اور دوست

پہلا مرید: سلام علیکم

ہوٹل کا مالک: وعلیکم سلام، آؤ آؤ، بسم اللہ، سناؤ پیر صاحب کا کیا حال ہے؟

دوسرا مرید: بھولے بادشاہ! اللہ کے نیک جی کبھی خراب ہوئے ہیں! پیر صاحب کو بھلا کیا ہو سکتا ہے؟

تیسرا مرید: آہا! آج تو حاجی نور الٰہی صاحب بھی بیٹھے ہوئے ہیں! حاجی صاحب خیر تو ہے؟ (اونچی آواز میں، ہاتھ ہلاتے ہوئے)

حاجی نور الٰہی: شکر ہے سچے خدا کا!

پہلا مرید: حاجی صاحب! شکر کیجیے کہ میرا چشمہ نظر آ رہا ہے' اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو تو ہم حاضر ہیں' میرا مطلب ہے مُرشد کے ہوتے ہوئے کوئی مسئلہ ہو ہی نہیں سکتا!

حاجی نور الٰہی: (کرسی قریب کرتے ہوئے) کانا پھوسی کے انداز میں) وہ ہے نا!

حرام خور! (ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے) اُس نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔

دوسرا مرید: کون؟ (حیرت سے آنکھیں نچاتے ہوئے)

حاجی نور الٰہی: ارے وہی! مکروہ شکل والا اور کون؟ (غصے سے دانت پیس کر)

تیسرا مرید: کہیں آپ کا اشارہ شیخ ادریس کی طرف تو نہیں؟

حاجی نور الٰہی: (چائے بسکٹ اور پیسٹری کا آرڈر دیتے ہوئے) یقین جانو! اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے' آتے جاتے' کہیں چین لینے نہیں دیتا' ہر وقت ایک ہی رٹ لگائے رکھتا ہے' اپنا مکان مجھے دے دو' اپنا مکان مجھے دے دو! (ہاتھ' منہ اور جسم کی حرکت سے شیخ ادریس کی نقل اتارتے ہوئے)

ہوٹل کا مالک: بنا ذرہ کی قیمت سے' چار گنا مانگ لو' سالے کی بکّی' خود بخود گم ہو جائے گی!

حاجی نور الٰہی: اور اپنے باپ دادا کی ہڈیوں کو کیا جواب دوں؟

دوسرا مرید: سولہ آنے پکی بات کی ہے حاجی صاحب نے! (چائے میں ڈبو کر بسکٹ منہ کی طرف بڑھاتا ہے مگر وہ چائے میں گر جاتا ہے)

ہوٹل کا مالک: (مرید کی نقل اتارتے ہوئے) شولہ آنے پکی بات کی ہے! اب انتہائی بیہودہ ہے حاجی صاحب کا تو کوئی حل نکال' اس حرام خور سے ان کی جان چھڑانے کا!

پہلا مرید: بڑے میاں! چائے پیئو' چائے! چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ گھنٹے تمہارے چائے بیچتے گزرتے ہیں' تمہیں کیا معلوم دنیا کہاں جا رہی ہے؟

حاجی نور الٰہی کا دوست: (سڑوں کر کے چائے کا گھونٹ حلق میں اتارنے کے بعد) ایک دم سولہ آنے کی بات کی ہے میاں! اس بیچارے کو کیا معلوم (ہوٹل والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ تو نرا گاؤدی ہے گاؤدی' چار گنا چھوڑ' پانچ گنا دے پر بھی راضی ہو جائے گا وہ! ابھی تو وہ حاجی صاحب کا گھر ہے گھر' دیوار گرتے ہی' ساری جگہ کمرشل ہو جائے گی! اس کے بعد وہ چاہے تو دکان بڑی کرے یا سب کچھ گرا کر پلازہ کھڑا کرے' میرا تو خیال ہے' دکان وکان بڑا کیا' سب ڈھونگ ہے' بڈھا' وہ پلازہ ہی چاہتا ہے!

ہوٹل کا مالک: واہ لالہ جی واہ' کیا کہنے! دور کی کوڑی لائے ہو' لو پھر آج ایک اسپیشل چائے' ملائی مار کے' میری طرف سے پیئو (اشارہ کر کے چائے کا کپ لڑکے کی طرف بڑھاتا ہے)

حاجی نور الٰہی: سمجھتا میں بھی سب کچھ ہوں' مگر (مٹھیاں بھینچ کر) میرا بس چلے تو سالے کو گولی مار دوں!

پہلا مرید: حاجی صاحب! آپ چاہیں تو آپ کے ایک اشارے سے (انگلی کو ہوا میں لہرا کر) صرف ایک اشارے سے' شیخ ادریس' بجلی کی طرح سیدھا ہو سکتا ہے!

حاجی نور الٰہی: وہ کیسے؟

پہلا مرید: ایک دفعہ آپ تشریف لائے اکرو' پھر دیکھنا مرشد کا کمال!

حاجی نور الٰہی: ارے واہ میرے شیر' تو نے تو کمال کر دیا! (اچھل کر مرید کا منہ چومتے ہوئے) تو جس کی تعریف کرنے کی بات کر رہا ہے میں تو سرتا پیر' سر پا پلک روا رخ کو تیار ہوں' ایک بار نہیں ایک بار۔۔۔۔

دوسرا مرید: کل شام (کچھ سوچ کر) نہیں' پرسوں صبح فجر کے بعد۔۔۔۔

تیسرا مرید: ابے پاؤ لا ہوا ہے (پہلے اور دوسرے مرید کو آنکھیں دکھلاتے ہوئے) حاجی صاحب! کل نہ پرسوں' آپ آج ہی آ جاؤ' عشاء کے بعد!

سین نمبر ۳

مقام: پیر صاحب کا حجرۂ خاص

کردار: پیر صاحب' حاجی نور الٰہی' تینوں مرید

حاجی نور الٰہی: اسلام علیکم' مرشدی! (مصافحے کے لیے گرم جوشی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے)

پیر صاحب: (حاجی صاحب کے دونوں ہاتھوں کے جواب میں کچھی سے ایک ہاتھ بڑھاتے ہوئے) آیئے آیئے' خوش آمدید!

پہلا مرید: مُرشد! معافی چاہتا ہوں' اصل میں حاجی صاحب کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہ گئی اسی لیے عبادت کے اوقات میں مخل ہونے کی جسارت کر رہا ہوں!

پیر صاحب: (مرید کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہوئے) بھئی! حاجی صاحب ہمارے پرانے مہربان ہیں! کیا ہوا اگر یہ ہمیں بھول گئے' ہمارے دل میں ان کی عزت اور قدر اسی طرح ہے' جس طرح پہلے تھی!

حاجی نور الٰہی: حضرت! کیا عرض کروں؟ غافل تو میں بھی نہیں رہا' مگر وہ بات زمانہ میں کچھ اس طرح جکڑا گیا ہوں۔۔۔۔

دوسرا مرید: عالیجاہ! حاجی صاحب آج کل بہت پریشان ہیں!

پیر صاحب: (مرید کو ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے) ہم سب جانتے ہیں' ہم سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے!

حاجی نور الٰہی: بندہ پرور! کچھ کیجیے' میری راتوں کی نیند اور دن کا سکون' اس بدبخت نے کچھ اس طرح برباد کر رکھا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا!

پیر صاحب: توبہ کیجیے' توبہ! اللہ کے بندے اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں' ہمارا کام اُن کی اصلاح کرنا' انہیں صحیح راہ دکھانا ہے' سو ہم اپنا فرض نبھائے جاتے ہیں' آپ ناحق' اپنی زبان کو تکلیف دے کر گناہ گار ہو رہے ہیں' سارا نظام زندگی' اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے (آسمان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے)

حاجی نورالٰہی: تو پھر حکم کیجیے! میں کیا کروں؟
پیر صاحب: توبہ استغفار! ہم کون ہوتے ہیں حکم کرنے والے؟ ہم تو بڑے گنا ہگار، خطا کار اور کمزور انسان ہیں (تینوں مرید بیک آواز اللہ ہو اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہیں) آپ اطمینان رکھیے، اللہ رب کریم کرم فرمائیں گے (حاجی صاحب اور تینوں مرید ایک ساتھ بیٹک بیٹک کہتے ہیں) آپ یوں کیجیے! اپنے گھر کا ایک کمرہ خالی کرا لیجیے۔۔۔۔
حاجی نورالٰہی: جی بہتر کل ہی کرا دیتا ہوں!
پہلا مرید: حضور کا بیان مکمل ہونے سے قبل دخل دینا منع ہے
حاجی نورالٰہی: (شرمندگی سے مرید اور عقیدت سے پیر صاحب کی جانب دیکھتے ہوئے) جی جی بہتر!
پیر صاحب: کمرہ خالی کرا کر سب سے پہلا کام اُس میں سفیدی کرانا ہے، اُس کے بعد دری، چاندنی اور گاؤ تکیے جو ابھی نئے ہونے چاہئیں، کمرے میں ڈلوا دیجئے، وظیفہ کم از کم سات دن کا ہوا کرتا ہے، وظیفے کے کچھ لوازمات ہے، یہ لوگ آپ کو آگاہ کر دیں گے، وہ آپ کو بہت توجہ، دھیان اور احتیاط سے خریدنا ہوں گے، ذرا سی کوتاہی یا لاپرواہی سے وظیفہ الٹا بھی پڑ سکتا ہے
دوسرا مرید: پچھلی بار ایک صاحب سے وظیفے کے سامان کی خریداری میں بد احتیاطی ہو گئی تھی، کفارہ ادا کرنے کے باوجود مرشد کو چالیس دن بڑے کرب کے عالم میں گزارنا پڑے تھے!
حاجی نورالٰہی: میں تو خریداری کے معاملے میں قطعی اناڑی ہوں (جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے)
پیر صاحب: یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ (غضبناک ہو کر)
حاجی نورالٰہی: جی میں میرا مطلب۔۔۔۔
پیر صاحب: ہرگز نہیں! یہ فقیروں کا ڈیرہ ہے، یہاں روپے پیسے اور لین دین کا ذکر بھی حرام تصور کیا جاتا ہے (نہایت جلالی انداز میں)
حاجی نورالٰہی: معافی چاہتا ہوں سرکار!
تیسرا مرید: حاجی صاحب! آپ میرے ساتھ تشریف لائیے، میں آپ کو سب کچھ سمجھا دیتا ہوں!

سین نمبر ۳

مقام: شیخ ادریس کے گھر کا ڈرائنگ روم

کردار: شیخ ادریس، پیر صاحب، تینوں مرید

شیخ ادریس: حضور! کچھ تو لیجیے! آپ نے تو اس قدر کم کھایا ہے، کہ اسے چکھنا بھی نہیں کہہ سکتے!
پہلا مرید: اصل میں ہم مرشد کی اس عادت سے اکثر پریشان رہتے ہیں، مرشد ساری ساری رات عبادت میں مشغول رہتے ہیں، اس لیے کھانے پینے سے قطعی پرہیز کرتے ہیں، جب بھی کوئی مرید یا نیاز مند آپ کو مدعو کرتا ہے تو وہ آپ کا کھانا ہمراہ بھیج دیا کرتا ہے، مرشد وہ کھانا بھی غریب غربا میں تقسیم کر دیتے ہیں، مرشد کی خوراک تو چڑیا کے برابر بھی نہیں! (اچانک شیخ ادریس کی نظر پیر صاحب کے سراپے پر پڑتی ہے مگر وہ جھینپ کر نگاہ دوسری جانب پھیر لیتا ہے)
پیر صاحب: نہیں بھئی نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہم نے جتنا کھانا تھا سیر ہو کر کھایا ہے، قدرت نے آپ کی بیگم کے ہاتھ میں خوب ذائقہ دیا ہے، واہ، واہ، خوب ذائقہ دیا ہے (انگلیاں چاٹتے ہوئے)
شیخ ادریس: حضور! تعریف کا بہت بہت شکریہ! آج کل کھانا بیگم نہیں بیٹی پکاتی ہے، بیگم تو گزشتہ کئی ماہ سے علیل۔۔۔۔
پیر صاحب: (اشتیاق سے) اچھا! ماشاء اللہ بہت خوب! تو کھانا بٹیا نے بنایا ہے
دوسرا مرید: آپ نے کبھی بیگم کی بیماری کا مرشد سے ذکر نہیں کیا؟ مرشد تو ایسی ایسی بیماری۔۔۔۔
شیخ ادریس: جی وہ میرا مطلب ہے آج کل ایک اچھے اور بڑے ڈاکٹر کے زیر علاج ہیں، اللہ کے فضل سے افاقہ بھی بہت ہے
تیسرا مرید: شیخ صاحب! لاحول پڑھیے، لاحول! شفا کس جانب اللہ ہوا کرتی ہے، یہ ڈاکٹر واکٹر مریض کو ٹھیک نہیں کرتے بلکہ مرض بڑھانے کے ماہر ہوا کرتے ہیں، کبھی کبھی تو (کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے) اللہ معاف کرے، مرض بڑھاتے بڑھاتے۔۔۔۔
پیر صاحب: میاں! اللہ تعالیٰ نے یہ منہ اچھی اچھی باتیں کرنے کے لیے دیا ہے، بد فعال نکال کر کیوں گناہگار ہوتے ہو، جو ہوتا ہے منجانب اللہ ہوتا ہے، اس میں بے چارے ڈاکٹر اور حکیم کا بھلا کیا قصور؟ (تینوں مرید ہم آواز ہو کر بیٹک بیٹک کی صدا لگاتے ہیں، شیخ ادریس بھی ان کی پیروی میں سر کی جنبش سے ہاں میں ہاں ملانے لگتا ہے)
پہلا مرید: بس شیخ صاحب! اللہ کا نام لے کر گھر کا ایک کمرہ فوری طور پر خالی کرا لیجیے! اُس میں سفیدی، چھا ہوا بھی ضروری ہے، ایک دری، ایک چاندنی، دو گاؤ تکیے اور چلّے کا ضروری سامان، بس خدا نے چاہا تو، حاجی نورالٰہی بھی آپ کے قدموں میں ہوگا اور آپ کی بیگم بھی مکمل صحت یاب ہو جائیں گی!
شیخ ادریس: میں حاضر، میں غلام، کوئی اور حکم؟ (پیر صاحب کی طرف سر جھکاتے ہوئے)
پیر صاحب: شیخ صاحب! فقیر لوگ حکم نہیں، التجا کرتے ہیں، التجا! (معنی خیز نظروں سے مریدوں کی طرف دیکھتے ہوئے)
دوسرا مرید: شیخ صاحب! اب اجازت دیجیے، مرشد نے بیٹھ کر ایم کو وقت دیا ہوا ہے
شیخ ادریس: (حیرت سے) بیٹھ کر ایم! کا کل والا؟

تیسرا مرید: جی! جی! سیٹھ ابراہیم کا کل والا! مرشد کا مرید ہے‘ اُن کی بیٹی کا علاج مرشد ہی کر رہے ہیں!

شیخ ادریس: ماشاء اللہ جی! ماشاء اللہ بڑا نام ہے شہر کا سیٹھ ابراہیم!

پیر صاحب: شہر کا؟ (ناگواری سے)

شیخ ادریس: جی میرا مطلب ہے ملک کا‘ سیٹھ ابراہیم کو کون نہیں جانتا؟

پہلا مرید: آج کل بے چارے کو سٹاک مارکیٹ اور بلڈرز کے کاروبار میں کافی خسارے کا سامنا ہے‘ اسی وجہ سے حضور کے آستانے کا کام رکا ہوا ہے!

شیخ ادریس: اچھا! (مرعوب ہوتے ہوئے) مرشد کا آستانہ سیٹھ ابراہیم تعمیر کرا رہا ہے!

دوسرا مرید: آج کل کام رکا ہوا ہے‘ حالانکہ ریت‘ بجری‘ اینٹ وغیرہ وافر مقدار میں موجود ہے مگر سیمنٹ اور سریا نہ ہونے کے باعث ـــــ

تیسرا مرید: اللہ اللہ! حضور کی دریا دلی اور فیض پھر بھی جاری ہے! راج‘ مزدور آتے ہیں‘ بیٹھتے ہیں‘ کھاتے ہیں‘ پیتے ہیں اور مزدوری لے کر چلے جاتے ہیں! کام نہ کرنے کے باوجود مرشد اپنی جیب سے اجرت دیے جاتے ہیں! مرشد کا فرمان ہے کسی کے پیٹ پر لات نہیں مارنی چاہیے‘ خدا معلوم اس کی ذات سے کتنے لوگوں کا رزق وابستہ ہو؟

شیخ ادریس: سبحان اللہ! ماشاء اللہ! میں بھی کوئی خدمت انجام دے سکتا ہوں؟

پیر صاحب: میاں! یہ تو جنت میں گھر کی تعمیر کا معاملہ ہے‘ جیسا گھر آپ وہاں چاہتے ہیں‘ ویسا اس سرزمین پر اللہ کا گھر تعمیر کر دیجیے‘ وہ قبول کرنے والا ہے! (رقت سے دونوں ہاتھ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے)

شیخ ادریس: میں میں! صبح ہی اپنا آدمی بھیج کر سیمنٹ اور سریے کا انتظام کرتا ہوں‘ نیکی کے کام میں دیر کیسی؟

سین نمبر ۵

مقام: حاجی نور الٰہی کا گھر

کردار: پیر صاحب‘ تینوں مرید‘ حاجی نور الٰہی‘ دوست اور نور الٰہی کی بیٹی۔

پیر صاحب: وظیفے کا وقت گزرا جا رہا ہے‘ مناسب ہوگا اگر آپ مطلوبہ کمرہ ہمیں دکھا دیں تاکہ ـــــ

حاجی نور الٰہی: حضور! پہلی بار غریب خانے کو عزت بخشی ہے آپ نے‘ کچھ تو خدمت کا موقع دیجیے!

پیر صاحب: (ناراضگی سے) میاں! ہم بے جا تکلفات اور فضول قسم کی رسومات کو ـــــ

نور الٰہی کی بیٹی: (پردے کے پیچھے سے ٹرے بڑھاتے ہوئے) بابا! کھانا تیار ہے!

پیر صاحب: (اشتیاق سے پردے کی جانب دیکھتے ہوئے) آ جاؤ بیٹیا! آ جاؤ! فقیروں سے کیسا پردہ؟ ہم بھی آپ کے بابا ہی ہیں ـــــ

حاجی نور الٰہی: ہاں آں آ آ‘ جاؤ آ جاؤ مرشد سے کیا پردہ! (پریشانی چھپاتے ہوئے)

پیر صاحب: ماشاء اللہ! بڑی پیاری بچی ہے‘ کس کلاس میں پڑھتی ہے بیٹیا! (سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کمر تک چلا جاتا ہے) کچھ خدا اور رسول کے لیے بھی وقت نکالتی ہو کہ نہیں؟

نور الٰہی کا دوست: اب تو ماشاء اللہ یہ کالج میں پہنچ گئی ہے! اسکول جانے سے قبل ہی حاجی صاحب نے گھر پر قرآن ختم کرا دیا تھا‘ پنج وقتہ نماز بھی باقاعدگی سے پڑھواتے ہیں!

پیر صاحب: بس بیٹیا! جی خوش ہو گیا تمہیں دیکھ کر! بیٹیاں تو باعث رحمت ہوا کرتی ہیں‘ جس گھر میں تم جیسی نیک سیرت اور نیک اطوار بچی ہو‘ بھلا وہاں شیطان مردود کا کیا کام؟ حاجی صاحب! مبارک ہو‘ کاغذ قلم لایئے اور ہماری پیش گوئی نوٹ فرما لیجیے‘ آپ کی بیٹیا آپ کے لیے بہت بھاگوان ہے‘ ارے ہاں بیٹیا! (لڑکی کا ایک پیر کمرے میں‘ دوسرا باہر کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہوئے)

بیٹی: جی جی!

پیر صاحب: ایک بات بتانا تو ہم بھول گئے؟

بیٹی: جی جی! (حیرت سے)

پیر صاحب: بھئی جب تک ہم آپ کے مہمان ہوں گے آپ کو چائے کی زحمت ضرور دیتے رہیں گے‘ کھانے وانے سے ہمیں زیادہ رغبت نہیں (تینوں مرید یک آواز‘ بیشک بیشک) البتہ! نیند کے غلبے سے محفوظ رہنے کے لیے‘ چائے کا سہارا ضرور لیا کرتے ہیں!

بیٹی: جی جی‘ کیوں نہیں آپ کا اپنا گھر ہے اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟

سین نمبر ۶

مقام: شیخ ادریس کی دکان

کردار: پیر صاحب‘ تینوں مرید‘ ڈرائیور‘ شیخ ادریس‘ چند ملازمین اور گاہک۔

شیخ ادریس: (پھرتی سے باہر آ کر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے) ماشاء اللہ‘ ماشاء اللہ‘ سبحان اللہ‘ زہے نصیب‘ آیئے آیئے تشریف لایئے! آؤ آؤ‘ میاں آ جاؤ (مریدوں اور ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے) آج تو ہمارے نصیب کھل گئے (جلدی جلدی کام بڑھاؤ‘ کھڑے ہوئے تھانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملازمین کو تاکید کرتا ہے) آپ یہاں تشریف رکھیے‘ نہیں‘ یہاں نہیں‘ یہاں (اپنی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اپنی خوش نصیبی کا اظہار کن الفاظ میں کروں؟ بی بی معاف کرنا بھائی کی گستاخی معاف‘ اس وقت کاروبار بند ہے‘ تھوڑی دیر کے لیے صرف تھوڑی دیر کے لیے‘ مرشد! روز روز تھوڑی تشریف لاتے ہیں؟ (مرد و خواتین گاہکوں کو مخاطب

کرتے ہوئے جو قدرے اشتیاق قدرے ناگواری سے پیر صاحب اور مریدوں کو دیکھتے ہوئے دکان سے باہر نکل رہے ہیں)

پیر صاحب: لگتا ہے! ہم غلط وقت پر آگئے؟ (ہاتھ میں پکڑا ہوا منقش عصا گھماتے ہوئے)

شیخ ادریس: حضور! آپ مالک ہیں، سرکار ہیں، آقا ہیں ہمارے آپ کو ہر وقت، ہر گھڑی، ہر پل پر مکمل اختیار رہا! (اشارے سے ملازم کو مدارات کے لیے دوڑاتا ہے)

پیر صاحب: بھئی وہ ہم شاکر اللہ نیازی کی والدہ کو دیکھنے جا رہے تھے، سوچا آپ سے بھی ملتے چلیں!

شیخ ادریس: شاکر اللہ نیازی! (خوشی سے باچھیں کھول کر) مشہور سیاستدان، سابق وزیر، نیازی گروپ آف انڈسٹریز کے مالک؟ (ہاتھ کے اشارے سے مزید حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے)

پہلا مرید: (بے نیازی سے) مرید ہے مرشد کا!

شیخ ادریس: اچھا جی! وہ بھی مرشد کا مرید ہے؟ (آنکھیں پھاڑتے ہوئے)

دوسرا مرید: اکیلا نیازی نہیں، پورا خاندان مرشد کا مرید ہے!

شیخ ادریس: اچھا اچھا ماشا اللہ جی بہت خوب! (ملازم کی لائی ہوئی بوتلوں میں سے ایک ادب کے ساتھ پیر صاحب کی جانب بڑھاتا ہے)

پیر صاحب: لگتا ہے ان نا اہلوں نے آپ کو بتایا نہیں! (بوتل سے منہ موڑتے ہوئے)

شیخ ادریس: کیا جی؟

تیسرا مرید: جرنیلی کی ہاتھ لگائی ہوئی کسی بھی چیز کو ہاتھ لگانا، پیر صاحب گناہ سمجھتے ہیں!

شیخ ادریس: اچھا جی! یہ تو بہت بڑی بات ہے، بہت بڑی! (مرعوبیت کے ساتھ)

پہلا مرید: صرف یہی نہیں! ہر نماز کے بعد یہ وضو کی تباہی و بربادی کے لیے، مرشد خصوصی دعا بھی فرماتے ہیں!

شیخ ادریس: سبحان اللہ، سبحان اللہ، بہت خوب، بہت خوب (وقفہ دے کر) مرشد! وہ حاجی نور ــــــ

دوسرا مرید: شیخ صاحب! آپ نے اپنے بندے کو کتنے سینٹ اور سریے کے لیے کہا تھا؟

شیخ ادریس: کیوں، کم پڑ گیا ہے کیا؟

پیر صاحب: کم پڑ گیا؟ (استہزائیہ انداز میں عصا گھماتے ہوئے)

تیسرا مرید: لگ اس سے تو صرف برآمدے کا لینٹر پڑ سکتا ہے، بھی تو ــــــ

شیخ ادریس: حضور! کل صبح سریا اور سیمنٹ پہنچ جائے گا (پیر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے)

پیر صاحب: کیا خیال ہے بھئی! چلا جائے؟ نیازی صاحب ــــــ (مریدوں کو مخاطب کرتے ہوئے)

شیخ ادریس: مرشد! یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ آپ پہلی بار تشریف لائے ہیں، تبرک کے طور پر کچھ تو! (شوکیس میں لگے کپڑے کے تھانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

پیر صاحب: لاحول ولا قوۃ، شیخ صاحب! ہمیں آپ سے یہ امید قطعی نہ تھی، کیا ہم آپ کو دنیا دار اور جاہ و حشم والے پیر نظر آتے ہیں (غصے سے کھڑے ہو جاتے ہیں)

شیخ ادریس: معافی چاہتا ہوں سرکار، میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا، میں تو بس اپنی خوشی کے لیے ــــــ

پیر صاحب: آپ کی خوشی کے لیے یہ لوگ حاضر ہیں (عصا گھماتے ہوئے تیزی سے گاڑی کی جانب بڑھنے لگتے ہیں، پیچھے پیچھے ڈرائیور اور شیخ ادریس بھی دوڑتے ہیں جب کہ تینوں مرید کپڑے لینے میں مصروف ہو جاتے ہیں)

پیر صاحب: جلدی کرو بھئی، بہت دیر ہو گئی ہے

شیخ ادریس: (پیر صاحب کو گاڑی میں بٹھا کر مڑتے ہوئے، مریدوں سے دھیمی آواز میں) میرا کام کہاں تک پہنچا؟

پہلا مرید: تو ٹوٹ گیا ہے (آنکھ میچ کر دانتوں میں زبان دباتے ہوئے، دوسرے دونوں مرید بھی مسکا اور مٹھی بنا کر ہاں میں ہاں ملاتے ہیں) خاطر جمع رکھو، کبھی بھی خوشخبری آپ کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے

سین نمبر ۲

مقام: حاجی نور الٰہی کا مخصوص کمرہ

کردار: پیر صاحب، حاجی نور الٰہی، نور الٰہی کی بیٹی

نور الٰہی کی بیٹی: بابا! یہ ہم کہاں رہ رہے ہیں؟ (چائے لے کر داخل ہوتے ہوئے)

حاجی نور الٰہی: کیوں بیٹی خیر ہے تو ہے، کیا ہوا آخر؟

بیٹی: ابھی ابھی پیر صاحب فرما رہے تھے کہ اگر آپ پیر صاحب کی بات مان جائیں تو ہم لوگ راتوں رات ــــــ

حاجی نور الٰہی: تھوڑی دیر پہلے! تم کیا کر رہی تھیں یہاں؟ (قدرے غصے کے ساتھ)

پیر صاحب: گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے نور الٰہی، ہم نے بیگم صاحبہ کے لیے دم کرنے کی غرض سے پانی منگوایا تھا بیٹی سے!

حاجی نور الٰہی: جی جی میرا مطلب تو یہ تھا کہ آپ کے کام میں دخل ــــــ

پیر صاحب: ارے ارے ارے، قطعی نہیں! یہ تو معصوم روح ہے، اس سے تو فرشتے بھی ــــــ

بیٹی: بابا! پلیز مان جائیے نا! (باپ کے کندھے دباتے ہوئے)

حاجی نور الٰہی: بیٹی وہ میں میرے بزرگوں کی نشانی ہے، یہ گھر نہیں، میں بیچ نہیں

کر سکتا!

پیر صاحب: ہوش کی باتیں کرو نور الٰہی! زیرِ زمین دفن خزانہ، تمہارے بزرگوں نے ہی تمہارے لیے دفن کیا ہے، کسی اور کے لیے ہرگز نہیں! (جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے)

بیٹی: اس پیسے سے ہم ایک نیا، عالیشان مکان بنا سکتے ہیں، اور، اور ایک جہازی گاڑی بھی لے سکتے ہیں! (خوشی سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے)

پیر صاحب: خدا معلوم تم کس قسم کے باپ ہو؟ تمہیں اپنی بیٹی کے مستقبل کی قطعاً پروا نہیں!

حاجی نور الٰہی: مکان گرتا دیکھ کر وہ اور شیر ہو جائے گا!

پیر صاحب: کون؟

حاجی نور الٰہی: وہی! شیخ ادریس اور کون؟

پیر صاحب: ہمارے ہوتے ہوئے ایک شیخ ادریس تو کیا ــــــ

حاجی نور الٰہی: مجھے اس کے لیے کچھ وقت درکار ہے! اس کی والدہ اور بھائی، بہنوں سے مشورہ بھی ضروری ہے!

پیر صاحب: میاں! ہوش کے ناخن لو ہوش کے! بیگم صاحبہ سے جتنی مرتبہ دل چاہے مشورہ کرو مگر کسی اور کو اس کی ہوا بھی مت لگنے دینا، ورنہ خزانہ تو دور کی بات، گھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے!

حاجی نور الٰہی: جی بہتر! جس طرح آپ فرمائیں گے، اسی طرح ہو گا، اسی طرح ــــــ

سین نمبر ۸

مقام: شیخ ادریس کی دکان

کردار: شیخ ادریس، چند گاہک، دکان کے ملازم اور پیر صاحب کے تینوں مرید

پہلا مرید: (مٹھائی کا ڈبہ بڑھاتے ہوئے) شیخ صاحب، مبارک ہو!

شیخ ادریس: کس بات کی؟ (بے خیالی میں مٹھائی کے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے)

دوسرا مرید: یہ تو وہی بات ہوئی، بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا!

شیخ ادریس: معاف کرنا میں سمجھا نہیں!

تیسرا مرید: شیخ صاحب! آپ کاروباری آدمی ہیں، آپ کو تو آنکھوں کے ساتھ کان بھی کھلے رکھنے چاہئیں!

دکان کا ایک ملازم: بھائی جی! ان کا اشارہ پیچھے ہونے والی کھٹ پٹ کی طرف تو نہیں؟

شیخ ادریس: میں قربان، میں صدقے، آؤ، آؤ، اندر آ جاؤ (تینوں مرید شیخ ادریس کے سامنے بیٹھنے لگتے ہیں) تفصیل سے بتاؤ، کیا کھچڑی پک رہی ہے پیچھے؟

پہلا مرید: مرشد نے آپ کے کام کے لیے رات دن ایک کر دیا، اور آپ ہیں کہ ــــــ

شیخ ادریس: بھائی! ابھی تو میں کہہ رہا ہوں، جلد سے جلد مرشد کی کرامات سناؤ! (خوشی سے عدالت کا اشارہ کرتے ہوئے)

دوسرا مرید: پیر صاحب نے کہا ہے، مال تیار رکھو، تحفہ بھی تیار ہے!

شیخ ادریس: (باچھوں سے تھوک صاف کرتے ہوئے) ایمان سے!

تیسرا مرید: میاں! ذرا باہر جا کر دیکھیے، آدھا ملبہ تو اٹھ بھی چکا ہے مکان کا!

شیخ ادریس: (لڑکے کو کپڑوں کے پیکٹ لانے کا اشارہ کرتا ہے) فی الحال یہ ناچیز تحفہ میری طرف سے قبول کرو، کام ہونے پر جو مانگو گے، وہی دوں گا!

پہلا مرید: (کپڑے کے تھیلے مضبوطی سے تھامتے ہوئے) شیخ صاحب، اس کی کیا ضرورت تھی!

دوسرا مرید: اچھا تو پھر اجازت! آپ اپنا کام کریں، ہم اپنا کرتے ہیں (انگلی اور انگوٹھے سے رقم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

تیسرا مرید: (چند قدم چلنے کے بعد پلٹ کر) ہاں شیخ صاحب، مرشد نے سریے اور سیمنٹ کی یاد دہانی کے لیے کہا تھا!

شیخ ادریس: سریا اور سیمنٹ؟ (وقفہ دے کر) اچھا اچھا، صبح پہنچ جائے گا!

سین نمبر ۹

مقام: حاجی نور الٰہی کا کھدا ہوا گھر

کردار: حاجی نور الٰہی، دوست، پیر صاحب اور تینوں مرید

حاجی نور الٰہی: معافی چاہتا ہوں حضور! پریشانی میں نہ ہوتا تو آپ کو اتنی صبح ہرگز زحمت نہ دیتا!

پیر صاحب: (سر جھٹک کے) خیریت، کیا ہوا؟

نور الٰہی کا دوست: حضور! دو دنوں سے کام رکا ہوا ہے!

پیر صاحب: کام رکا ہوا ہے، کیوں رکا ہوا ہے؟

حاجی نور الٰہی: (گڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) وہ دیکھیے؟

پیر صاحب: (تینوں مریدوں کی طرف تحسین بھری اچٹتی نگاہ ڈال کر) کرو اپنی عقل کا ماتم، اور کیا؟

حاجی نور الٰہی: میں جی؟ (پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے)

پیر صاحب: یاد ہے! کتنی مشکل سے تمہاری بات ماننے پر آمادہ ہوئے تھے؟

نور الٰہی کا دوست: آپ کا فرمان بجا، مگر سرکار! ان کا کیا کیا جائے؟ (گڑھے میں کنڈلی مارے سانپوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

پیر صاحب: میاں! یہ رکھوالے ہیں، رکھوالے! خدا معلوم کب سے اس خزانے کی حفاظت پر مامور ہیں! بہت محنت، بہت ریاضت کی ضرورت ہے، انہیں یہاں سے ہٹانے کے لیے!

حاجی نورالٰہی: بندہ پرور! آپ ہی یہ مشکل آسان کر سکتے ہیں!
پیر صاحب: ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، کرتے ہیں کچھ! پہلے ہی کہیں جان جوکھم میں کیوں نہ ڈالنا پڑے؟ یہ لوگ جیسا کہیں ویسا کیجیے! (مریدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تیز قدموں سے آگے بڑھ جاتے ہیں)

سین نمبر ۱۰

مقام: پیر صاحب کے آستانے کا صحن

کردار: تینوں مرید، حاجت مند خواتین، حاجی نورالٰہی اور دوست

حاجی نورالٰہی: اسلام علیکم، اسلام علیکم (بلند آواز میں مریدوں کو مخاطب کرتے ہوئے) بہت اچھا ہوا آپ یہیں مل گئے! جلدی سے پیر صاحب سے ملاقات کرا دیجیے! بڑی مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں، بڑی مش ـــــ
پہلا مرید: (حاجت مندوں کو درشتگی سے مخاطب کرتے ہوئے) تمھیں میں نہیں آتا میں کیا بکواس کر رہا ہوں؟
نورالٰہی کا دوست: کچھ بھی کرو، سب کام چھوڑ کر، ہمیں پیر صاحب سے ملا دو ورنہ کیا خبر بڑے نقصان کا باعث بن سکتی ہے!
دوسرا مرید: (تیوریاں چڑھاتے ہوئے) میاں! کیسے ملا دوں؟
تیسرا مرید: لگتا ہے! حاجی صاحب بولائے گئے ہیں، تمھیں کچھ سمجھاؤ نا انھیں؟ (دوست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)
نورالٰہی کا دوست: میرے بس کی بات ہوتی تو میں کب کا سمجھا چکا ہوتا!
حاجی نورالٰہی: (گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے) کھسر پھسر کرتے ہوئے ایک دفعہ ہو گیا، تعویذ انھوں نے تو کیا لکھا تھا! پہلے سانپ نکل آئے، اب پانی نکل آیا ہے، خدا کی پناہ! اس قدر شدت سے کلکل بہہ رہا ہے جیسے چشمہ نکل آیا ہو؟
پہلا مرید: اب تو جو کچھ بھی ہوگا، پیر صاحب کی واپسی پر ہوگا! آپ کو تو پتا ہے ہمیں اجازت نہیں، ورنہ ـــــ
حاجی نورالٰہی: ہیں؟ (پریشانی سے منہ پھاڑ کر) پیر صاحب نہیں ہیں!
دوسرا مرید: میاں! اب کیا اشتہار لکھ کر دوں کہ پیر صاحب تبلیغی دورے پر گئے ہوئے ہیں؟
حاجی نورالٰہی: اُف میرے خدا! اب میں کیا کروں؟ (نقاہت سے زمین پر ڈھیر ہونے لگتے ہیں، آگے بڑھ کر دوست تھام لیتا ہے)

سین نمبر ۱۱

مقام: شیخ ادریس کے گھر کی ڈیوڑھی

کردار: شیخ ادریس، بیگم اور بیٹی

شیخ ادریس: کہاں ہے، کہاں ہے؟ (دندناتا ہوا گھر میں داخل ہوتا ہے) آج وہ ملعون میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکتا، نہیں بچ سکتا!
بیگم: یا اللہ خیر! کس کی بات کر رہے ہو؟
شیخ ادریس: اسی ڈوگنی کی اور کس کی؟
بیٹی: ابو جی! کیا غضب کر رہے ہیں! پیر صاحب نے سن لیا تو آفت آ جائے گی؟
شیخ ادریس: اس سے بڑی آفت اور کیا آئے گی! (بیٹی کو درمیان سے دھکا دے کر ہٹاتے ہوئے) مکان ڈھے گئی، نکل اٹا، شاہ پانی میں ڈوب گیا، ہم تباہ و برباد ہو گئے، آج میں اس ڈوگنی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، نہیں چھوڑوں گا! (بیٹی اور بیگم کے روکنے اور کھینچنے کے باوجود شخص کمرے کا دروازہ لات مار کر زور سے کھولتا ہے)
بیٹی: ہیں؟ (کمرا خالی دیکھ کر) کچھ دیر پہلے تو یہیں تھا!
شیخ ادریس: یہیں تھا تو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ (غصے اور جھنجھلاہٹ میں زمین پر پیر پٹختے ہوئے)
بیگم: وہ دیکھیے؟ (کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرف اشارہ کرتی ہے)
بیٹی: اور وہ دیکھیے؟ (ہونٹوں کی طرح کھلی ہوئی تجوری کی طرف ماں باپ کو متوجہ کرتے ہوئے)
شیخ ادریس: تیری تو ـــــ میں بھی دیکھتا ہوں، کب تک میرے ہاتھ سے بچتا ہے؟ (تیزی سے گھر سے باہر نکل جاتا ہے)
بیگم: میں نے کہا سنو تو!
بیٹی: ابو جی، ابو جی! (ماں بیٹی دوڑ کر دروازے تک جاتی ہیں مگر شیخ ادریس آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے)
ماں بیٹی: (ہم آواز ہو کر گڑگڑانے لگتی ہیں) آل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو ـــــ

سین نمبر ۱۲

مقام: شہر سے دور دریا کا کنارا

کردار: سیر سپاٹا کرنے والے لوگ، چند مچھیرے اور دو اجنبی

پہلا اجنبی: (بہت دیر سے دریا کے کنارے بیٹھا منہ ہی منہ میں بڑبڑ کرتے کبھی روتا ہے، کبھی ہنستا ہے اور کبھی گڑگڑانے لگتا ہے) یا اللہ! کوا ہوتا میرے مولا مجھے بخش دینا، مجھے بخش دینا! بڑی بے بسی اور کرب کے عالم میں انتہائی قدم اٹھا رہا ہوں! (آنکھیں بند کر کے دریا میں کودنے کی تیاری کرتا ہے کہ اتنے میں دوسرا اجنبی آناً فاناً آ کر دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے، پہلا اجنبی کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑا رہتا ہے، پھر وہ بھی بے ساختہ دریا میں کود پڑتا ہے)
دوسرا اجنبی: (ہوش میں آتے ہوئے) تم ـــــ؟
پہلا اجنبی: ہاں ـــــ میں ـــــ!
دوسرا اجنبی: تم ـــــ یہاں ـــــ کیا کر رہے ہو ـــــ؟
پہلا اجنبی: اگر تم ایک منٹ کی تاخیر سے آتے تو یہی سوال میں تم سے کر رہا ہوتا! (چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو حسرت و محبت سے دیکھ کر آنسو بہاتے ہیں پھر گرم جوشی سے گلے لگ جاتے ہیں اور دونوں کی ہچکی بندھ جاتی ہے)

سردشتِ غم

کسی شام

امجد اسلام امجد (لاہور)

جو اُتر گیا ترے دھیان سے کسی خواب سا
سرِ دشتِ غم،
کسی بجھتے مٹتے سراب سا
کسی اُجڑے گھر میں دھری ہوئی
کسی بے پڑھی سی کتاب سا
میں ہوں گم اُسی کی مثال گردِ سوال میں
کسی زیرِ لب سے جواب سا!

مجھے دیکھ مجھ پہ نگاہ کر
کہ میں جی اُٹھوں ترے دھیان میں
مجھے راستوں کی خبر ملے اِسی دشتِ ریگِ رواں میں
تو پڑھے جو مجھ کو ورق ورق
مرا حرف حرف چمک اُٹھے
تو دمک اُٹھے وہ حدیثِ دل جو نہاں ہے عرضِ بیان میں
کسی شام اے مرے بے خبر
وہی رنگ دے مری آنکھ کو وہی بات کہہ مرے کان میں!

O

خدا تُو ہے کہاں

ندا فاضلی (ممبئی بھارت)

خدا تو ہے کہاں؟
تیری بہت مجھ کو ضرورت ہے
ترے ہوتے ہوئے تو
وقت پر سورج نکلتا تھا
ہوا پیڑوں میں رہتی تھی
ندی کھیتوں میں بہتی تھی
اندھیرے راستوں میں چاند ساتھی بن کے چلتا تھا
ترے ہوتے ہوئے تو
ہر بھنور میں کوئی ساحل تھا
ترے ہوتے ہوئے
خوش رنگ حق!
بے رنگ باطل تھا!
تو ہی لا حاصلی کے دشت میں ہر دل کا حاصل تھا
مجھے معلوم ہے!
اب تو نہیں اُن آستانوں میں
بزرگوں سے
جہاں ملتا تھا تو اگلے زمانوں میں
محبت در بدر
بے آسرا بے اک عبادت ہے
خدا تو ہے کہاں
تیری بہت مجھ کو ضرورت ہے

وقت کے تیور بتاتے ہیں

محمود شام (کراچی)

ہوائیں کہہ رہی ہیں
وقت کے تیور بتاتے ہیں
فلک بھی یہ اشارے دے رہا ہے
اتحادی اپنے شہروں کے گلی کوچوں میں اتریں گے۔
فضا سے آگ برسے گی
یہ ولیوں۔صوفیوں کی سرزمیں شعلوں میں لپٹے گی
خدا جانے یہاں کیا حشر برپا ہونے والا ہے۔
نہ جانے آنے والی کل کے دامن میں
چھپی ہیں ذلتیں کتنی
لدی ہیں آفتیں کتنی
یہ سب کچھ دیکھ کر لگتا نہیں ہے جی سکوں گا میں
مجھے اپنے جوانوں۔بیٹیوں بیٹوں سے کہنا ہے
کسی بھی غیر ملکی سولجر کا خیر مقدم۔تم نہیں کرنا
کسی کو ایک بھی گل پیش مت کرنا
کسی بھی اجنبی کے گال پر بوسہ نہیں دینا

○

اُداسی

سکریتا (دہلی بھارت)

انگریزی سے ترجمہ: گلزار (ممبئی بھارت)

اکثر خود سے باہر آ کر،
اُس کے پیچھے پیچھے چل کر
اُس کو دیکھتی بھانپتی رہتی ہوں
وہ کانٹوں کو روندتی ننگے پیروں میں
تلوے لہولہان کئے
گزرتی ڈھلتی رہتی ہے
لوگوں کی بدلتی قدروں میں
جو اپنی سہل سہولت سے
رَد کر دیں یا قبول کریں!

میں نغمے سناتی ہوں
تا کہ وہ اپنی ہستی کے
مرکز کو ڈھونڈ سکے

میں روتی ہوں
تا کہ وہ اپنے رنج والم کو
جھیل سکے۔
میں خوش ہوتی ہوں
بادل کی گرج جب سنتی ہے وہ
اور چمکتی بجلیوں سے ڈر جاتی ہے
جب دیکھتی ہے اُن سب سے الگ
میں اُس کو دیکھتی رہتی ہوں!

تب واپس خود میں لوٹ آتی ہوں!

جس کا نام محبت ہے

ممتاز احمد (برمنگھم برطانیہ)

ہے لفظ اک گھسا پٹا
لیکن الگ سب سے جُدا
کہ جب کہیں نیا لگے
یہ لفظ دردِ دل بھی ہے
دل کا سکوں قاتل بھی ہے
فرزانگی سے ماورا
دیوانگی سا دلربا
ہر ایک کا محبوب ہے
طالب کبھی مطلوب ہے
وہ جس کو ہی دوام ہے
حافظ کبھی خیام ہے
یہ میر کا دمساز تھا
غالب کا بھی ہمراز تھا
اقبالؒ نے چاہا جسے
اختر نے بھی برتا اُسے
سلمیٰ کبھی عذرا کہا
یہ سب اُسی کا فیض ہے
کہ فیض جس کا فیض ہے
ساغر کبھی ساحر ہوا
آخر میں میرا جی بنا
ہر عشق کا انجام ہے
اس کے سوا سب خام ہے
قدرت کا اِک انعام ہے
ممتاز کیوں بدنام ہے
جس کا محبت نام ہے

رقصِ تفریق

(راجستھان کے حالات سے متاثر ہوکر)

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ (جے پور بھارت)

کہا تھا اُس نے
دس برس میں رد کر دیتا
تفریقِ رنگ و نسل کا کھیل
ورنہ
ذات پات کا قوی ہیکل دیو
تار تار کر دیگا قبائیں ترقیوں کی
قوم کا جینا ہو جائیگا دُوبھر
بھڑک اُٹھیں گے نفرت کے شعلے
قریہ قریہ شہر شہر
بانجھ ہوئی حکمتِ عملی مری سیاست
مکرر کہتا رہا کانسٹی ٹیوشن کا بانی!

-:۲:-

اے خود پرست رہنمائے قوم!
پیش گوئی کو تُو نے لغو سمجھا
تفریقِ قوم کا گھناؤنا رقص تو نے جاری رکھا
ساٹھ برسوں کے بعد بھی کرتا رہا ٹھٹھکیلیاں اُس سے
مفادِ ووٹ مفادِ آخر رہا تیرا مقصد!
چہار اطراف تفریق کے بیتال کے دیو
گوناں گوں اشکال میں اپنے پرچم لہرا رہے ہیں
کر رہے ہیں ذہن و ادراک مفلوج
فرار کی راہیں مسدود
احتجاج کے شعلے بھڑک رہے ہیں
کدورتوں کے لامتناہی سلسلے پنپ رہے ہیں
نفس نفس آتشیں فضا میں سُلگ رہا ہے
شرفائے باشعور جو باروائے ہے آتشِ نمرود کا دریا
راہِ مفر ہے نگاہ سے اوجھل
اور ایسے میں کر رہے ہو بند تم
بندوقوں سے زخموں کا منہ !!!

ہائیکو

انوارفیروز (راولپنڈی)

ہنس کے راتیں گزار
اچھے دن بھی آئیں گے
غم نہ کر انوار

پتھر آیا تھا
پیچھے مڑ کر دیکھا تو
اپنا سایا تھا

خوف سے ہے وہ زرد
اور وہ کر دیتا ہے دوش
خود ہے دشت گرد

چپ ہیں سب دمساز
آج غریب ممولوں پر
جھپٹے ہیں شہباز

کیسا شہر بسا
انساں سارے پتھر ہیں
کوئی بولے کیا

وہ تنہائی کی رات
یادوں کے در کھول گئی
اشکوں کی برسات

پنج بُجھی

بھگوان داس اعجاز (دہلی بھارت)

جنہیں نہ اپنا گھر پتہ
وہ تیرا گھر پوچھتے
تو مٹھی مت کھول
کھرے کھرے بک جائے گا
اونے پونے مول!

بات کہوں میں کام کی
جس پر کرپا رام کی
وہ حاکم بن جائے
بیٹھ تماشہ دیکھتی
عقلمند کی رائے!

چھوڑے تو کاٹے اُسے
دیمک بن چاٹے اُسے
کھاوے پکڑے کوڑھ
پڑی سرپ کو چھپکلی
رہی اُسے جھنجھوڑ!

ہم نے دیکھی ہیں میاں
ماتھے تنتیں تیوریاں
آنکھ میں گتی رکھ
افسر کیسے مانگتا
آنکھ دکھا کر بھیک!

دفتر تھانہ کورٹ ہو
لپک پکڑتے نوٹ کو
بیٹھا بگلا تاک
مچھلی آوے چونچ میں
اندر کرے تپاک!

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے

فیصل عظیم (کناڈا)

مبارک سلامت کے تحفے دیے ہیں
بہت سی دعائیں تمہارے لیے ہیں
یہ زیور، یہ جوبن تمہارا غضب کا
یہ ماتھے کا جھومر، یہ گوشہ، یہ دبکا
یہ ہاتھوں میں چمکیلے کنگن تمہارے
یہ پیروں میں چاندی کے روشن ستارے
گلے میں حمائل گلوبند ہو گا
لبوں پر بھی سرخی کا پیوند ہو گا
ہمیں تو کھٹکتی ہے بے اختیاری
کہ آواز بھی کاش ہوتی تمہاری
تمہیں گھیرے رکھتے ہیں روشن ستارے
اندھیری سی راتوں کے یہ استعارے
گلوبند یہ طوق کیوں ہے گلے کا
یہ کانوں میں کیوں ہے غلامی کا حلقہ
یہ ہاتھوں میں کنگن ہیں یا ہتھکڑی ہے
یہ پیروں میں پائل، کہ بیڑی پڑی ہے
یہ لفظوں کے پنچھی کے کیوں پر کٹے ہیں
تمہاری تو آواز پہ سر کٹے ہیں
وہ آواز جو دفن کر دی گئی ہے
تمہارے ہی اندر کہیں مر گئی ہے
مگر ایک تم ہی پریشاں نہیں ہو
جو بے اختیاری پہ نالاں نہیں ہو
حقیقت بھی سچ دھج کی سب جانتے ہو
غلامی، غلامی کو کب مانتے ہو
تمہارے اسیروں نے لب سی لئے ہیں
بہت سی دعائیں تمہارے لیے ہیں

****

جنگِ آزادی

(تب سے اب تک)

رؤف خیر (حیدرآباد بھارت)

چاپلوسی کی روایت نہیں رکھتے ہم لوگ
سال باسال سے انصاف کے طالب ہم ہیں
مخبری یاروں کی کرتے نہیں آقاؤں سے
دامن شاہ کی زینت ہیں نہ غالب ہم ہیں

وہ لیاقت ہوں کہ ججّی ہوں کہ صادق علماء
سید قوم شہید اور شہید اسمعیل
نام کے خانوں سے بدباطنی سرداروں سے
جان کھوتے رہے قابیل کے ہاتھوں ہابیل

کانپوری وہ عزیزن ہو کہ بیگم حضرت
لکشمی گھر کے دل و ذہن کی رانی جھانسی
سانس آزادی سے لینے کی تمنا جب کی
بے گھری ان کے مقدر میں رہی یا پھانسی

بیج اس خاک میں آزادی کا بویا ہم نے
بارآور جو ہوا ہے تو شجر ہے سب کا
پھول پتے تو سبھی کھا گئے شا کا باری
گوشت خوروں نے اسے بانٹ لیا ہے کب کا

حاکمیت کا سزاوار فقط اک حق ہے
مردِمومن کبھی محکوم نہیں رہ سکتا
سر کبھی ظلم کے آگے نہ جھکا ہے نہ جھکے
وہ جو ظالم نہ ہو مظلوم نہیں رہ سکتا

دعا آسماں میں کہیں کھوگئی

پرت پال سنگھ بیتاب (دھرم شالا،بھارت)

پہاڑ پر چڑھتے ہوئے
میں دیکھ رہا تھا
کہ جیسے جیسے
میں اونچائی کی طرف بڑھ رہا ہوں،
میرا قد
چھوٹا اور چھوٹا ہوتا جا رہا ہے،
دیکھتے ہی دیکھتے
میں سب سے اُونچی چوٹی پر پہنچ گیا
لیکن یہ کیا
وہاں تک آتے آتے
میرا قد اتنا چھوٹا ہو چکا تھا
کہ میں لگ بھگ
دِکھائی بھی نہیں دے رہا تھا،
پھر وہاں اُوپر
مَیں نے دعا کی
کہ مجھے میرا "اپنا پورا قد
واپس مل جائے
چاہے اس کے لیے مجھے
اُونچائی سے واپس نیچے آنا پڑے،
لیکن ایک بار اونچائیوں میں کھو کر
کوئی واپس کہاں ملتا ہے

o

''سپاہی مقبول حسین''

(۱۹۶۵ء سے ۲۰۰۵ء تک بھارت میں قید و بند کی اذیتیں جھیلتا رہا۔)

شگفتہ نازلی (لاہور)

مقبول بھی حسین بھی بیٹے پاک فوج کا
ظلم و ستم بھی ہوتا رہا کیا کمال کا
بُغض و عناد و قہر کا مذموم مرحلہ
دو چار دن کا ذکر نہیں چالیس سال کا

کیا کیا نہ حربے اُس پر آزمائے تھے گئے
تاکہ کچھ حسبِ منشا اگلوایا جا سکے
سچا سپاہی مُلک پہ نہ آنچ آنے دے
اِس واسطے عدو نہ کوئی راز پا سکے!

ماں باپ کی دُعاؤں کا وہ سائبان سا
چلتے ہوئے تھا گھر سے اک انمول اثاثہ
راہِ خدا میں اُٹھتا ہر قدم تھا بے خبر
آگے ہے آزمائشوں کا ایک سلسلہ!

اپنے لہو سے لکھتے رہے نام دیس کا
مقبول کا شمار بھی اُن وفاداروں میں
پاداش میں اسی کی زباں چھین لی گئی
پر اب سراپا بولتا ہے سب حصاروں میں!

جب وطن کی جب کوئی تاریخ لکھے گا
تو جگمگاتے ناموں میں مقبول آئے گا
پرچم قریبِ دل کے رہا قید و بند میں
کوئی بھی جاں نثار کیسے بھول پائے گا!

دیدۂ بے نُور کا پُر نور گریہ

دل نواز دل (واہ)

کیسے کہوں کسی کو کوئی تو خیال ہو
کوئی جواب اور کوئی تو سوال ہو

آنکھوں میں آج دیکھ کسی کی تو دید ہو
ماتم گلی گلی نہ کہیں پر تو عید ہو

ہر روز اُٹھ رہے ہیں جنازے جہان میں
شادی اگر کہیں ہے تو ہے اب گمان میں

سڑکوں پہ بھوک پیاس ہے ہر دم رواں دواں
تشنہ لبی یہاں تو شکم گرسنی وہاں

ہیجان ہے جہان کے دل میں نظر میں آگ
ڈسنے کو بے قرار ہے زہری جہاں کا ناگ

بے فکر کیا کسی کو کوئی ملک و قوم کی
ہر سنگدل کے ہاتھ میں گڑیا ہے موم کی

اب لوگ خودغرض ہیں زمانہ ہے بے غرض
دُنیا کی جان لے گا یہ ہے خودغرض مرض

اپنے کیے پہ ناز ہے ہر ایک کو یہاں
اس ناز پر ہنسے ہے زمین روئے آسماں

کالا اگر ہے کوٹ تو کالر سفید ہے
آزاد عدل ہو کے بھی انصاف قید ہے

لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں راہبر
کہنے میں ان کے آکے جلاتے ہیں لوگ گھر

ہم میں سمجھ ہے اور نہ ہم میں ہے عقل دیکھ
اَے شیشۂ نگار وطن اپنی شکل دیکھ

کیا کچھ تھے ہم جہاں میں مگر آج کچھ نہیں
ہوتے ہوئے بھی خود پہ کسی کو ہے کیا یقین!

مالی نے آپ شکل بگاڑی چمن کی دیکھ
دو لخت کر دیا ہے جگر خود وطن کا دیکھ

کوئی خزاں ہے اور نہ کوئی بہار ہے
جو شاخ بھی رہن ہے وہی خار دار ہے

یہ دیکھ کے بھی دیدۂ عبرت کو غم نہیں
پُر خونِ دل ہے آنکھ مگر پھر بھی نم نہیں

کتنا بُرا ہے وقت زمانے سے پُوچھ لو
تم اس کی زد میں ہو یہ نشانے سے پوچھ لو

تیرِ قضا کی زد پہ ہو اب تم کمان گرو
چلّہ چڑھاؤ جب کبھی، تم تانت سے ڈرو

چینل کھلے ہوئے ہیں دریدہ دہن میں سب
در گور میں جو زندہ ہیں ڈُزدِ کفن میں سب

ہے ایک حکمران تو محکوم ہیں تمام
ظالم کے دستِ چیر میں ہے تیغِ بے نیام

ہے ایک خاص اور جو سارے ہیں وہ ہیں عام
مارے گئے ہیں خاص جو وہ عام ہیں عوام

اب کیوں کسی کے دل میں زمانے کا درد ہو
مِلّت نہیں ہو تم تو بس اب ایک فرد ہو

ہے دِل اگر لہو تو نگاہیں ہیں اشک بار
دامن ہے گُل زمین کا کانٹوں سے تار تار

تشکر کا نم

ڈاکٹر ریاض مجید (فیصل آباد)

(ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی نذر)

یہ کیسا تسلسل ہے حرفِ دعا کا
محبت کی رعنائیوں میں گندھے لفظ آشنا آرزو سے عبارت ہیں
جینے کی لذت کہ اک عمر سے نشوونمائش آ گہی کی بجائے دل آویز
جذبِ محبت کی محتاج تھی۔ مطمئن ہے

ابھی بام و در سے کس اپنائیت کی ہوا آئی ہے
شکر کا مرحلہ ہے
تشکر کا نم آنکھ میں پھیل کر زمزمہ آثار ہوتا چلا جا رہا ہے
تہی کے خلیوں میں کس کی صدا نے چراغاں کیا ہے؟
کہ تاریک باطن کی رہداریاں روشنی ہو گئی ہیں

یہ کیسا تسلسل ہے جذبِ وفا کا
ابھی جیتے دھاڑتے عصر کی رت سے انگیز یلغار سے بچ رہی چند
جاں بخش قدروں کے اسلوبِ زندہ میں
کیسی تحریر ہے حوصلے سے بھری جس کا ہر حرف شفقت سے منسوب ہے
کیا اشارے ہیں جینے کی خوب آشنا سرخوشی کے؟
جو سب ناموافق فضاؤں سے لبریز موسم کے زخموں کا مرہم بنے ہیں
کون دل کا سخی ہے؟
جو خود جاں کنی کے بھنور میں پھنسا بھی غریب الدیار آرزوؤں
کے سر پر محبت بھرا ہاتھ رکھنے کی تعلیم پر
ان دنوں میں بھی معمور ہے
جن دنوں میں غرض کار زینوں نے ہر سمت اپنی ہوسناکیوں کے
پر و بال پھیلائے ہیں
کون اپنا ہے وہ؟
جو بظاہر ہماری صفوں میں نہیں ہے
مگر اصل میں وہ ہمارے ہی بکھرے قبیلے کا اک فرد ہے
۔۔۔۔ قبیلہ جو بکھرا تھا
رشتوں کے آثار کی کھوج میں
روشنی زاد رشتے جو حرفِ وفا سے عبارت تھے
کلکِ محبت سے تاروں کی صورت نکلتے تھے
تو جہاں کے خرابوں کو پُرنور کرتے تھے
دکھ کے اندھیروں میں اپنائیت کی روشنی کاشت کرتے تھے

آج صدیوں کے ہجران پھیلاؤ میں ہاتھ آیا سراغ ان وفاداریِ رشتوں کا
۔۔۔۔ ایک تحریر کو دیکھ کر
عمر کو حوصلہ بخشتی جاں کو تسلی ملی
دل کی گہرائیوں میں دعا سرسرائی ہے
اے آرزو سے بھری ساعتیں بخشنے والے
روشن رکھ اس حوصلہ بخش تحریر کے خواب گر کو
اس کے گرداب کو سکھ کا ساحل بنا
اس کے سانسوں میں آتے زمانے کی آسودگی کے
چراغوں کا بندھ رکھ
اس کے دستِ ہنر سے نکلتی ہر اک
مرہم آثار تحریر کو زندگی بھر شاداب رکھ
اس کی تعبیر ہر حرف کو سرخرو خواب در خواب رکھ

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید صاحب!

سلام مسنون۔ جون ۲۰۰۸ کا ’’چہارسو‘‘ نظر نواز ہوا۔ رالف رسل صاحب کو ’’قرطاسِ اعزاز‘‘ پیش کر کے آپ نے ایک بہت اچھا کام کیا ہے۔ میں نے ان کا گوشہ بڑی دلچسپی سے پڑھا ہے۔ پہلی بات تو یہ محسوس ہوئی کہ رالف رسل عقیدے کے پکے انسان ہیں۔ سوویت یونین ٹوٹ جانے کے بعد پاکستان کے بہت سے ترقی پسند اپنا منہ چھپا کے پھرتے تھے اور پھر انہیں جرنیلوں کے دربار سے تمغے اور ایوارڈ وصول کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔ شاید ہی کوئی چھوٹا اور بڑا ترقی پسند سرکاری ایوارڈ سے محروم رہ گیا ہو۔ لیکن رالف رسل صاحب اپنے کیمونسٹ ہونے پر کس قدر نازاں ہیں اور اس کی نظریاتی جہت کی کتنی مدلل وکالت کر رہے ہیں۔ وہ اقبال صدی کی تقریبات میں شرکت کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے تھے تو مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس تقریب میں وہ سینکڑوں ادیبوں سے ملے ہوں گے اور وہ سب کے نام اور شکلیں یاد نہ رکھ سکے ہوں گے۔ بھول جانے والوں میں میں بھی شامل ہوں۔ لیکن خوشی ہوئی کہ مشکور حسین یاد کی ملاقات انہیں یاد رہی اور اس کا ذکر انہوں نے ’’شادم از زندگی خویش‘‘ میں بھی کیا۔ مجھے ان کی خیریت اور ادبی مصروفیات کی اطلاعات اپنے کرم فرما محمود ہاشمی صاحب سے ملتی ہیں۔ انہوں نے ہی رالف رسل سے ان کی خود نوشت سوانح عمری پر دستخط کرا کے مجھے کتاب عنایت فرمائی۔ ڈاکٹر ارجمند آرا کا مضمون ان کی آپ بیتی ’’جوئندہ یابندہ‘‘ میں بھی شامل ہے۔ آپ نے اپنے انٹرویو میں نئے سوالات اٹھائے اور رالف رسل صاحب کے خیالات سے نئی آگہی عطا کی۔ محمود ہاشمی ان دنوں شدت سے بیمار ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ انہوں نے آپ کو ’’گنج گرانمایہ‘‘ کے عنوان سے اپنا مضمون عطا کیا۔ اس کامیاب گوشے کے لیے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پچھلے دنوں میں نے بانو قدسیہ اور غلام جیلانی اصغر پر دو کتابیں تالیف کی ہیں۔ ان کتابوں کے لیے بہت سا مواد مجھے ’’چہارسو‘‘ سے دستیاب ہوا۔ اب غلام الثقلین نقوی۔ فن اور شخصیت زیرِ تالیف ہے۔ اور میں ان پر ’’چہارسو‘‘ کے گوشے سے استفادہ کر رہا ہوں۔ ان کتابوں میں ’’چہارسو‘‘ کے بے شمار حوالے آئے ہیں۔ اور میں تو عرصے سے کہہ رہا ہوں کہ ’’چہارسو‘‘ کے یہ گوشے ادب کی اعلیٰ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اہلِ تحقیق کے کام کو آسان بنا رہے ہیں۔ میں نے اس کا ذکر حال میں اپنے ایک کالم (مطبوعہ نوائے وقت) میں بھی کیا ہے۔ شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو۔

انور سدید (لاہور)

جناب گلزار جاوید

سلام مسنون۔ جب بھی پوسٹ مین ’’چہارسو‘‘ سے نوازتا ہے۔ آپ کی اور ضمیر صاحب کی یاد آتی ہے۔ اس ماہ میں تو ان کا یوم وفات بھی ہوتا ہے۔ یہ آپ کی محبت ہے کہ ہم جیسے لاپرواؤں۔ اور بے ادبوں کو ادب کی خوشبو کے قریب رکھتے ہیں۔ ہر شمارہ پڑھتا ضرور ہوں۔ ارادہ باندھتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ ضرور بھیجوں گا۔ لیکن پھر روزمرہ کی غیر ادبی مصروفیات کا شکار ہو کر عہد شکنی پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ ’’چہارسو‘‘ اپنی سادگی میں بہت پرکار اور پرکشش ہے۔ قدیم و جدید کا حسین امتزاج و خصوصی گوشہ ہر بار بہت ہی پُر مغز ہوتا ہے۔ ایک شخصیت کے قریب لے جاتا ہے۔ اس کے مختلف پہلو قارئین کے سامنے لے آتا ہے۔ میں بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں کہ اس کے لیے آپ کو کتنی محنت اور تگ و دو کرنا پڑتی ہوگی۔ اس بار آپ نے اردو کے ایک انگریز عاشق کی بزم سجائی ہے۔ اردو کے حوالے سے یہ ابتدائی صفحات یقیناً بہت اہم ہیں۔ عبدالعزیز خالد کی نعت ان کے اپنے مخصوص انداز میں ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ افسانوں میں شمشاد احمد۔ رخسانہ صولت۔ راجندر ورما نے متاثر کیا۔ شبنم شکیل اپنے اس شعر سے گھائل کر رہی ہیں۔

نہ جانے زندگی کیوں مجھ سے واپس

مرا ہر اک حوالہ لے رہی ہے

حامدی کاشمیری۔ انوار فیروز۔ پنہاں۔ کرشن پرویز۔ سعید رحمانی۔ لیاقت علی عاصم۔ سید تحسین گیلانی کی غزلیں بہت سی یادیں جگا گئی ہیں۔ بے نظیر بھٹو شہید کے حوالے سے نظمیں آنکھیں نم کر گئیں۔ پرویز مظفر کی نظم ’’ٹھاٹھا کے دروازے پر‘‘ ایک منفرد کوشش ہے۔ 120 صفحات میں آپ نے بہت کچھ ایسا یکجا کر دیا ہے جس میں ندرت بھی ہے اور گہرائی بھی۔

محمود شام (کراچی)

جناب محترم گلزار جاوید صاحب! اسلام علیکم

چہارسو کا تازہ شمارہ مئی جون ۲۰۰۸ء آخر کار آپ نے پکے انگریز رالف رسل صاحب کے نام بطور قرطاسِ اعزاز نکال ڈالا۔ بہت اچھا رہا کہ آخر رالف رسل صاحب نے اردو زبان سیکھنے میں بڑی محنت سے کام لیا اور پھر جب سیکھنے کی حد تک زبان سیکھ لی تو اسے دوسرے انگریزوں کو سکھانے کے لیے بھی بنیادی کتابیں لکھیں۔ مجھے اس سے پہلے بھی رالف رسل کے بارے میں معلوم تھا اور ’’چہارسو‘‘ پڑھ کر مزید معلوم ہوا کہ ان حضرت نے اردو زبان تو سیکھی لیکن جس طرح ہم کوئی غیر زبان سیکھ کر اپنی تخلیقی ادبی صلاحیت میں شعوری یا لاشعوری اضافہ کرتے ہیں یہ حضرت اس طرح کا کوئی اضافہ اپنی شخصیت میں نہیں کر سکے۔ بلکہ اُلٹا اردو زبان بولنے والوں کے بارے میں ان کی خرابیاں بتانے لگے۔ مثلاً اردو بولنے والے سیدھی طرح سادگی سے بات کرنے کے بجائے تکلف سے بات کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے لکھا آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ رسل صاحب فرماتے ہیں اس کی جگہ صرف یہی لکھنا کافی تھا ’’آپ کا خط

ملا''۔۔۔ حالانکہ رسل نے غالب پر کتابیں لکھی ہیں غالب کی غزلوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے پھر غالب کے خطوط بھی پڑھے ہوں گے۔ سادہ عبارت لکھنے کے لئے تو ہمیں غالب کے خطوط بہت ہیں۔ میں نے اسی مغالطے میں کہ رالف رسل صاحب نے غالب کو بہت پڑھا ہے ان کو اپنی کتاب ''غالب بوطیقا'' بھیجی تھی مگر ان حضرت نے تو غالب بوطیقا کا صحیح مطلب سمجھنے کے بجائے یہ سمجھا کہ میں اپنی ''غالب بوطیقا'' کو ارسطو کی بوطیقا سے زیادہ اونچی کتاب سمجھتا ہوں اور اُن سے ان کی داد چاہتا ہوں۔ لاحول ولاقوۃ۔ معاف کیا کہ یہ حضرت بہت ہی درمیانہ ذہن کے آدمی معلوم ہوتے ہیں اس پر وہ جو مشہور ہو گئے ہیں شہرت پا گئے ہیں تو اپنے بارے میں اس مغالطے کا شکار ہیں کہ ان سے ہر کوئی اپنی تعریف کا متمنی ہے اس لئے اس کے بارے میں پہلے ہی سے تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر انہوں نے تعریف نہ لکھی تو وہ آدمی ناراض ہو جائے گا میں اُن سے ناراض نہیں ہوا تھا بلکہ انہیں حسبِ عادت صاف گوئی سے جواب دیا تھا۔ بہر حال آپ نے اچھا کیا کہ اُن کے لیے چہارسو کا گوشہ مختص فرمادیا۔ اچھا ہوتا اگر غالب کے اشعار کے انگریزی میں اُن کے ترجمے بھی شائع کر دیتے۔

مشکور حسین یاد (لاہور)

برادرم جناب گلزار جاوید صاحب۔ السلام علیکم

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ پہلے ''بخیر و عافیت'' محاورہ کے ذیل میں آتا تھا۔ اب یہ رسمی سے زیادہ حقیقی دعا ہے۔ ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ رالف رسل پر بہت اچھا مواد جمع کرنے پر مبارکباد۔ رالف رسل نے اردو کے لیے بہت کام کیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ پروفیسر احمد علی نے غالب کی شاعری کے انگریزی تراجم کی ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس کی رسم اجراء پر رالف رسل نے پروفیسر احمد علی کے ترجمہ کی بعض بہت دلچسپ اغلاط کی طرف اشارہ کیا تھا۔ حیرت ہوئی تھی کہ پروفیسر احمد علی بھی اردو محاورہ کو انگریزی میں منتقل کرتے وقت لفظی ترجمہ کر گئے۔ خیر پروفیسر احمد علی کے ترجمہ میں صرف چند غلطیاں ہی نہیں تھیں بلکہ یہ کوشش مجموعی طور پر بہت اچھی تھی۔ آپ نے ٹائٹل پیج کے اندرونی صفحہ پر ایک سطر تحریر کی ہے پوری کوشش تھی کہ یہ میری نظر سے چوک جائے لیکن میں ایک ایک سطر پڑھتا ہوں۔ آپ کی تحریر کی ایک سطر بھی پڑھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کو یاد نہ کروں۔ خط لکھنے میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔ اب دیکھیے آپ نے بھی ایک سطر لکھی ہے لیکن یہ خط سے بھی زیادہ ہے چونکہ یہ میری ''چہارسو'' سے دلچسپی کا امتحان بھی تھا۔ آپ دوستوں کی محفل میں یاد آتے ہیں۔ ویسے بھی کبھی کبھی ''چہارسو'' کے پچھلے شماروں پر نظر جاتی ہے تو میں دوبارہ پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ آپ کے جریدہ کا ہر شمارہ ''ریکارڈ'' ہوتا ہے۔ دست بہ دعا ہوں کہ آپ تندرست رہیں اور یہ ضروری کام جاری رکھیں۔ آمین

محمد علی صدیقی (کراچی)

گلزار بھائی' خوش رہو

چہارسو کی جون باصرہ نواز ہوا۔ اس مرتبہ آپ نے محترم رالف رسل صاحب کو قرطاسِ اعزاز پر لا کر ایک اور ستارہ چہارسو کی محفل میں ٹانک لیا۔ کس قدر حیران کن بات ہے کہ ایک شخص اردو زبان ''حاصل'' کرنے میں اس حد تک محو ہو جائے کہ اپنا سب کچھ تیاگ کر جی جان سے اسے سیکھنے کے لیے کوشش کرے۔ اُن پر حالات پڑھکر بے حد رشک ہوتا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو کسی زبان سے اس حد تک عشق کرتے ہیں۔ براہ راست میں آپ نے جوان کا انٹرویو لیا وہ بھی خوب ہے۔ زندگی کا نغمہ جس میں رسل صاحب نے اپنے اردو کے سفر میں تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ تفصیل پڑھتے پڑھتے حیرانی ہوتی رہی۔ باقی مضامین جوان کے تعلق سے ہیں۔ خوب ہیں جناب محمود ہاشمی صاحب کا مضمون گنج گراں مایہ پڑھتے پڑھتے ہنسی بھی آتی رہی اور ڈاکٹر ارجمند آرا کا جو کنمہ پائندہ پسند آیا۔ شادم از زندگی خویش جناب رالف رسل طویل ہونے کے باوجود پسند آیا۔ صاف گوئی سے نقادوں کے بارے میں لکھا تو بہت اچھا لگا۔ خاص طور سے مشکور حسین یاد کے بارے میں محمود الحسن کا طلوعِ صبح خوب ہے

میرے رسول کا پیغام جانفزا لیکر
خدا کرے کوئی بے تیغ و بے سناں آئے

نند کشور وکرم کا آخری فیصلہ' شمشاد احمد کا مریض' ڈاکٹر عمران مشتاق کا کھونٹا' راجندر ورما کا بلاوڑ' جاوید اختر چوہدری کا بانصیب پسند آئے اور آپ کا پشتنی نواب بھی اچھا ہے۔ احمد مجید کا شور' دیپک کنول کا ناتی خیروالی' نوید سروش کا فراز' انور سدید صاحب کی غزل کے تمام اشعار اچھے لگے۔ ہر ایک شعر اپنے آپ میں ایک درس دیتا ہے۔ ڈاکٹر آفاقی کی غزل کے اشعار اچھے لگے

نتیجے پہ رکھو نہ اپنی نظر
فقط کارِ دشوار کرتے رہو

کم و بیش تمام غزلیات اچھی لگیں۔ جناب امجد اسلام امجد کی کینسر کی کہانی اچھی نظم ہے۔ بے نظیر بھٹو پر ساری نظمیں ایک سے ایک اچھی اور دل کو چھوتی ہے۔ مگر رخصتی کچھ زیادہ ہی پسند آئی۔ پرویز مظفر کی پاٹھ شالا کے دروازے پر اچھی نظم ہے خیال آفاقی کی بار رہا پسند آئی شاہد عزیز کی تمہارے ساتھ پسند آئی۔

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی بھارت)

گلزار صاحب' تحیتیں۔

رالف رسل صاحب سے متعلق گوشہ دیکھ کر حد درجہ خوشی ہوئی۔ عموی طور پر ہمارے ہاں انھیں ''Three Mughal Poets'' اور ''Ghalib: Life and Letters'' کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ یا اس حوالے سے کہ انھوں نے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز، یونیورسٹی آف لندن میں تا دیر اردو کی مشعل جلائے رکھی۔ اب ''چہارسو'' کی معرفت اس

ماہنامہ ''روزگار'' کی سی کو قدرے قریب سے اردو دیکھ پائے گی۔ مجھے 1972ء میں پنجاب یونیورسٹی اور پنجاب کالج' لاہور کے جشن صد سالہ کے موقع پر رالف رسل صاحب سے کسی قدر قریب رہنے کا شرف حاصل ہے۔ وہ یوں کہ استاد محترم ڈاکٹر عبادت بریلوی نے غیر ملکی مندوبین کی رہنمائی اور خدمت گزاری کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی تھی اس کے تحت رالف رسل صاحب کی اردلی میں رہ کر ان کی ضروریات کا خیال رکھنا تھا۔ ہمارے لیے ہدایات یہ تھیں کہ مہمان اگر لاہور کی سیر کے لیے از خود نکلنا چاہیں تو ساتھ رہو اور اس بات کا خاص خیال رکھو کہ صاف ستھرا اور ترقی یافتہ لاہور ہی انھیں دیکھنے کو ملے۔ لیکن میں نے دل ہی دل میں کچھ اور ہی طے کر رکھا تھا اور موقع کی تاک میں تھا۔ مجھے وہ سہ پہر کبھی نہ بھولے گی، جب ایک سیشن کے اختتام پر رالف رسل صاحب میری ہمراہی میں اولڈ کیمپس سے بھاٹی دروازہ کی طرف نکل لیے۔ ہم سینٹ ہال سے چہل قدمی کرتے ہوئے چیٹر جی روڈ سے بھاٹی چوک پہنچے تو رالف رسل صاحب کے سامنے ایک نیا لاہور شہر تھا۔ مصنوعی تام جھام اور آسائشوں سے خالی، عام لوگوں کا لاہور۔ بھاٹی چوک سے ہم سرکلر روڈ پر ہو لیے۔ انھیں ''نیا ادارہ'' اور رسالہ ''سویرا'' کا دفتر دکھایا اور اُس کے بعد انھیں انارکلی بازار میں احسان دانش کی رہائش گاہ تک لے گیا۔ ہم نے انارکلی بازار میں کھڑے کھڑے اُس بوسیدہ مالے پر نگاہ ڈالی جہاں احسان دانش کی رہائش تھی۔ دفتر ''نقوش'' کے سامنے سے ہو کر انھیں ''نگینہ بیکری'' دکھائی، جہاں ایک زمانے میں علامہ اقبال اور نیاز مندانِ لاہور کی نشست رہتی تھی۔ بعد میں احسان دانش اور حسن بخت بھی وہاں تادیر بیٹھا کیے۔ اس مختصر سی چہل قدمی میں جو دو چار مقامات میں انھیں دکھا پایا، اس پر میرے لڑکا نیا ترقی پسندانہ دیا زیں رہا۔ رالف رسل صاحب کا کھرا پن اور دوٹوک انداز ویسا ہی ہے جو اڑتیس برس قبل تھا۔ ''شادم از زندگی خویش'' از رالف رسل میں مشکور حسین یاد صاحب سے متعلق اس کا مختصر سا لٹریچر تو آپ ملاحظہ کر ہی چکے۔ ڈاکٹر ارجمند آرا کا مضمون کمال کا ہے۔ آخر میں رالف رسل صاحب سے معذرت' اس حوالے سے کہ یہ خط تحریر کرتے وقت ایک مغل زادہ بھی ان سے عقیدت اور قلمی لگاؤ کے زیرِ اثر غلام ہندوستانیوں والی اردو لفظیات سے نہ بچ سکا۔

مرزا حامد بیگ (لاہور)

عزیز بھائی گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم

''رالف رسل'' کے نام ''قرطاسِ اعزاز'' چھاپ کر آپ نے مجھے اب سے تیس سال پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اس زمانے میں ان کے کارنامے نہ صرف ادبی جریدوں کے زینت بنا کرتے تھے بلکہ ان کی اردو سے محبت نے اردو والوں میں انھیں اس دور کا مرد مجاہد بنا دیا تھا اب ''چہارسُو'' میں انھیں تفصیل سے متعارف کروا کر آپ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو کھوج پر کھکا کھوجی ثابت کیا ہے۔ ''زندگی کا نغمہ'' سے لے کر ''شادم از زندگی خویش'' پڑھ چکا ہوں اور اردو کے اس شیدائی کو اس کی عمر کے نوے (90) برس میں کافی سے زیادہ آپ کی بدولت جان چکا ہوں۔ اللہ رالف رسل کو ان کی صحت بخش توانائیوں کے ساتھ تادیر سلامت رکھے' آمین! افسانوں میں یوں تو آپ کی روایت رہی ہے کہ ہر شمارہ ایک سے ایک فن کاری کا نمونہ ہوتا ہے چہ جائے کہ آپ کی اپنی تخلیق بھی اس میں سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے لیکن اس بار ڈاکٹر عمران مشتاق کے ''کھونچ'' نے تو کمال کر دیا صرف دو صفحات پر محیط اس افسانے میں کیا نہیں ہے؟ مغرب کی مادر پدر آزاد زندگی اور اس سے پیدا ہونے والی بے راہ روی کو جس کمالِ فن سے افسانہ نگار نے کہانی کی آخری عبارت میں منکشف کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے پھر مزہ تو یہ رہا کہ جنس کا موضوع برتنے کے باوصف ڈاکٹر صاحب نے بھرپور مزاحمت سے کام لیا جو یقیناً اردو افسانے کی تاریخ میں یاد رکھے جانے کے قابل ہے۔ قابلِ تحسین ہے مصنف اور قابلِ مبارکباد آپ! تازہ تصانیف کا تعارف محترمہ عطیہ سکندر علی بہت ہی منفرد طریقے سے کرواتی ہیں اور یہ طریقہ اتنا منفرد ہوتا ہے کہ اس شمارے میں ناصر بغدادی کی کتاب 'مغرب تنقید' کو انہوں نے اس ڈھنگ سے متعارف کروایا ہے کہ بے ساختہ واہ اس کے حصے میں آ ہی گئی۔ پروفیسر زبیر کنجاہی کا ممنون ہوں جنہوں نے میری غزل کا ایک شعر بھی پسند فرمایا اور ان کی نظم پر میری پسندیدگی کو شکریے کا مستحق جانا اس بار بھی ان کی نظم ''آوارہ سفر کا انتظار یہ'' ہمارے شہروں کے المیے کو بحسن و خوبی پیش کر رہی ہے۔

غالب عرفان (کراچی)

عزیزم گلزار جاوید السلام علیکم!

چہارسُو کی عنایت کا شکریہ' حسبِ روایت پرچے میں وہ سب کچھ ہے جو ایک ادبی جریدے میں اصولاً ہونا چاہیے، رہا نثر و نظم کا معیار تو اس میں ولیت پسندی اپنی اپنی کو دی جانی چاہیے کیونکہ ہمیشہ اور خصوصاً دورِ حاضر میں ادب کی کسوٹی یہی ہے مجھ کو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں۔ اکثر مراسلات میں یہی تاثر نمایاں نظر آتا ہے بعض اشعار و تخلیقات پر اپنی پسند کے حوالے دیے جاتے ہیں تو اس گمان کو تقویت ملتی ہے کہ ہم کیوں وہ بات کہتے ہیں جو نہیں کہنا چاہیے اور وہ بات نہیں کہتے جو ہمیں کہنی چاہیے بلکہ شاید یہ کہنے کو جی نہیں کرتا ہے۔ بہر حال یہ مصلحت کوشی ہر دور کا ایک المیہ رہا ہے اس بار مشہور انگریز اردو داں رالف رسل کو قرطاسِ اعزاز کے لائق سمجھا یا قرطاسِ اعزاز رسل صاحب سے منسوب کر کے آپ نے اپنے اس سلسلے کو مزید تنوع بخش دیا ہے تاہم رالف رسل کی تمام گفتگو میں کہیں بھی ایسا موقع نہیں ملا جہاں دل ٹھہرتا، ان کی ایک بات بھی دل کو اپیل نہ کر سکی، وہ پہلے بھی کمیونسٹ تھے' اب بھی ہیں انکی اس بات میں سوائے ابہام کے کچھ نہیں، اگر ان کے نزدیک کمیونزم کی تعریف بقول ان کے ناانصافی کے خلاف جدوجہد ہے تو دنیا کا شاید ہی کوئی نظریہ اور عقیدہ ایسا ہو جس میں ناانصافی کو ناپسندیدگی سے نہ دیکھا گیا ہو۔ اسی طرح قیامِ پاکستان کے حوالے سے ان کا یہ کہنا کہ بنگالی مسلمان شروع میں ہی اپنے لئے ایک الگ

ریاست کی خواہش رکھتے تھے، رالف رَسل صاحب کی تاریخ سے عدم واقفیت کا ثبوت ہے۔علامہ اقبال کے بارے میں بھی رسل کی رائے تاریخ سے عدم واقفیت کا ثبوت ہے۔ان کی رائے واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ وہ علامہ کی فکر کے قریب بھی نہیں بھٹکے، وہ کہتے ہیں علامہ اٹھارویں صدی میں رہ رہے تھے، کاش وہ جہان اقبال کی مفصل سیر کر کے دیکھتے تو انہیں اندازہ ہوتا اقبال اپنے ہزار ہے سے بھی آگے کی بات کرتے۔سنائی دیتے ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

صرف اسی سادہ سے شعر کی کسی سے تشریح کر کے غور فرمائیے تو اقبال کو تاریخ کے حوالے سے ''بیک ورڈ'' نہ کہتے۔تاہم ہر شخص اپنے ذہنی تجربات اور فکری بساط کے مطابق سوچتا اور بات کرتا ہے۔رالف رَسل صاحب کے ذہن کو بھی محض جنس نے محصور کر رکھا ہے۔یہی وجہ ہے انہیں بازار حسن اور امراؤ جان ادا ہی اپنی طرف متوجہ کر سکی۔اقبال کو سمجھنے کے لیے تو کسی اور ہی جنس گرانمایہ کی ضرورت ہے جس سے رالف رسل صاحب محروم نظر آتے ہیں۔

خیال آفاقی (کراچی)

جناب گلزار جاوید۔سلام مسنون

''چہارسو'' ملا۔شکریہ۔یکسوئی سے پڑھا۔آپ کے لکھنے کی اب ہر طرف دھوم ہے جناب ''رالف رسل'' کا ''قرطاس اعزاز'' چھاپ کر آپ نے پھر ثابت کر دیا کہ آپ کی نظر سے کوئی چھپا ہوا نہیں۔آپ کی آنکھ صرف کھلی ہوئی نہیں بلکہ دیکھتی بھی ہے اور پرکھتی بھی! ''رسل'' نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے یہ قرطاس اعزاز ان کا حق تھا۔جو آپ نے نہایت خوبی سے ادا کر دیا ہے۔اور اب یہ کہنا ''ناحق'' ہوگا۔

حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

غالب نے یہ مصرع یوں ہی کہا تھا کہ ''یہ'' غلط ہے ''یوں'' ٹھیک ہے۔کم از کم مجھے یہی صحیح لگتا ہے یعنی لگا ہے!

دل نواز دل (لاہور)

مدیر محترم۔سلام و رحمت

''چہارسو'' کے پیش نظر شمارے کی خصوصیت،اہمیت اور انفرادیت ''قرطاس اعزاز'' کو کسی مستشرق سے منسوب کرنا ہے جو محترم رالف رسل ہیں اور اپنے جداگانہ طرز قول و فعل سے اپنی مثال آپ ہیں اور دوسروں کے لیے گائیڈ لائن بھی۔ان سے متعلق جملہ تحریروں۔''زندگی کا نغمہ'' سے لے کر ''شادم از زندگی خویش'' سے یہی احساس تقویت پاتا ہے کہ وہ اردو زبان کی ترویج و تشہیر کے لیے کس قدر مستعد،منظم اور فعال رہے ہیں نیز تخلیقی سطح پر ان کی مشترکہ و انفرادی ادبی خدمات و تصانیف اپنا الگ سے مقام و مرتبہ رکھتی ہیں۔تراجم و تحقیق،قواعد و ضوابط انشا کے بارے حد درجہ محتاط اور باریک بین طریق کار اپناتے ہیں۔شخصی و لسانی زاویہ نظر سے بھی نہایت فطری،لچکدار اور بے تکلف دوستانہ اسلوب کے قائل ہیں جس میں تخلیق سے تخلیق کا رنگ،سب کو احاطۂ رسائی میں رکھنے کی خواہش مند رہتے ہیں اسی لئے اُن کا حلقۂ احباب تدریسی و تخلیقی سطح پر مختلف اہم شخصیات سے رہا۔اور خوبصورت بات یہ کہ اپنے اچھے روابط کو بہر طور برقرار رکھتے ہیں جو وسیع النظری و کشادہ دلی کے غماز ہیں۔عصر رواں کی نہایت اہم علمی و ادبی شخصیت سے متعلق چیدہ چیدہ تحریروں کو قارئین کے لئے یکجا پیش کرنا ایسی مساعی جمیلہ ہے جو ادارہ چہارسو کا اعزاز و افتخار تسلیم کیا جا چکا ہے۔اور جس کی افادیت آنے والے ادوار میں مزید فزوں تر ہوگی۔! اب کچھ کہانیوں سے متعلق۔جوائنٹ فیملی سسٹم کا منتشر ہونا،مشرقی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کا ردعمل۔''پناہ گاہ'' کے لیے توسیع کا۔آخری فیصلہ کرنے میں معاون ثابت ہوا۔'سیڑھیاں' میں بھی رفاع عامہ کے لیے مختلف اداروں کے بعد 'اولڈ ایج ہوم' کا قیام عمل میں لانا بدلتی قدروں سے ہی منسلک ہے۔البتہ شروعات اپنے کنبے سے کرنا اسے زیادہ مؤثر بیانیہ بنا گیا۔ریشمی بساط کا 'بلاوز' میں منقلب ہوا۔جدیدیت کے نام پر طرز بیاں اور بقول غالب۔

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا۔۔۔۔

آج کل بعض کہانیاں ایسی بھی لکھی جا رہی ہیں جن میں کہانی پن کے باوجود کسی مرکزی کردار پر فوکس کیا جاتا ہے جس سے مکمل خاکہ ابھرتا ہے یوں دو اصناف مشترک ہو کے افسانہ نما خاکہ یا خاکہ نما کہانی بن جاتے ہیں۔چنار کے درخت کا استعارہ۔'نانی خیروالی'۔تمام تر جزئیات کے ساتھ رواں دواں اچھی پیشکش ہے۔خواب خواب زندگی ہو یا زندگی زندگی خواب خواب اور حقیقت،حیات بعد از ممات،موجودہ حیات کا سیاق و سباق،ایسے موضوعات ہیں جن پر مسلسل مطالعہ کرتے رہنے اور سوچ بچار سے یعنی ذہن حتمی طور پر آگہی نہیں پاتا۔یہ زندگی حیات ہے یا موت ہے حیات۔عمریں تباہ ہوتی ہیں اسی اشتباہ میں۔کبھی کبھی فیصلے کے لئے مجوزہ دو جہتوں کو چھوڑ کے تیسری جہت کو اپنانا کارگر رہتا ہے۔'تر از' کو مختلف موڑ دینے کا باعث یہی تکنیک ہے۔'پگلی' نواب کی کہانی کرداروں کے جاہ و حشم،مکالموں کے کر و فر اور تجمل و تنوع کی شان و شوکت کے گرد گھومتی ہے۔اس پس منظر میں جملہ نوابانہ روایات معیارات اور لوازمات کے ساتھ نواب مرزا فراست بیگ کو حقیقی حقدار اور اہل ثابت کرنا مقصود تھا مگر پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔جبکہ آخر آخر میں بیگم حشمت کا ادھورا جملہ قاری کے لیے تحیر و تجسس کا اک جہاں چھوڑتے ہوئے اسے از سر نو بہت کچھ سوچنے پہ مجبور کر دیتا ہے۔۔۔۔محترمہ بینظیر بھٹو کے لئے منظوم خراج عقیدت اس شمارے کی شاعری کا خصوصی گوشہ تھا۔دیگر نظمیں بھی بالخصوص 'کینسر کہانی' نظم بہت آسان تھی پہلے 'بار ہا' منٹو کی یاد میں 'عروس فن' آوارہ سفر کا انتظار یہ' زوال' تمہارے ساتھ'اپنے موضوعات کے حوالے سے مؤثر اظہاریے لگے۔'رنج سے خوگر' میں ممتاز احمد خان صاحب کا تعارف نامہ ان کے اوصاف و شعری خصوصیات' کے ساتھ خاصے کی تحریر رہی۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب

السلام علیکم۔ ''چہارسو'' آتا ہے تو دو دن میں ختم ہو جاتا ہے۔ جتنے دن ''چہارسو'' کا انتظار ہوتا ہے اتنے دن پڑھنے میں نہیں لگتے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر بار ''قرطاسِ اعزاز'' پڑھنے والا ہوتا ہے۔ ہم تو سنتے آئے تھے کہ اردو لکھنے والا ایک ہی انگریز تھا جو غالب کا شاگرد تھا۔ آپ نے ایک اور نکال دکھایا۔ بہرحال ''قرطاسِ اعزاز'' میں ''براہ راست'' اور ''شادم از زندگی خویش'' پڑھنے والی تخلیقات ہیں۔ اس دفعہ آپ کا افسانہ ''پشتنی نواب'' بہت مختصر مگر خاصا کامیاب ہے ''رس رابطے'' اور چند ایک افسانے بہت عمدہ اور دلچسپ ہیں۔ آپ کے انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ اللہ کرے زورِ انتخاب اور زیادہ۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

محترمی و مکرمی گلزار جاوید، سلام و رحمت!

چہارسو کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ قرطاسِ اعزاز اردو کے ایک ممتاز خدمت گار رؤف رسل کے نام۔ بہت خوش آئند اور قابلِ تحسین اقدام ہے چہارسو کی روایت کے عین مطابق موجودہ شمارے کا انتساب معنویت سے ملو ہے اس میں ایک پوری کتاب سمٹ آئی ہے شمارے کی مسلسل ترسیل کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ آپ کی افسانہ نگاری کے حوالے سے میں نے ایم فل اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے لیے ترتیب دیے گئے باب، اردو ادب کا پاکستانی دور، میں اپنی رائے کا اظہار کردیا ہے۔ کتابی شکل میں آجائے تو پیش کروں گا۔ چہارسو کی اشاعت میں تسلسل اور اس کے وقیع مشمولات کے حوالے سے اب تو کسی جریدے کی جانب سے آپ کی خدمت میں قرطاسِ اعزاز پیش کیا جانا چاہیے۔

غفور شاہ قاسم (میانوالی)

مکرمی تسلیم!

چہارسو کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اسد محمد خان پر آپ نے بہت اچھا گوشہ ترتیب دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں جو گہرائی اور وزن ہے وہ ہمیں ہر دور کی حیثیت رکھتا ہے آج کل کے بہت کم افسانہ نگار کسی خاص افسانے میں اتنی گہرائی تک اترنے کی ہمت مہیا کرپاتے ہیں۔ اس کا تازہ ثبوت ان کا افسانہ ''ئی دادا'' ہے جس کی نہ صرف بُنت بہت مضبوط ہے بلکہ آخری حصہ بھی ایک نئی تہذیب فکر کا مظہر ہے۔ باقی معاملہ آپ کے دلچسپ اور پُر خیال انٹرویو نے پورا کردیا ہے۔ قاری شاہ نے جو خطوط مرتب کیے ہیں ان پر سند اور تاریخ نہ ہونے سے عجب طرح کا التباس ہوتا ہے۔ ان خطوط میں تاریخ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ اسد محمد خان کی نظموں میں کسی خاص تخلیقی قوت کا احساس نہیں ہوتا۔ بس صرف ایک نظم ''تو پھر یہ دیکھا'' مجھے پسند آئی۔ ممکن ہے یہ میری نظر ہی کا قصور ہو۔ صفحہ چار پر اسد محمد خاں نے WITH DUE APOLOGY لکھا ہے۔ کیا وہ اس کو معذرت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے تھے؟ انگریزی سے یہ مرعوبیت کہاں تک ہمارے ذہنوں سے چپکی رہے گی۔ محسن احسان میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ بہت خوبصورت شعر نکالا ہے۔

خورشید نہ مہتاب ، نہ جگنو نہ ستارہ
جینے کی ہوس دل میں لئے مر گئے ہم بھی

مشکور حسین یاد کی بہت لمبی ردیف ''کی آنکھوں میں آنسو ہیں'' والی غزل کوئی تاثر نہیں چھوڑ سکی۔ میں نہیں سمجھتا کہ غزل میں اگر صرف قافیہ اور ردیف ہی ہو اور باقی کچھ نہ ہو تو اس سے کوئی اچھی غزل نکل سکتی ہے۔ اساتذہ نے تین الفاظ سے زیادہ لمبی ردیف کو مستحسن نہیں جانا ہے۔ شبنم شکیل، مامون ایمن، کرشن کمار طور اور ڈاکٹر انور سدید کی غزلیں خوب بلکہ بہت خوب ہیں۔

خدا اب ہے خدا پہلے نہیں تھا
تو کیا اچھا برا پہلے نہیں تھا

اس شمارے میں اور بھی بہت کچھ لائق مطالعہ ہے۔ چہارسو واقعی دورِ حاضرہ کا ایک دلچسپ اور اہم ادبی رسالہ ہے۔

نامی انصاری (کانپور، بھارت)

گلزار جاوید صاحب مکرم! السلام علیکم

اس بار بہرجہت تخلیق کار اسد محمد خان کے نام ''چہارسو'' کا قرطاسِ اعزاز قابلِ قدر اور قابلِ مطالعہ ہے۔ اسد محمد خان عالمی شہرت یافتہ تخلیق کار ہیں۔ ان کا لکھنے کا اپنا ایک مخصوص سٹائل ہے۔ ان کی نظمیں 'گیت' فسانے' ڈرامے' زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان ہیں۔ آپ کی محنت اور کوشش کے ساتھ ساتھ ادب سے بے لوث محبت ہے کہ آپ ایسے ایسے گوہر ہائے گراں مایہ تلاش کرکے ان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آمین

سجاد مرزا (گوجرانوالہ)

ڈیئر گرامی قدر گلزار جاوید صاحب السلام علیکم

''چہارسو'' جنوری فروری ۲۰۰۸ء نظر نواز ہوا۔ شکریہ۔ شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۰۷ء شائع ہوا ہے کہ نہیں مجھے پتہ نہیں۔ اسلئے کہ مجھے تو نہیں ملا۔ چہارسو جب بھی آتا ہے میں سارے کام چھوڑ کر دو گھنٹے مسلسل پڑھتا ہوں۔ میری بیگم صاحبہ کھانا نکال کر کھانے کے لئے بُلا بُلا کر تھک جاتی ہیں اور بُجھ جاتی ہیں اور بچوں سے کہتی ہیں بچو چلو ہم ہی کھا لیتے ہیں لگتا ہے ماہنامہ چہارسو آ گیا ہے۔ اب آپکے پاپا گھنٹہ دو گھنٹوں تک کھانا نہیں کھائیں گے۔ یہ شمارہ بھی ہر شمارے کی طرح شاہکار ہے۔ رنگِ صحرا میں سعید رحمانی کا یہ حمد یہ شعر بہت پسند آیا حقیقت جو ہے۔

علم والے اگر ہو جائیں عمل سے خالی
پھر تو جاہل کو سردار بنا دیتا ہے

خورشید انور کی نعت کا یہ شعر بھی خوب ہے۔

کہاں سے لفظ وہ لاؤں بیاں کروں جن سے
برس رہی ہے جو دل پر گھٹا مدینے کی

حصہ منظومات میں مامون ایمن، انورسدید، منظرحنفی، گلشن کھنہ، غالب عرفان، سیفی سرونجی اور محسن جلگانوی وغیرہ کی غزلیں پسند آئیں۔ سبھی افسانے مقالے مضامین اچھوتے اور منفرد انداز کے ہیں بہت پسند آئے اسی لیے چہارسو کی گونج ساری دنیا میں گونج رہی ہے یہ سب آپ کی محنت اور لگن ہے آپ اردو کے حقیقت میں عاشق صادق ہیں۔ چہارسو کا ہر شمارہ ایک ادبی دستاویز ہوتا ہے اسی لئے تو میں بھی اس کے عشق میں گرفتار ہوں۔

حفیظ انجم (کریم نگری بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب

آداب وسلام

اپنے اسلوب کے مطابق سب سے پہلے معذرت اور آپ جانتے ہیں یہ معذرت کس لئے ہے ایک وقفے کے بعد سکون سے پھر رسالہ پڑھنے کے قابل ہوا ہوں اور اس بار چہارسو پڑھ کر زیادہ مزہ آیا۔ فسانے کا حصہ ہمیشہ کی طرح زیادہ اچھا لگا۔ اسد محمد خاں صاحب کے کسے بندھے اور ''مسلح'' جوابات دلچسپ ہیں۔ ان کی نظم ''تو پھر یہ دیکھا'' بہت اچھی لگی۔ افسانوں میں اصغر ندیم سید، سلطانہ مہر، مشتاق اعظمی اور ڈاکٹر رینو بہل کی کہانیاں خوب ہیں۔ غزلوں میں شبنم شکیل، ماجد سرحدی، خورشید انور رضوی، ڈاکٹر محسن جلگانوی، اختر رضا سلیمی، عارف شفیق اور قیصر نجفی کی غزلیں زیادہ توانا ہیں۔ عارف شفیق صاحب کی غزل اپنے اسلوب میں منفرد یعنی خاص عارف شفیق کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ قیصر نجفی صاحب کی غزل دوسروں سے مختلف لگی۔ شاید چوتھے شعر میں کتابت میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے اور وہ تو کھیل کا حصہ ہے اس بار کے چہارسو میں ایک کمی تھی اور وہ تھا آپ کا افسانہ لہٰذا اگلے شمارے میں اس کو پورا ہوتے دیکھنا ضرور چاہوں گا۔

فیصل عظیم (کنیڈا)

برادرم گلزار جاوید' السلام علیکم ورحمتہ اللہ

چہارسو ملا' گویا روح کی غذا ملی۔ نہ جانے کیوں اس بار کاتب صاحب نے نظم کے دوسرے بند کے پہلے، دوسرے اور پانچویں شعر میں لفظ آئے کے بجائے آئیں کر دیا ہے۔ چہارسو کے آئندہ شمارے میں اس کی تصحیح فرما دیں تو عنایت ہوگی۔

محمودالحسن (راولپنڈی)

برادرمحترم گلزار جاوید صاحب سلام ورحمت،

رالف رسل کے گوشے کی اشاعت پر خوشی ہوئی ہے بلاشبہ اردو زبان و ادب کے حوالے سے ان کی خدمات قرطاسِ اعزاز کی مستحق تھیں۔ اور آپ نے بجاطور پر اس استحقاق کا عملاً اعتراف کیا ہے' 'براہ راست'' رالف رسل کی صاف گوئی کی دستاویز ہے۔ انہوں نے کسی بھی حوالے سے لگی لپٹی سے کام نہیں لیا ہے۔ حتٰی کے کمیونزم سے اپنی وابستگی میں اس نظریاتی تفاخر کا اظہار کیا ہے۔ جس کا کمیونزم کے زمانہ عروج میں کرتے تھے۔ مرزا غالب نے شاید ایسے ہی کھلے اخلاص کے لئے کہا ہے

وفا داری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

محمود ہاشمی (برمنگھم) کا مضمون ''گنج گرانمایہ'' رالف رسل کی برطانیہ میں اردو زبان کی ترقی وترویج کے سلسلے میں کاوشوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر ارجمند آرا (دہلی) کا مضمون ''جو کہدیا بندہ'' رالف کے کردار و شخصیت کو سمجھنے میں معاون ہے' 'شادم از زندگی خویش'' کے عنوان سے مضمون کو رالف رسل کی اجمالاً خود نوشت کہا جا سکتا ہے۔ اس مضمون کی نمایاں خوبی عنوان میں پوشیدہ ہے۔ ان کا رجائیت پسندانہ(Optimistic) رجحان طبع اچھا لگا ہے۔ اس مضمون میں بھی انہوں نے حق گوئی و بیباکی سے کام لیا ہے اور زبان، ادب، سیاست، تہذیب، تاریخ غرض ہر موضوع پر بلاتکلف اظہار خیال کیا ہے۔ محمودالحسن (راولپنڈی) کی نظم 'طلوع صبح'' کو مسدس حالی 'مدوجزر اسلام'' کی تلخیص کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ عبدالعزیز خالد کی شاعری خصوصاً نعت نگاری اس معیار و سطح پر ہے۔ جہاں تخلیق ستائش کی محتاج نہیں رہتی۔ انہوں نے ''حافظ حافظ'' میں تضمین کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ تضمین اردو کی معدود کے چند بہترین تضمینوں میں سے ایک ہے۔ عشرت ظفر کی نعت پڑھتے ہوئے نعت کے ایک نئے لہجے کا احساس ہوتا ہے۔ سعید رحمانی (کٹک، بھارت) کی نعت بھی خوب ہے۔ یہ نعت زبان و بیان میں تازہ کاری کا احساس دلاتی ہے۔ نندکشور وکرم کا افسانہ 'آخری فیصلہ'' ہماری تہذیبی وسماجی اقدار کے زوال کا مرثیہ ہے اور آج زمانہ ماں باپ سے، ان کے دست دعا سے تخلیق ہونے والی اولاد کے رویّوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اُن کا کمال فن یہ ہے کہ انہوں نے اپنے طنز یہ لہجے کو کہیں بھی تلخ نہیں ہونے دیا ہے اور سطحی جذباتیت کے بجائے حقیقی احساسات وجذبات کو زبان دی ہے۔ اصلاحی افسانوں میں خود کو مصلح بننے سے بچانا ایک دشوار گزار کام ہے۔ نندکشور وکرم اس مشکل مرحلے سے بہ آسانی گزر

گئے ہیں۔ اب یہ اعتراف کر شمشاد احمد ایک صاحب طرز افسانہ نگار ہیں، ایک عجیب سا اعادہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ اعتراف نہ بھی کیا جائے، تو بھی ان کا افسانہ پڑھنے کے بعد قاری کو جو پہلا احساس ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ انہوں نے اسلوبیاتی سطح پر محاکات (Imajory) کو جن فنی محاسن کے ساتھ برتا ہے وہ انہیں اپنے معاصرین میں ممتاز و میّز کرتے ہیں۔ خاص کر ان کا لسانیاتی نظام ایک نئے جہان فسانہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ پیش نظر فسانہ ''مریض'' کا ٹریٹمنٹ اور انجام خصوصی داد کے مستحق ہیں۔ رخسانہ صولت کا افسانہ ''وقت کی مٹھی'' کہانی کے پس منظر اور پیش منظر دونوں کو مؤثر انداز میں سامنے لاتا ہے۔ اس فسانے میں مزدور کی تحلیل نفسی بڑی مہارت سے کی گئی ہے۔ انجام بھی افسانوی ہے۔ البتہ کہانی میں زمان و مکان کی تبدیلی کا احساس اجاگر نہیں کیا گیا۔ نیز کہانی کا کلائمکس build کرنے پر توجہ نہیں دی گئی ہے۔ یٰسین احمد کا افسانہ ''سیڑھیاں'' ایک بیانیہ ہے جس میں کہانی سیڑھی کے steps کی طرح آگے بڑھتی ہے البتہ ایک ایسے انجام پر منتج ہوتی ہے جس کا پہلے سے ادراک ہو جاتا ہے اور یہ بات فسانے کے تعلق سے ایک خامی ہے۔ ڈاکٹر عمران مشتاق کا افسانہ ''گھونچو'' بھی ایک بیانیہ ہے۔ اس فسانے کی خاص خوبی ''سسپنس'' ہے۔ جبکہ انجام بھی چونکا دینے والا ہے جس نے ناگفتنی کو گفتنی بنا دیا ہے۔ سید مشکور حسین یاد نے فکر و نظر اور اسلوب بیان کے حوالے سے جدتوں سے سرشار غزل کہی ہے۔ انور سدید کی سہل ممتنع بھی خوب ہے۔ درج ذیل اشعار ہمیں اچھے لگے ہیں۔

ہمارے شہر میں جدت طرازی کا یہ عالم ہے
مسیحا تندرستوں کو یہاں بیمار کرتے ہیں

مظفر حنفی (دہلی)

جس کے ہاتھوں پہ خون تھا اپنا
اس پہ الزام بھی نہیں آیا

امجد اسلام امجد

دیے جلا کے بھی ہے آدمی اندھیرے میں
تلاش کرنے لگا روشنی اندھیرے میں

اسلم راہی

گلزار جاوید نے ''بخشی نواب'' کے عنوان سے ایک اچھوتے موضوع پر افسانہ لکھا ہے اور کمال مہارت فن سے ایمائیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ ایک قادر الکلام لکھاری ہیں۔ ''بخشی نواب'' میں انہوں نے الفاظ اور ان کے مترادفات کا انبار لگا دیا ہے۔ منظر نگاری میں تو گویا قلم توڑ دیا ہے۔ افسانے کے انجام میں انہوں نے جس نوع کی خوبصورت افسانویت پیدا کی ہے وہ تحسین کے قابل ہے۔ ''خوابیدہ جلیں'' میں فیصل عظیم کی غزل متاثر کرتی ہے۔ ''سنہرے دن'' میں امجد اسلام امجد کی نظم ''کینسر کہانی'' شبنم شکیل کا مرثیہ ''رخصتی''، ندا فاضلی کی نظم ''نظم بہت آساں تھی پہلے'' اور فیصل عظیم کی نظم ''زوال'' ہمیں پسند آئی ہے۔ ہوا رے کے دکھ سے مملو دیپک کنول نے ایک تاثر آفرین کہانی لکھی ہے۔ اس فسانے میں کردار نگاری پر افسانہ نگار نے خصوصی توجہ مرکوز رکھی ہے۔ ''نائی خیر والی'' کے علاوہ ''فرضی بوا'' کا کردار بھی یاد رہ جانے والا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کا مضمون ''غالب شناسی'' تازہ شمارے میں خاصے کی چیز ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے غالب کی شہرۂ آفاق فارسی ''نعتیہ غزل'' کا اجمالی تجزیہ پیش کیا ہے۔ بقول ان کے انہوں نے غالب کے نعتیہ کلام پر تفصیلی ریویو اپنی زیر طبع کتاب ''غالب عاشق محمد آل محمد'' میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی ایک اسکالر ہیں۔ اردو فارسی دونوں زبانوں کی شاعری پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ خاص طور پر مذہبی شاعری میں ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ انہوں نے 9 اشعار پر مشتمل غالب کی نعتیہ غزل کے ہر شعر کا ترجمہ اور اس کی تشریح و محاسن اس طرح بیان کیے ہیں کہ تشریح و تفسیر اور محاسن شعری کے اعتبار سے کوئی پہلو تشنہ نہیں رہنے دیا ہے۔ غالب شناسی میں ''غالب شناسی'' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ محمد سعید شیخ کے کماولٹ ''اقبال جرم'' پر جمیل احمد عدیل (بورے والا) نے خیال آرائی کی ہے اور کیا خوب کی ہے۔ انہوں نے نقد و نظر کی pitch پر ''بورے والا ایکسپریس'' کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ان کی ایک ایک سطر سے عمیق تنقیدی شعور اور وسیع مطالعہ جھلکتا ہے۔ وہ تنقید کو تخلیق بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ہمارے مطالعے میں ان کی یہ پہلی تحریر ہے۔ شیخ محمد سعید ایک بڑے کہانی کار ہیں۔ ان کے فن کا عارف بھی کوئی معمولی لکھاری نہیں ہو سکتا۔ گلزار جاوید جس توجہ، محنت، ذوق و شوق اور مالی ایثار سے ''چہارسُو'' شائع کر رہے ہیں، اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ پیش نظر شمارے میں کمپوزنگ کی نسبتاً زیادہ غلطیاں سامنے آئی ہیں۔ انہیں اس طرف بطور خاص توجہ دینی چاہیے۔ گزشتہ شائع شدہ نظم میں ہمارا مقطع کچھ یوں ہے۔

زمانہ تا بہ حشر یہ کرے گا قیصر اعتراف
وہ بھی باپ کی طرح ذہین تھی، فہیم تھی

قیصر نجفی (کراچی)